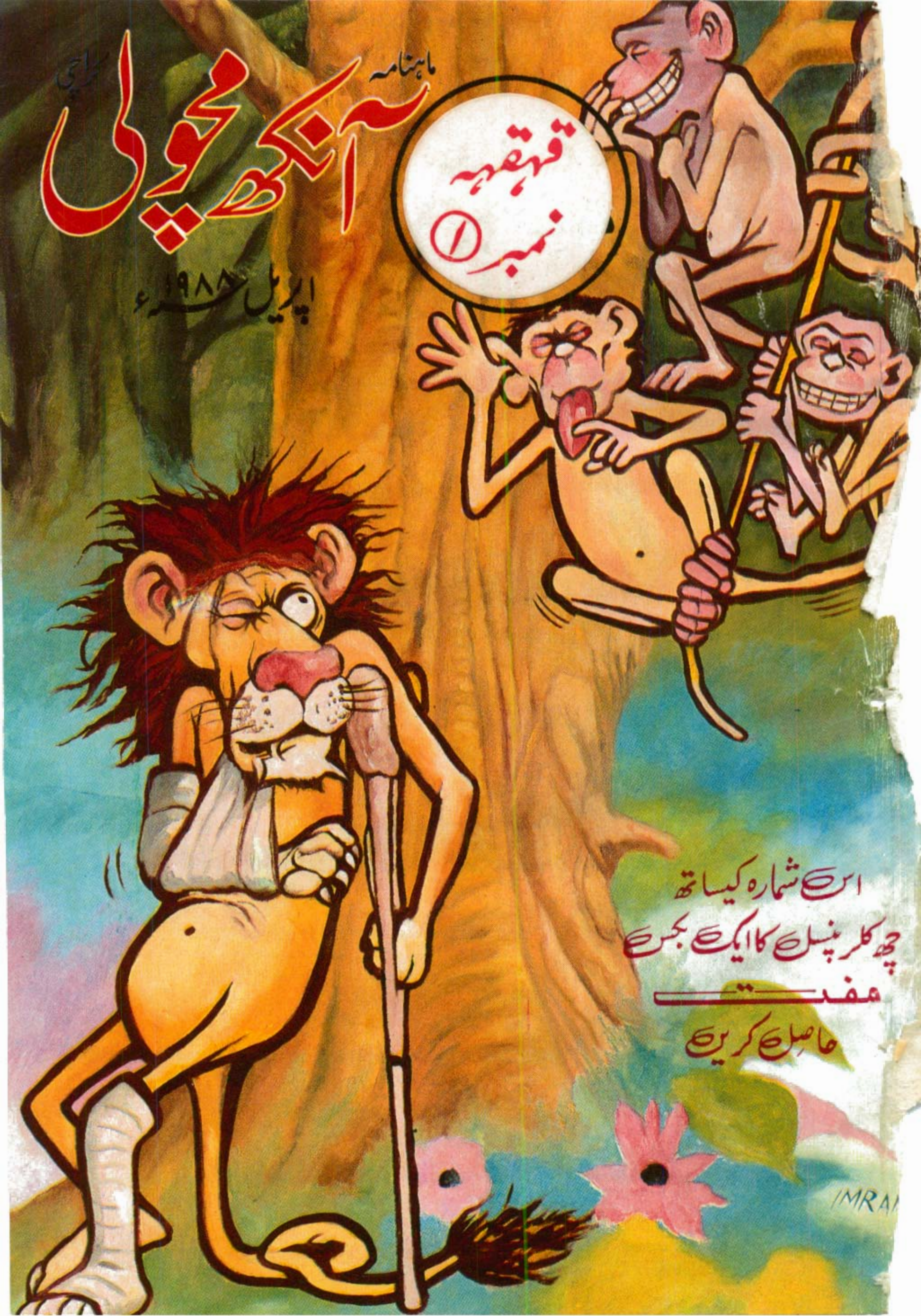
ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
اپریل ۱۹۸۶ء
قہقہہ نمبر ۱
اس شمارہ کیساتھ
چھ کلر پنسل کا ایک بکس
مفت
حاصل کریں
IMRAN

Blue Band
MARGARINE
225 گرام
9.00 روپے
50 گرام
2.50 روپے
Blue Band
MARGARINE
بلوبینڈ مارجرین — غذائیت اور لذت سے بھرپور
بچوں کو توانائی کا خزانہ چاہیئے۔ اپنے بچوں کو بلوبینڈ دیجئے کیونکہ
بلوبینڈ بچوں کی بہترین نشوونما کرنے والی غذا کا ایک اہم حصہ ہے۔ غذائیت
اور لذت سے بھرپور بلوبینڈ میں وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں۔
بلوبینڈ کو ڈبل روٹی کے سلائس یا بن پر لگا کر دیجئے،
آپ کے بچے اس کو بہت پسند کریں گے۔
"بلوبینڈ نے صحت کو لذت کی شکل دی ہے۔"
بلوبینڈ مارجرین
خاندان کی چاہت بھری نگہداشت کے لئے

مُدیرِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مُدیرِ مسئول
تجمّل حسین چشتی
مُشاورت
مشفق خواجہ ، امجد اسلام امجدؔ
مُدیرِ اعزازی
طاہر مسعود
مُشیرِ ادارت
محمّد سلیم مُغل
مجلسِ ادارت
شاہنواز فاروقی، ابنِ شہباز خان، سیّد خورشید عالم
خطاطی
رئیس الحسن ، عارف سعید

جلد نمبر ۲
شمارہ نمبر ۱۰
اپریل ۱۹۸۸ء
شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ
قیمت ——— دس روپے

زرِ سالانہ کے لئے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے!

گرین گائیڈ اکیڈمی
ادارہ اشاعت برائے
تعلیم و تعمیر سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماہنامہ
آنکھ مچولی میں
شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق
بحقِ ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی
اجازت کے بغیر کوئی تحریر
شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ
آنکھ مچولی
میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث
پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و
واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ
مماثلت کی صورت میں
ادارہ ذمہ دار
نہ ہوگا۔

گرین
گائیڈ اکیڈمی
برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت ۱۱۲-ڈی، نورس روڈ سائٹ، کراچی

ناشر
ظفر محمود شیخ
طابع ـ زاہد علی ، مطبع ـ لاریب
پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

حسنِ ترتیب

ڈاکٹر لاغر اور وڈیو بخار	۱۱۳	نازیہ رمضان
مجھے ابّو سے شکایت ہے	۱۱۹	ادارہ
ہم جب بیمار ہوئے	۱۲۵	شبنم عقیل
گنی چُنی معلومات	۱۳۲	عقیل عباس جعفری
تلاش (سلسلہ وار ناول)	۱۳۹	ستیہ جیت رے/آصف فرخی
سمندر کی ملکہ	۱۴۷	نیّر ابدالی
قالین اور سپاہی (نظم)	۱۵۰	محمد امان خان دل
دو افسانے دو کردار	۱۵۱	سید خورشید عالم
اور میچ ڈرا ہوگیا۔	۱۵۴	ملک جاوید اقبال
کمرۂ عجائب	۱۵۵	انور کلیم بلوچ
آٹوگراف پلیز	۱۵۹	نور صمد خان
بہانہ (نظم)	۱۶۲	نوید ظفر کیانی
کلاسیکل شور شرابہ	۱۶۳	م پ آرٹس
وبالِ جان	۱۶۵	ذیشان ہاشمی
ب میں خوش ہوں	۱۷۳	ذیشان بن صفدر
اُف یہ باجی !	۱۷۹	محمد عمر احمد خان
ہمسائے کا سایہ	۱۸۳	فوقیہ مشتاق
وی سی آر (نظم)	۱۹۰	شاہنواز فاروقی
قہقہے ہی قہقہے	۱۹۲	منتخب لطائف
ہمارا پبلک اسکول	۲۰۲	شہزاد کامران
یک مقدس شام	۲۰۷	الف شین خان
عنوان	۲۱۲	محمد سلیم خان
نکل آئی کیور روبوٹ	۲۱۴	سوالاً جواباً
ائرہ معلومات	۲۱۵	امّ رباب جعفری
وُ ملائیں ہاتھ	۲۲۳	(قلمی دوستی کا کالم)
ئی تحریریں	۲۲۵	(نئے لکھنے والوں کا شعبہ)
می ابّو کا صفحہ	۲۳۸	ڈاکٹر معین الدین عقیل

اداریہ	۶	
حضورؐ کا مزاح	۷	شاہد فاروق
حمد	۸	امید فاضلی
ڈاک ڈاک کس کی ڈاک	۹	(خطوں کے جواب)
اس مہینے کا نام کیسے پڑا ؟	۱۳	مولانا اسلم شیخوپوری
قہقہے	۱۴	نصر اللہ خان
ہم کیوں ہنستے ہیں	۱۷	شانی ایوب
میں ٹیوٹر تھا (نظم)	۲۲	عنایت علی خان
بات سے بات	۲۴	محمد جاوید خالد
اکبری لوٹا	۳۱	محمد پرویز آرائیں
جگنو بمقابلہ ویسٹ انڈیز	۳۹	علی ذوالقرنین جگنو
آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے	۴۲	
کیا کیا بنیں گے ہم ؟ (نظم)	۴۳	م، خ، دل
۳۵ سوال انور مقصود سے	۴۴	(انٹرویو)
فرق بتایئے	۴۸	(ذہنی آزمائش)
ملنا ہمارا بندر سے	۴۹	ابنِ شہباز خان
ٹنکو میاں نے نانی لائے بچے کی مدد کی	۵۷	احمد حاطب صدیقی
ہنسنا ہنسانا	۶۵	طاہر مسعود
اور ... ہم نے کار خریدی	۷۱	شین فاروقی
ٹوپیوں کا سوداگر (منظوم ڈرامہ)	۷۶	امجد اسلام امجد
گھر کا بھیدی	۷۹	نگہت آرا چوہان
شیری	۸۳	ف، عین
ہنسانے والے	۸۷	فاروق عادل
دھماکہ (نیا سلسلہ وار ناول)	۹۷	اظہر نیاز
اِدھر اُدھر سے	۱۰۶	ایف عادل
بندر جی نے ڈرائنگ سیکھی (نظم)	۱۱۲	طلحہ سلیم

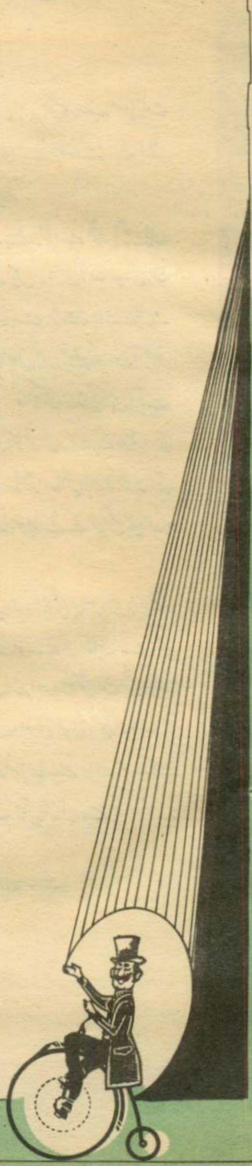

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قہقہہ نمبر پیشِ خدمت ہے۔ یہ شمارہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، جب امتحانات ختم ہو چکے ہوں گے اور آپ کے پاس ڈھیروں فرصت ہوگی۔ "آنکھ مچولی" نے فرصت کے ان لمحات کو دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے لیے قہقہہ نمبر پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، ہمارے اِردگرد بے شمار مسائل ہیں۔ دُکھ دینے والی بے شمار باتیں ہیں۔ ہمارے اطراف میں ایسے الم انگیز مناظر ہیں جو دل و دماغ کو افسردہ کر دیتے ہیں۔ انہی اسباب کی بنا پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ زندگی میں تلخی، غصہ، نفرت اور بیزاری کے جذبات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف ہنگامہ آرائی کی ایک فضا ہے۔ بے سکونی اور بے اطمینانی کے اس ماحول میں قہقہے کم اور آنسو زیادہ ہیں۔ خوشیاں کم اور غم زیادہ ہیں۔ لوگ سُکھی نہیں دُکھی ہیں۔ حالانکہ زندگی اُسی وقت خوبصورت دکھائی دیتی ہے جب اسے ہنسی خوشی بسر کیا جائے۔ اور بچوں کا خوش رہنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ حقیقی مسرت کا احساس اسی زمانے میں ہوتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ مسائل اور ذمّہ داری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جی بھر کر ہنسنے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جانے کے مواقع بھی محدود ہوتے جاتے ہیں۔

"آنکھ مچولی" نے قہقہہ نمبر اس لیے پیش کیا ہے تاکہ آپ ہنس سکیں۔ اس زندگی پر جس میں بے شمار مضحکہ خیز واقعات پیش آتے ہیں۔ ہنسی آدمی کے ذہنی طور پر صحت مند ہونے کی نشانی ہے۔ اور "آنکھ مچولی" اپنے ساتھیوں کو جسمانی طور پر ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی صحت مند اور ہشاش بشاش دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر آپ قہقہہ نمبر کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں تو سمجھئے ہماری محنت وصول ہوئی۔ کسی کو ہنسانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس مُشکل کام کا ذمّہ بھی "آنکھ مچولی" نے اپنے سر لیا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں ۔۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ کا دوست

حضورؐ کا مزاح

ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک خاتون تشریف لائیں اُنھیں دیکھتے ہی حضورؐ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت احترام سے اُنھیں بٹھایا - پھر آپؐ نے پوچھا" امی جان ! آج کیسے تکلیف فرمائی ؟"

خاتون :" یارسول اللہ ! مجھے ایک اُونٹ کی ضرورت ہے "

رسولِ اکرمؐ :" اُونٹ کا آپ کیا کریں گی ؟"

خاتون :" یارسول اللہ ! آج کل ہمارے ہاں کوئی سواری کا جانور نہیں، سفر پیش آجائے تو بڑی دشواری ہوتی ہے "

رسولِ اکرمؐ ۔(ہنس کر)" اچھا تو اُونٹ کا ایک بچّہ حاضر کیے دیتا ہُوں "

خاتون :" میرے ماں باپ آپ پر قُربان ! اُونٹ کے بچّے کا میں کیا کروں گی مجھے تو اُونٹ چاہیے "

رسولِ اکرمؐ :" میں تو آپ کو اُونٹ کا بچّہ ہی دُوں گا "

خاتون :" اُونٹ کا بچّہ بھلا میرے کس کام - وہ تو میرا بوجھ بھی نہیں سہار سکے گا - مجھے تو اُونٹ عطا فرمائیے "

رسولِ اکرمؐ :" آپ کو اُونٹ کا بچّہ ہی ملے گا اور میں اسی پر آپ کو سوار کراؤں گا " یہ فرما کر حضورؐ نے ایک صحابی کو اشارہ کیا وہ تھوڑی دیر میں ایک جوان فربہ اُونٹ لے آئے اور اس کی مہار خاتون کو تھما دی۔

حضورؐ نے فرمایا " ذرا دیکھیے تو - یہ اُونٹ ہی کا بچّہ ہے یا کچھ اور ...!"

اب وہ خاتون حضورؐ کے لطیف مزاح کی تہہ کو پہنچیں، ہنس دیں اور دُعائیں دینے لگیں - حاضرینِ مجلس بھی شگفتہ ہوئے -

مرسلہ :- شاہد فاروق

حمد

امیدؔ فاضلی

اللہ اللہ اُس کا مقدر
نام ہے تیرا جس کے لب پر
عشق ہے تیرا عالم عالم
حُسن ہے تیرا منظر منظر
نور سے تیری یکتائی کے
لَو دیتے ہیں ماہ و اختر
یاد سے تیری ذکر سے تیرے
ذہن منوّر، روح معطّر
دین و دُنیا کُفر و ایماں
تُو ہے سب کی رُوح کے اندر
تیرے در کے سائل ٹھہرے
کیسے کیسے پیرِ پیمبر
میرا وظیفہ میرا عقیدہ
اللہُ اکبر اللہُ اکبر

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

پیر محمد۔ لیاری، کراچی :- آپ نے لکھا ہے کہ اگر آپ کے خط کا جواب نہیں دیا تو آپ نگاہ اُٹھا کر بھی "آنکھ مچولی" کی طرف نہیں دیکھیں گے۔ چلیے ہم جواب دے رہے ہیں۔ آپ کی شکایت دُور ہوئی۔ آئندہ ایسی شکایت ہو تو آپ "آنکھ مچولی" کو نگاہ اٹھا کے دیکھنے کے بجائے نگاہ جما کے دیکھ لیا کیجیے، لیکن دیکھیے ضرور۔

صفیہ سلطانہ صدیقی۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی :- بقول آپ کے "آنکھ مچولی" کا معیار جتنا بلند ہے قیمت بھی خاصی بلند ہے۔ تاہم آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ان دونوں میں زیادہ کون سی چیز بلند ہے۔ ظاہر ہے معیار۔ آپ نے سُنا ہوگا جتنا گُڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔ آپ کی کہانی "ننھے میاں کا چوزہ" آئندہ کسی اشاعت میں چھپ جائے گی۔

ہارون اسلام۔ فورٹ عباس، ضلع بہاولنگر :- آپ کو شکایت ہے کہ پچھلے دو برس میں آپ آٹھ دس کہانیاں بھیج چکے ہیں، لیکن ہمارے کانوں پہ جُوں تک نہیں رینگی۔ ہارون صاحب آپ کی بات صحیح ہے کہ ہمارے کانوں میں جُوں نہیں رینگتی۔ کیونکہ ہم کانوں میں آلۂ سماعت لگاتے ہیں۔ رہا سوال آپ کی کہانیوں کا تو یہ ایک نہ ایک دن ضرور چھپیں گی۔ خاطر جمع رکھیے اور لکھتے رہیے۔

محمد لعل شاہ شیرانی۔ ضلع ژوب۔ بلوچستان :- آپ نے خود لکھا ہے کہ یہ جہالت کا زمانہ ہے اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ علمائے کرام کُرسی مانگتے ہیں تو آپ ان سے کہیے کہ بھائی! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ کرسی ہی تو مانگ رہے ہیں، قرضِ حسنہ تو نہیں مانگ رہے۔ علمائے کرام کی بڑی خدمات ہیں۔ ہمیں ان کی عزت کرنی چاہیے اور جب آپ کسی کی عزت کرتے ہیں تو احتراماً اُسے کُرسی ہی تو پیش کرتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا!

محمد ظفر۔ ڈیرہ غازی خاں :- پیارے ظفر۔ ٹیلی وژن ڈرامہ "عالی پر کیا گزری" میں جو صاحبزادے عالی بنے تھے، اُن کا پتہ ہمارے پاس نہیں ہے کیونکہ ان سے ہماری دوستی نہیں ہے۔ آپ انھیں لاہور ٹیلی وژن اسٹیشن کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر آپ کا خط ان تک پہنچا دیں گے۔

محمد اعظم عظیم۔ لانڈھی کراچی :- آپ نے چونکہ خوب موٹے موٹے حروف میں کئی بار لکھا ہے کہ "یہ خط بغور پڑھیں" اس لیے ہم نے آپ کا خط خوب غور سے پڑھا۔ پھر آپ کی کہانی پڑھی۔ مناسب اصلاح و ترمیم کے بعد شائع ہو جائے گی۔ امید ہے آئندہ رسالے میں کہانی بھیجنے کو آپ کے دوست پاگل پن قرار نہیں دیں گے۔

اسماء مہدی پیرزادہ، ناظم آباد کراچی :- پہلی بات تو آپ ذہن نشین کر لیں کہ "آنکھ مچولی" میں کوئی تحریر بھیجنے یا کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شرط صرف معیار کی ہے۔ قلمی دوستی کے کالم میں لڑکیوں کی تصویر شائع نہیں کی جاتی۔ "راہ نما" کے لیے دس روپے کا منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

ارشد محمود۔ مغل پورہ لاہور :- "آنکھ مچولی" کی اتنی ڈھیروں تعریف کے بعد آپ نے ایک ایسی شکایت کر ڈالی جس کا جواب ہم اس کالم میں کئی بار دے چکے ہیں۔ بھئی! ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ ساتھی ہمیں کس شہر سے خط لکھتے ہیں۔ خط میں اگر کوئی جواب طلب بات ہوتی ہے تو ہم ضرور جواب دیتے ہیں اور جواب میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ڈاک کا نظام بھی تو دیکھیے۔

عمران شکیل۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی :- ہر ماہ کسی کھلاڑی پر کوئی مضمون دینا تو ممکن نہیں۔ ہاں کبھی کبھار ایسا کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اس کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔ "تلاش" آگے چل کر اور دلچسپ ثابت ہوگی۔

محمد سلیم جان مروت۔ ضلع بنوں :- آپ نے وضاحت نہیں کی کہ "انکل آئی کیو روبوٹ" کے جواب میں کیا غلطی ہے۔ ایٹمی نظریہ رودر فورڈ نے ہی پیش کیا،

تھا۔ آپ کا مضمون نپولین، نئی تحریریں میں چھپ جائے گا۔

رانا سرفراز علی۔ یاسر خان۔ چیچہ وطنی۔ ماشاءاللہ آپ تو بچوں کے سارے رسائل پڑھتے ہیں اور ان میں آنکھ مچولی آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے اگر اتنے رسائل پڑھنے کے بعد آپ نے یہ رائے قائم کی ہے پھر تو ٹھیک ہی ہوئی۔ اب کے آپ کی رائے کے احترام میں صفحات بڑھائے جا رہے ہیں لیکن ہر شمارے کے صفحات میں اضافہ ممکن نہیں۔ آپ کے لطائف اچھے تھے لیکن چونکہ پڑھے ہوئے تھے اس لیے آپ اور لطائف بھیجیں۔

محمد حسن رضا گوندل۔ منڈی بہاؤالدین۔ آپ ہمیں صرف خطوط کیوں لکھتے ہیں! سائنسی مضامین لکھ کے کیوں نہیں بھیجتے؟

نیاز الدین۔ ابراہیم۔ طارق۔ صوابی۔ چلئے آپ کا خط شائع کر دیا۔ لیکن بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ اگر خط شائع کر دیں تو بہت سے لڑکے "آنکھ مچولی" پڑھنے لگیں گے۔ کیا صرف آپ کا خط پڑھنے کے لیے۔۔۔؟

مہتاب یوسف۔ کوہسار نگ۔ مہتاب میاں! اگر کوئی تحریر نہ چھپے تو خامی اس تحریر میں ڈھونڈنی چاہیئے۔ آپ نے تو سارا الزام ہمارے سر تھوپ دیا۔ آئندہ اگر ایسی بات کی تو ہم آپ سے سخت ناراض ہو جائیں گے۔۔۔ ہاں!

سید مرید عمران۔ پنڈ یگھیب۔ ضلع اٹک۔ یعنی ایک تو آپ نے اتنی محبت سے خط لکھا اور پھر معذرت کر رہے ہیں۔ ارے بھئی! ہم آپ لوگوں کے خطوط دیکھ کے اتنے ہی خوش ہوتے ہیں جتنے بچے کھلونے دیکھ کر۔

ہمایوں بشیر۔ گولمنڈی۔ راولپنڈی۔ آپ لکھنے والے پہ اعتراض کیوں کرتے ہیں؟ اگر تحریر اچھی ہو تو اس کی دل کھول کر داد دینی چاہیئے۔ ویسے اب جب کہ آپ نے بائیکاٹ ختم کر دیا ہے تو لڑائی جھگڑے والی بات مناسب نہیں ہے اسی لیے ہم آپ کے ہر اعتراض پر اپنا سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں آپ کی دوستی عزیز ہے۔

محمد فیصل نئی کراچی۔ کراچی۔ اللہ کرے آپ امتحان میں شاندار نمبروں سے کامیاب ہوں، لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ نے تیاری کیسی کی ہے! ہم تو صرف دعا کر سکتے ہیں۔ دوا تو آپ ہی کے پاس ہے۔ لطیفہ اچھا ہوا تو کیوں نہیں چھپے گا؟

عابد رضا نان۔ گوجرانوالہ۔ پھولوں کی طرح مہکتا، نغموں کی طرح گنگناتا پرچوں کا پیش رو، دھنک کے رنگ سجائے، اپنے دامن میں بے شمار دلنشیں تحریریں سمیٹے "آنکھ مچولی" آپ کو پسند آیا۔ چلیے اتنی شاندار داد پا کر ہماری محنت تو وصول ہو گئی۔ کلثوم واحد صاحبہ کی کہانی کے بارے میں آپ کی اطلاع ہمارے لیے انکشاف ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔۔۔؟

مشتاق احمد۔ سکردو۔ بلتستان۔ آپ کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ پرچہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے "حق اسکواڈ" منگوانے کے لیے دس روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیں۔ "قہقہہ نمبر" کے لیے آپ کی تحریر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور چھپے گی۔

مقصود احمد صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی۔ کہانیوں میں بعض اوقات مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے قاری کو چاہیئے کہ ایسے مبالغے پر صبر کرے اور یہ دیکھے کہ کہانی دلچسپ تھی یا نہیں۔ آپ کے ایک درجن خطوط میں سے ایک کا جواب حاضر ہے۔ آپ اپنی قسمت پر افسوس نہ کریں۔ بلکہ انعامی مقابلوں میں حصہ لیتے رہیں۔ کبھی نہ کبھی انعام ضرور ملے گا۔

اظہر محمود وڑائچ۔ جھیوں رانوالی۔ ضلع گجرات۔ فروری کا سرورق آپ کو پسند نہیں آیا۔ چلئے آئندہ سہی۔ آپ ہمیں اپنی کہانی ضرور بھیجئے۔ ہم اسے خوشی خوشی قبول کریں گے اور چھپنے کے قابل ہوئی تو ضرور چھاپیں گے۔ جس پتے پر آپ نے ہمیں خط لکھا ہے اسی پتے پر آپ کہانی بھیج سکتے ہیں۔

سید حبیب علی۔ کراچی۔ کیلنڈر پر آنکھ مچولی کے تمام شماروں کی تصویریں بھلا کیسے چھپ سکتی ہیں۔ کیلنڈر چھوٹا سا ہوگا اور شمارے اتنے ڈھیر سارے ہیں۔ بہرکیف تجویز کا شکریہ۔ رنگین صفحات جتنے پہلے چھپتے تھے اتنے ہی اب بھی چھپتے ہیں اور بھئی، دوسرے قارئین پر اتنا غصہ نہیں کرتے۔ بُری بات ہے۔

لیاقت علی خان۔ لاوہ۔ ہاں یہ بات تو ہے کہ اکثر ساتھی نقل شدہ لطیفے بھیج دیتے ہیں، لیکن بھئی لیاقت صاحب یہ بھی تو سوچیں کہ لطیفے بنانے کی فیکٹری تو ہوتی نہیں ہے۔ نئے نئے لطیفے تو پتا نہیں کہاں سے بنتے ہیں۔ بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو آئندہ یہ شکایت نہ ہو۔

شاہد نواز راکی، غریب وال۔ آپ کے امتحانات سر پہ ہیں اور آپ نے پھر بھی وقت نکال کے نظم لکھی اور اگر یہ شائع نہ ہوئی تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ ہم تو یہی سوچ کے پریشان ہیں۔ فی الحال تو آپ امتحان کی تیاری کریں۔ یہ باتیں تو بعد کی ہیں۔

شاہدہ فیروز۔ لیاقت آباد۔ کراچی۔ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ کہانی اور لطیفے بھیجنے کے لیے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ فٹافٹ بھیج دیجئے۔ ہاں شرط اتنی سی ہے کہ کہانی اچھی اور لطائف دلچسپ ہونے چاہئیں۔

فرحت العین۔ سیالکوٹ۔ مبارک ہو آپ کی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ مزید نگارشات ارسال کیجئے۔

شوکت علی کوٹ مومن۔ ہمیں یہ سن کر بے حد افسوس ہوا کہ دکاندار "آنکھ مچولی" کا تحفہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دکاندار سے تحفہ

لازماً طلب کریں۔ کیونکہ ہم جو بھی تحفہ دیتے ہیں، رسالے پہ اس کا ذکر کر دیتے ہیں اگر اس کے باوجود وہ تحفہ نہ ملیں تو دکان کا نام لکھ کے ہمیں بھیجیں۔

ابن مفرح۔ گجوخان، ضلع مردان:۔ پیارے ابنِ مفرح! آنکھ مچولی کو آپ جیسے ساتھی پہ فخر ہے کہ آپ نے آپریشن کے وقت اتنی ہمت سے کام لیا اور اس عالم میں بھی آنکھ مچولی کے لیے یہ سوچ کر لطائف سے مزین کہانی لکھی کہ شاید کوئی اداس دل اس کو پڑھ کر خوش ہو جائے۔ خدا کرے آپ جلد صحتیاب ہوں۔ ہم آپ جیسے لکھنے والوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

علی گوھر چوہان، ملتان:۔ "تلاش" کی پسندیدگی کا شکریہ! آنکھ مچولی کے پُرانے شمارے آپ شوق سے منگوائیے۔ مگر ایک سال کے شماروں کے لیے آپ کو ۱۰۰ روپے کا منی آرڈر بھیجنا پڑے گا۔ ہاں ہمارے پاس چھپنے کے لیے جو چیز بھی آتی ہے۔ ہم اُسے لازماً پڑھتے ہیں۔ پڑھے بغیر کسی چیز کو تو ردی کی ٹوکری بھی قبول نہیں کرتی۔

اورنگ زیب عالمگیر۔ سدّ ہانڈی گاؤں۔ چکوال:۔ ڈھول تک اور آتما "نئی تحریریں" میں چھپ جائے گی۔ "آنکھ مچولی" کی پسندیدگی کی اطلاع ہمارے لیے واقعی خوش کُن ہے۔

انور معتری، بنوں سٹی، سرحد:۔ بھئی آپ لوگ کوئی مضمون، کہانی یا نظم ارسال کریں تو اس کی نقل اپنے پاس رکھ لیا کریں۔ کیونکہ واپسی میں بڑی دقت ہو جاتی ہے۔ آپ کا مضمون بہت "مُنّا مُنّا" ہے۔ اس کی پرورش پہ محنت کیجئے۔ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو بھیجئے گا۔ آپ محنت کریں تو اچھا لکھ سکتے ہیں۔

صائمہ یونس۔ گرومندر۔ کراچی:۔ لیجئے خط شائع نہ کرنے کی شکایت دُور ہوئی۔ اپنے بھیجے ہوئے لطائف قہقہہ نمبر میں ڈھونڈ لیجئے اگر مل جائیں تو خوش ہو جائیے۔ ورنہ ہمیں کچھ اور مزید لطائف بھیج دیجئے۔

شبانہ شمشاد۔ شومارکیٹ۔ کراچی:۔ آپ کی ہلکی پھلکی تحریریں ہیں کو ایک کچھ "شائع نہ ہو سکے گی۔ البتہ "چشم تصور سے" دوبارہ بھیج دیجئے اسے ہم شائع کریں گے۔ مزید یہ کہ لکھتی رہیئے۔

عطاءاللہ شاد۔ گوادر۔ مکران:۔ آپ نے لکھا ہے کہ اگر آپ کا خط شائع نہیں کیا گیا تو آپ ناراض نہیں ہوں گے۔ اس کے باوجود ہم آپ کا خط شائع کر رہے ہیں تاکہ آپ کبھی ناراض نہ ہوں۔ ذہین بچوں کے انٹرویو کی تجویز اچھی ہے لیکن جن بچوں کے انٹرویو شائع نہیں کیے گئے کہیں وہ یہ کہہ کر روٹھ نہ جائیں کہ کیا ہم ذہین نہیں ہیں؟

شفقت حسن قریشی۔ اکوڑہ خٹک:۔ ایک مہینہ تک آپ نے بازار کے چکر لگائے لیکن "آنکھ مچولی" دستیاب نہیں ہوا۔ یہ تو واقعی آپ کے ساتھ آنکھ مچولی ہو گئی۔ بھئی فروری کا پرچہ ٹھیک وقت پر بازار میں آیا۔ ہاں آپ تک پہنچنے میں اسے واقعی تاخیر ہو گئی۔ آپ کی نگارشات موصول ہوئیں۔ انتظار کیجیے...!

الیاس فاروقی۔ ملیر کراچی:۔ "برائڈ آف پوزیشن" کے سرٹیفکیٹ روانہ کیے جا چکے ہیں۔ آپ کا نام موصول نہیں ہوا۔ یہ سُن کر ہم خوفزدہ ہو گئے کہ آپ نہایت خوفناک کہانی لکھ رہے ہیں۔ لکھتے ہی بھیج دیجیے۔

نوراسلام سحر۔ جیوانی۔ مکران:۔ "آنکھ مچولی" کی وجہ سے آپ نے اپنا پسندیدہ رسالہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ یہ تو ہمارے رسالے کا کارنامہ ہے، لیکن اس کے باوجود ہم آپ سے یہی کہیں گے کہ اگر آپ پڑھ سکتے ہوں تو "آنکھ مچولی" کے ساتھ ساتھ دوسرے رسالے بھی پڑھیں۔ آپ کی ارسال کردہ کہانی کا فیصلہ پڑھنے کے بعد ہی کیا جائے گا۔

رئیس احمد (شہر کا نام نہیں لکھا) مشہور شخصیات کے انٹرویو اور آٹوگراف شائع کرنے کی تجویز اچھی ہے۔ اس پر غور کیا جائے گا۔ البتہ ایک مشورہ آپ کے لیے کہ خط میں کم از کم اپنے شہر کا نام ضرور لکھا کریں۔

احمد رضا۔ لیاقت آباد۔ کراچی:۔ آپ "آنکھ مچولی" کے دفتر آنا چاہتے ہیں، سر آنکھوں پر آیئے، لیکن آپ کیوں آنا چاہتے ہیں؟ بہر کیف آپ فون نمبر ۲۹۴۲۹۱ پر رابطہ قائم کرلیں۔ آپ کی رہنمائی کر دی جائے گی۔

جمال حیدر (شہر کا نام نہیں لکھا):۔ ایک ہی لفافے میں آپ کہانی، لطیفے، معلومات اور دائرہ معلومات کا مقابلہ ضرور بھیجئے، لیکن اس کے لیے صفحات علیحدہ علیحدہ استعمال کیجئے۔

عاصمہ علی۔ ماڈل کالونی۔ کراچی:۔ عاصمہ بہن! بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی ویسے ہی بہت سہیلیاں ہوتی ہیں ان کے لیے علیحدہ سے قلمی دوستی کا کالم کیا شروع کیا جائے، پھر بھی ہم سوچیں گے۔

محمد ارشد الصدیقی عادل۔ قصبہ کالونی۔ کراچی:۔ آپ کی تجویز ہے کہ سرورق کی ایک صفحے کی کہانی بھی چھاپی جائے۔ یہ تجویز ہمارے ذہن میں بھی تھی، لیکن ابھی تک معاملہ زیرِ غور ہی ہے۔ "نئے چراغ" آپ ہی جیسے ذہین طالب علموں کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اپنا تعارف شوق سے ارسال کیجئے۔

سید ضیاء الحسن شاہ بخاری۔ عمرکوٹ۔ تھرپارکر:۔ آپ جذباتی ہیں مگر اتنا جذباتی تو ہر مسلمان کو ہونا چاہیئے۔ "تلاش" آپ کو اب تک کیوں سمجھ میں نہیں آئی جبکہ دیگر ساتھیوں کے تو تعریفی خطوط آرہے ہیں۔ آپ کی جاسوسی ناول کی فرمائش ناول "دھماکہ" سے پوری ہو جائے گی۔

محمد ایوب مخدوم۔ چمن:۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کے لیے رسالے کے دو صفحات مخصوص کرنا ممکن نہ ہو گا۔ اس لیے کہ پہلے ہی رسالے میں صفحات کی

کمی کوتاہیاں آتی رہتی ہیں۔ جن ساتھیوں کو فوری جواب چاہیے، وہ جوابی لفافہ بھیج سکتے ہیں۔

وقاص عزیز شیخ۔ فیصل آباد:۔ خدانخواستہ آپ سے ہمیں دشمنی کیوں ہونے لگی؟ بلکہ آپ نے جس غصے میں خط لکھا ہے اس کی وجہ سے آپ سے اور محبت ہوگئی ہے۔ حالانکہ غصے کو حرام کہا گیا ہے۔

راجہ طاہر اقبال شاد۔ جہلم:۔ ہمیں یہ جان کر واقعی افسوس ہوا کہ آپ کی تحریریں رسالے والے نہیں چھاپتے۔ لیکن کیا آپ نے کبھی سوچا کہ آپ کی بھیجی ہوئی چیزیں کیوں نہیں چھپتیں؟ ظاہر ہے کسی کو آپ سے دشمنی تو نہیں ہوگی۔ مصنف بننے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے بہت پڑھنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد جو چیز لکھی جاتی ہے اسے چھاپنے کے لیے سب تیار ہوتے ہیں۔ ابھی آپ خوب محنت کیجئے۔

اسرار احمد خان خلیل۔ شیر شاہ، کراچی:۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، عاصمہ گل کا مضمون "پشاور شہرِ ہزار داستان" نقل شدہ نہیں ہے۔ ہم نے تحقیق کر لی ہے۔ بغیر تحقیق کے الزام تراشی بری بات ہے۔

انور کلیم بلوچ۔ شہدادکوٹ:۔ "آنکھ مچولی" میں ہر تحریر کو اُس کے معیار کے لحاظ سے جگہ دی جاتی ہے۔ جب آپ بڑوں کی طرح لکھنے لگیں گے تو بڑوں کے شعبے میں آپ کی چیزیں بھی چھپنے لگیں گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا...!

حامد علی شاہد۔ لاڑکانہ:۔ حامد میاں آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں۔ ساتھیوں کو صرف تعریفی خطوط نہیں لکھنے چاہئیں۔ ہم بھی ایسے خطوں کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، جس میں رسالے پر تنقید کی گئی ہو۔ یا مفید مشورے دیے گئے ہوں۔ آپ یقین جانیے! ہم بھی خوشامد کو برا سمجھتے ہیں، لیکن اگر تعریف سچی ہو تو اس میں برائی بھی کیا ہے۔

عبداللہ آزاد، منظور کالونی۔ کراچی:۔ آپ کی نشاندہی کا شکریہ۔ تمام ساتھی نوٹ کر لیں کہ عمران خان پشاور کے نہیں میانوالی کے رہنے والے ہیں۔

محمد اکرم سیال عاجز۔ ننکانہ صاحب۔ ضلع شیخوپورہ:۔ آپ کی نظم "اداس ہونے والے" دلچسپ تو ضرور تھی لیکن چونکہ ایک بھارتی گانے کی پیروڈی میں تھی اس لیے ہم اُسے شائع نہیں کر سکتے۔ آپ ہمیں کوئی اور نظم ارسال کریں۔

محمد عاقل۔ حیدرآباد:۔ بھئی آپ کے خطوط تو ہمیں ملتے ہیں لیکن جواب دینے والی کوئی بات ہو تو جواب دیں۔ لیجئے! اب اپنا غصہ تھوک دیجئے۔

کیا آپ کی پوزیشن آئی ہے؟

مبارک ہو آپ پاس ہو گئے.. پاس کیوں نہ ہوتے، محنت جو کی تھی۔ جن ساتھیوں نے بہت زیادہ محنت کی وہ نہ صرف پاس ہوئے بلکہ ان کی پوزیشن بھی آئی۔

کہیں آپ ہی وہ خوش نصیب تو نہیں؟

اگر آپ کی پہلی دوسری یا تیسری پوزیشن آئی ہے تو ہمیں فوراً خط لکھیں ہم آپ کو ایک خوبصورت سا انعام بھجوائیں گے۔

- خط کے ساتھ اسکول کے پرنسپل ہیڈ ماسٹر یا ہیڈ مسٹریس کا تصدیقی خط آنا ضروری ہے۔
- چوتھی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے طلباء و طالبات انعام کے لئے خط لکھ سکتے ہیں۔
- خط بھجوانے کی آخری تاریخ ۱۵ مئی ۱۹۸۸ء ہے۔ خط اس پتے پر لکھیں۔

"پرائڈ آف پوزیشن" ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی، سائٹ کراچی ۱۶

مُحمّد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

شعبان المعظم

قمری سال کا آٹھواں مہینہ ہے، شعبان میں متفرّق ہونے، جُدا جُدا ہونے اور شاخ در شاخ ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ جمادیُ الاولیٰ اور جمادیُ الاُخریٰ میں سخت سردی کی وجہ سے عرب بدّو گھروں میں دبکے رہنے پر مجبور ہو جاتے تھے، مگر جب سردی ختم ہو جاتی تو وہ اس مہینے میں لُوٹ مار اور کاروبار کے لیے اِدھر اُدھر متفرّق ہو جاتے۔ اس لیے اسے شعبان کہا جاتا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس مہینے کا نام شعبان اس لیے رکھا گیا کیونکہ اس میں روزے رکھنے سے روزہ دار کی نیکیوں میں شاخوں کی طرح اضافہ ہوتا ہے اور وہ شاخ در شاخ بڑھتی جاتی ہیں۔

چنانچہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ گویا یہ رمضان کے لیے ایک قسم کی ریہرسل تھی۔ اس مہینے کی پندرھویں رات بڑی فضیلت اور عظمت والی ہے۔ اُسے "شبِ برات" کہا جاتا ہے۔ اس رات میں عبادت کرنے سے بہت زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ بعض لوگ اس عظیم الشان رات کو کھیل کُود اور آتش بازی میں گزار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہندوؤں کی رسم ہے۔ ۳، شعبان ۴ھ کو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسے حضرت علیؓ کے لختِ جگر اور مسلمانوں کے امام اور رہنما حضرت حسینؓ پیدا ہوئے۔

قہقہے

نصراللہ خاں

میرے ایک دوست اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے۔ بات بے بات قہقہہ لگاتے تھے۔ لیکن جب اُن کی شادی ہو گئی تو میں یہ سمجھا کہ شاید شادی کے بعد ان کی بیوی ان کی یہ عادت چھُڑوا دے گی، بعض بیویاں قہقہہ لگانا تو کیا کھانا پینا تک چھُڑوا دیتی ہیں تو بھلا کسی بیوی کے لیے اپنے شوہر کی بے سبب قہقہہ لگانے کی عادت چھُڑوانا کیا مشکل ہے۔ یقین ہے کہ شروع شروع بیوی نے یہ کوشش ضرور کی ہوگی چنانچہ جب یہ بے سبب بات بے بات قہقہہ لگاتے ہوں گے تو وہ ان سے روٹھ جاتی ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ کھانا پینا ہی چھوڑ دیتی ہو اور اٹوائی کھٹوائی لے کر اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر سو جاتی ہو۔ بیوی کی اس حالت پر یہ بھی قہقہے پر قہقہے لگا کر اُسے مناتے ہوں اور اس سے یہ کہتے ہوں کہ "دیکھو بیگم تمھیں روتا دیکھ کر میرا بھی رونے کو بہت جی چاہتا ہے، لیکن (قہقہہ لگا کر) میں کیا کروں میرا سارا رونا قہقہے میں نکل جاتا ہے۔ چنانچہ میرا رونا بھی قہقہوں میں ہوتا ہے اور میں جان بوجھ کر قہقہہ نہیں لگاتا۔ کم بخت یہ بے اختیاری میں نکل جاتا ہے۔ جیسے کسی کو جماہی یا ڈکار آتی ہے یا محفل میں بیٹھے بیٹھے چھینک پہ چھینکیں آنے لگیں ذرا سوچو تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ بے چارا سارے کا سارا ڈکاروں اور چھینکوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن ان پر قابو نہیں پا سکتا۔ تو یہی حال میرے قہقہوں کا ہے لیکن آج سے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنے قہقہوں پہ قابو پانے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔ لیکن اس کی یہ شرط ہے کہ تم بھی میرے اس قہقہے کے

ساتھ جو میری زندگی کا آخری قہقہہ ہوگا' قہقہہ لگاؤگی لیکن تم تو مُسکراتی بھی بڑی مشکل سے ہو، کیا تمہیں مُسکرانا نہیں آتا یا تمہیں مُسکرانے میں تکلیف ہوتی ہے"؟ (قہقہہ) چنانچہ بیوی نے بھی اپنے شوہر کی فرمائش پر ایک فرمائشی قہقہہ لگا دیا اور شوہر اپنی بیوی سے بہت خوش ہو گئے۔

اِدھر کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بیوی میاں سے پہلے اور میاں سے زیادہ قہقہے لگانے لگیں۔ اگر میاں بیوی میں قہقہوں کا مقابلہ ہوتا تو بیوی میاں سے کئی سینڈل آگے نکل جاتی، لیکن یہ عجب بات ہے کہ یہ جب گھر میں ہوتے تو ان میں سے کوئی قہقہہ نہ لگاتا۔ ممکن ہے کہ گھر سے باہر یہ قہقہہ لگا لگا کر جب گھر آتے ہوں تو تھک جاتے ہوں اور پھر قہقہہ لگانے کے قابل نہ رہتے ہوں۔

لڑکی کے میکے والے یہ کہتے کہ یہاں سے تو اچھی بھلی گئی تھی، لیکن سسرال پہنچتے ہی اُسے میاں کی بیماری لگ گئی۔

ایک دن بیوی نے مجھے یہ بتایا کہ "شادی کے بعد کئی دن تک یہ قہقہے لگاتے رہے، مجھے ان کے قہقہوں پر ہنسی تو ضرور آتی تھی لیکن میں ان کے ساتھ قہقہے نہیں لگاتی تھی۔ اور مجھے جو ہنسی آتی تھی تو وہ ان کے احمقانہ قہقہوں پہ آتی تھی۔ پھر یہ ہُوا کہ جب ہم دونوں کسی سے ملنے جاتے یا کوئی ہم سے ملنے آتا، تو یہ بات بے بات اپنے ملنے والوں سے باتیں کرتے کرتے قہقہے لگاتے تو بلا سبب قہقہہ لگانے پر یہ بے وقوف سے لگتے تھے۔ چنانچہ ان کی حماقت کو چھُپانے کے لیے مجھے بھی قہقہہ لگانا پڑتا۔ گویا ان کی ہمدردی میں مَیں بھی احمقانہ قہقہے لگانے لگی۔ تاکہ یہ تنہا احمق نہ سمجھے جائیں"۔

اور یہ میاں بیوی ایسے نازک موقعے پر بھی جو رونے دھونے یا ہمدردی کرنے کا ہوتا تو اس وقت بھی یہ قہقہے لگاتے۔ مثلاً ان کے ایک دوست کے والد کا انتقال ہو گیا۔ یہ دونوں میاں بیوی اور ہم ان کے گھر تعزیت کرنے پہنچے تو جن کے والد کا انتقال ہوا تھا تو اُن سے میاں نے یہ پوچھا تھا کہ حضرت قبلہ گاہی کا کب انتقال ہوا تھا تو جن کے والد کا انتقال ہُوا تھا۔ اُنھوں نے یہ کہا کہ والد صاحب کا انتقال کل ہُوا تھا۔ تو اس پر میاں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ بیوی بھی اپنے میاں کے ساتھ تھوڑی سی قہقہہ زن ہوئیں۔ بیوی نے کہا "بھائی صاحب اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے"۔ اور پھر وہ زیرِ لب مُسکرانے لگیں اور میاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس شخص کو میاں بیوی کی اس نازیبا حرکت پر بہت غصہ آیا، لیکن اُس نے جس طرح اپنے باپ کی جدائی برداشت کی تھی تو وہ اُسی طرح ان کے احمقانہ قہقہے بھی پی گیا۔ لیکن ایک جگہ یہ حضرت اس احمقانہ انداز سے قہقہہ لگانے پر بُری طرح پٹ بھی

گئے لیکن میاں کو مارنے والے نے بیوی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ اور جب میاں کو رکشا میں ڈال کر بیوی گھر لائی اور جب وہ اُن کی چوٹوں پر ہلدی چونا لگا کر فارغ ہوئی، تو بیوی نے ایک قہقہہ لگا کر میاں سے پوچھا "درد تو نہیں ہو رہا ہے"۔ میاں نے آنسو پونچھتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا کہ "اب ہم کسی کے یہاں ہمدردی کرنے نہیں جائیں گے۔ کیونکہ ہمدردی کا زمانہ ہی نہیں رہا ہے"۔

اور پھر ایک دن ان کی بیوی کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تو بیوی کی ماں نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹی کم از کم دو چار دن تک اپنے قہقہے روکے رکھنا۔ بیوی نے کہا کہ "میں تو خیر روک لوں گی۔ یوں بھی عورتیں بہت صابر ہوتی ہیں، لیکن آپ کے داماد کو کون روکے گا"؟

آخر یہ طے پایا کہ بیوی ٹیلی فون پر اپنے شوہر کو یہ بتائے کہ وہ کسی ضروری کام سے اپنے میکے آئی ہے اور وہ دو چار دن تک یہیں رہے گی۔ داماد صاحب کبھی کبھی سُسرال آجایا کرتے تھے اور یہ خیال تھا کہ شاید وہ دو چار دن تک نہ آئیں۔ ویسے بھی ان کو دفتر کے بہت سے کام تھے، لیکن جب دو دن گزرنے کے بعد اُنھیں بیوی کی یاد ستائی تو وہ اپنے سُسرال پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جب یہ کمرے میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے سب کو سوگوار دیکھا۔ ساس اور اُن کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انھوں نے قہقہہ لگا کر ساس سے پوچھا "اماں جان خیریت تو ہے"؟ تو اس پر بیوی نے کہا کہ "ابا جان کا انتقال ہو گیا ہے"۔ تو انھوں نے زوردار قہقہہ لگا کر پوچھا۔

"کب ہوا"؟

تو اگرچہ بیوی اپنے قہقہے کو روکتی رہی، لیکن ان کے قہقہے کے ساتھ بے ساختہ اس کا بھی قہقہہ نکل گیا۔ اور اُس نے کہا کہ "ابا جان کا پرسوں انتقال ہُوا تھا"۔

فرمایا ... "مجھے اطلاع کیوں نہیں کی"؟

بیوی نے کہا کہ "تم اپنے دفتر کے کاموں میں بہت مصروف تھے اور ٹیلی فون بھی خراب ہو گیا تھا اور اطلاع دینے والا بھی کوئی نہ تھا"۔ تو داماد صاحب نے اپنی ساس سے کہا کہ "اماں جان صبر سے کام لیجیے۔ مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے" اور پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور بیوی نے بھی ساتھ دیا۔ اور جو لوگ تعزیت کرنے آئے تھے ... ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرانے لگے اور بیچاری ساس بھی کھسیانی ہنسی ہنستی رہی۔

بیٹی داماد تھے تو کچھ نہ کہہ سکی۔ اگر بیٹا بہو ہوتے تو جُوتے مار مار کر گھر سے نکال باہر کرتی۔

ہم کیوں ہنستے ہیں؟

شانی ایوبؔ

اگر آپ سے کوئی یہ سوال کرے کہ آپ ہنستے کیوں ہیں ؟ تو آپ یقیناً سوال کرنے والے کی ذہنی حالت پر شک کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس لیے نہیں کہ خدانخواستہ آپ شکّی مزاج واقع ہوئے ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ سوال ہی ایسا ہے۔ بھلا ہنسنے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ جس بات پر ہم ہنس دیتے ہیں وہ ہوتی ہی اس قابل ہے کہ اس پر ہنسا جائے، لیکن جناب معاملہ اتنا سادا نہیں ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کے کئی فلسفی اور دانشور حضرات نے اس معاملے کو "زیرِ غور" لا لاکر اسے ایک سنجیدہ مسئلے بلکہ پیچیدہ فلسفے میں تبدیل کر دیا ہے۔

اس ضمن میں ایک دانشور کا قول ہے "انسان ہنستا ہے لیکن فرشتے نہیں ہنستے اور ہنسیں بھی کیوں؟ اُن کی زندگی تو مکمل ہے اور ہنسی نتیجہ ہے عدم تکمیل کا"۔ گویا انسان اس لیے ہنستا ہے کہ اُس کی زندگی مکمل ہو جائے۔

اسی طرح ہنسی کے بارے میں ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ ہنسنے سے انسان کا غم دُور ہو جاتا ہے۔ اور آج کے دور میں کون ایسا ہے جسے کوئی غم نہیں؟ کوئی نوکری نہ ملنے کے سبب غمگین ہے تو کوئی نوکری مِل جانے کی وجہ سے غمگین ہے، کسی کو پیٹ بھر کے کھانا نہ ملنے کا غم ہے تو کسی کو پیٹ سے زیادہ کھا جانے کا دُکھ ہے کسی کو اس بات کا غم کہ اُسے کوئی غم کیوں نہیں؟ چنانچہ اس صورتِ حال میں ہر شخص ہنسنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خود کو غبارے کی طرح ہلکا پھُلکا محسوس کر سکے

ہنسی کے ضمن میں یہ خیالات بڑی حد تک غیر سائنسی یا غیر منظم تصوّر کیے جاتے ہیں۔ بہت سے دیگر مسائل کی طرح ہنسی کے مسئلہ پر بھی باقاعدہ انداز میں غور و فکر کا آغاز عظیم فلسفیوں کی سرزمین یونان سے ہوا۔ ہنسی کے بارے میں عظیم یونانی فلسفی ارسطو کا خیال یہ تھا کہ جب ہم کسی انسان میں کوئی ایسی کمی یا بدصورتی دیکھتے ہیں جس کو دیکھنے سے افسوس نہ ہوتا ہو تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ مثلاً جب ہم کسی ایسے

آدمی کو دیکھتے ہیں جو دونوں ٹانگوں سے معذور ہو تو ہمیں ہنسی نہیں آتی۔ بلکہ اس کے بجائے رنج ہوتا ہے۔ جبکہ ہم ایک ایسے شخص کو دیکھیں جس کی ناک طوطے کی چونچ جیسی ہو تو ہم بے اختیار مُسکرا اُٹھتے ہیں۔ ارسطو کا یہ نظریہ ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن یہ نظریہ ہنسی آنے کے سارے اسباب پر روشنی نہیں ڈالتا بلکہ صرف ایک سبب کو بیان کرتا ہے۔

ارسطو کے بعد سترھویں صدی میں ایک اور فلسفی تھامس ہابز نے ہنسی کے متعلق ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو لوگ کسی بات پہ ہنستے ہیں وہ ہنستے ہوئے ایک طرح کی احساسِ برتری کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستے ہیں۔ اس بات کو مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ کُرسی پر بیٹھتے وقت پیچھے کی طرف لُڑھک جاتے ہیں کیونکہ آپ کے اندازے کے برخلاف پیچھے کُرسی موجود ہی نہیں تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر دوسرے ہنسنے لگتے ہیں اور آپ جھینپ جاتے ہیں کیونکہ کُرسی کی موجودگی کے سلسلے میں آپ کا اندازہ غلط ثابت ہُوا تھا۔

تھامس ہابز کی اس رائے پر کئی اعتراضات کیے جا سکتے ہیں، مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ گدگُدی کرنے سے جو ہنسی آتی ہے یا بچّوں کے معصوم قہقہوں میں احساسِ برتری کہاں پوشیدہ ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

مغربی جرمنی کے معروف فلسفی ایمونیئل کانٹ کا ہنسی کے بارے میں یہ خیال تھا کہ جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور اس چیز سے متعلق ہماری توقعات بُلبُلے کی طرح پھٹ جائیں تو ہمیں بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آپ ایک اسٹیج ڈرامہ دیکھ رہے ہیں جس میں کوئی اداکار بادشاہ کا لباس پہنے گھن گرج کے ساتھ مکالمے بول رہا ہے "بولتے بولتے اچانک وہ اپنا تاج پھینک کر گھبرا کر اسٹیج کے پیچھے کُود جاتا ہے تو ظاہر ہے" ہال قہقہوں سے گونج اُٹھے گا۔ کیونکہ تماشائی بادشاہ کے خطاب کا اثر قبول کر رہے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ اس خطاب کے بعد ڈرامہ اور آگے بڑھے گا اس میں کلائمکس پیدا ہوگا لیکن ان کی توقعات کے برعکس ڈرامہ ادھورا ختم ہو گیا اور لوگوں کی ہنسی کا باعث بن گیا۔

فرانس کے فلسفی شوپنہاور نے ہنسی آنے کی وجہ یہ بتائی کہ انسان کے تخیّل اور حقیقت کے درمیان ایک ناہمواری پائی جاتی ہے جب ہم اس ناہمواری کو اچانک محسوس کر لیتے ہیں تو ہمیں بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ شوپنہاور کا خیال یہ بھی تھا کہ یہ ناہمواری ہماری توقع سے جتنی زیادہ ہو گی ہمیں اتنی ہی شدید طور پر ہنسی آئے گی۔ اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ آپ ایک خاتون کو دیکھیں جو اپنے بیٹے کو آواز دے رہی ہے "منّے میاں، بھاگ کے ادھر آنا" اور جب مُنّے میاں سامنے آئیں تو آپ دیکھیں کہ سامنے

ایک چھ فٹ کا ہٹا کٹا تیس سال کا جوان کھڑا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے۔ کیونکہ عورت کے منہ سے مُنّے میاں سُن کر آپ کے تخیّل میں ایک چھ سات سال کے بچّے کا ہیولا بنا تھا، لیکن حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ اس طرح آپ کے تخیّل اور حقیقت میں ناہمواری موجود تھی اُسے آپ نے ایک دم محسوس کیا اور ہنس پڑے۔

کانٹ اور شوپنہاور کے نظریات کی آمیزش سے میکس الیسٹ مین نے ہنسی کے نظریات کو آسان بنا کر ہنسی کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ الیسٹ مین کا خیال ہے کہ بچّے کو ہنسانے کے دو طریقے ہیں پہلا تو یہ کہ آپ ہنسیں اور جب بچّہ آپ کی طرف متوجّہ ہو جائے تو اپنے چہرے کو یوں ٹیکھا کر لیں کہ آپ کی صورت خوفناک دکھائی دے اِس پر بچّہ بے ساختہ ہنس دے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز پکڑ کر بچّے کے قریب لے جائیں جسے وہ پسند کرتا ہو۔ اور جب بچّہ ہاتھ بڑھا کر اُس چیز کو پکڑنے لگے تو مسکرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ اُس کے خیال میں بچّے کے لیے آپ کی یہ حرکت ایک دلچسپ لطیفے سے زیادہ مزیدار ہوگی۔

الیسٹ مین کے اس تصوّر پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل اُس کے نزدیک ہنسی کسی صورتِ حال کی مکمل بلکہ متضاد تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ صورتِ حال کی یہ تبدیلی دیکھنے والے کے لیے چونکہ بالکل غیر متوقع ہوتی ہے اس لیے وہ فوراً اُس صورتِ حال سے متعلق اپنے تصوّرات میں تبدیلی کرنے کے قابل نہیں ہوتا، جس کے باعث وہ صورتِ حال اُس کے لیے مضحکہ خیز بن جاتی ہے اور وہ اس پر ہنس پڑتا ہے۔

ہنسی سے متعلق مندرجہ بالا نظریات دنیا بھر میں عرصہ دراز تک مقبول رہے۔ تاہم بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں فرانس کے مشہور فلسفی برگساں نے اپنی عالمی شہرت یافتہ کتاب "ہنسی" میں ہنسی سے متعلق نئے نظریات پیش کیے۔ اُس کے بقول " زندگی لچک اور مسلسل عمل سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسے تیز رفتار گھوڑے کی طرح ہے جو نامعلوم منزل کی جانب ٹھہرے بغیر چلا جا رہا ہے، لیکن جب یہ گھوڑا کسی مقام پر لمحہ بھر کے لیے ٹھہرتا ہے تو زندگی کے مسلسل عمل کا اصول ٹوٹ جاتا ہے اور اس عمل کے نتیجے میں ہم ہنسنے لگتے ہیں "۔

برگساں کے ان خیالات کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ ہم دنیا میں پائی جانے والی تمام چیزوں اور اُن کے عمل کے بارے میں کچھ مخصوص تصوّرات رکھتے ہیں۔ یعنی ہم یہ طے کر لیتے ہیں کہ فلاں چیز اگر اس طرح عمل کرے

گی تو اُس کا عمل معقول یا درست ہوگا ۔ اور اگر اس کے برعکس عمل کرے گی تو وہ نا معقول اور غیر درست ہوگا ۔ چنانچہ جب ہمارے سامنے کوئی چیز کسی غیر معقول طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہے تو ہم اس پر ہنس دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ہر بڑی عُمر کے شخص کے بارے میں یہ تصوّر ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرے گا جس سے کم عقلی یا بچپنا ظاہر ہو ۔ اسی طرح بچّے کے بارے میں یہ تصوّر کیا جاتا ہے کہ وہ سنجیدہ اور بے حد عقل مندی کی بات نہیں کرے گا ۔ لیکن جب ہم کسی بڑے آدمی کو بچکانہ اور بچّے کو بڑے جیسی بات کرتے دیکھتے ہیں تو ہم اُس پر مُسکرائے بغیر نہیں رہ پاتے ۔ لیکن اگر زندگی کے جمود ٹوٹنے سے کوئی نقصان ہوتا ہو تو پھر ہمیں اُس عمل پر ہنسی نہیں آتی مثلاً کسی ٹریفک کے حادثے کو دیکھ کر ۔ برگساں کے ان نظریات کی وضاحت سرکس کے اُس منظر سے بھی کی جا سکتی ہے جس میں ایک نہایت طاقت ور شخص اسٹیج پر رکھی ہوئی کسی بھاری چیز کو اُٹھا کر دکھاتا ہے ۔ اور اس کے بعد جسمانی طور پر بے حد کمزور مسخرہ بے ہنگم لباس پہنے اکڑتا ہُوا آتا ہے اور اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے وزنی چیز کو اُٹھانے کے لیے جُھکتا ہے، لیکن اُٹھا نہیں پاتا ۔ اور صرف اُسے ہاتھ لگا کر چھوڑ دیتا ہے اور اُس کی اس حرکت پر ہال میں بیٹھے ہوئے حاضرین قہقہوں کے فوّارے چھوڑ دیتے ہیں ۔

بعض جدید فلسفیوں کا خیال ہے کہ ہنسی سے متعلق ان تمام نظریات میں ایک خامی ہے اور وہ یہ کہ یہ نظریات انسان کی طبیعت میں موجود اُن کیفیتوں کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہیں، جو اگر موجود نہ ہوں تو انسان کسی بھی مضحکہ خیز یا غیر متوقع صورتِ حال میں ہنسنے پر مائل نہیں ہو سکتا مثلاً انسان خود ہلکے پھلکے مُوڈ میں ہو، یعنی اگر ہم سنجیدہ یا غمگین ہوں تو چاہے چیونٹی اپنی کمر پر ہاتھی لاد کر ہمارے سامنے آجائے ہمیں ہنسی نہیں آئے گی، ان صاحبان کا خیال ہے کہ جب ہم خود ہنسنے کے مُوڈ میں ہوتے ہیں تو خوشگوار چیزوں کے ساتھ ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی ہمارے ہنسنے کا باعث بن جاتی ہیں ۔

مفکرین کے نزدیک انسان میں ہنسنے کا رجحان بچپن کا امتیازی نشان ہے اور بچّوں کی ہنسی، اس عمل کی سادہ ترین شکل ہے ۔

جہاں تک اس سوال کا تعلّق ہے کہ اس کائنات میں پہلی ہنسی کون ہنسا ہوگا تو اس ضمن میں بھی بعض فلسفی حضرات کا خیال ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کھانے کے جرم میں جنّت سے نکالا گیا ہوگا تو ابلیس نے اپنی اس کامیابی پر یقیناً زبردست قہقہہ لگایا ۔ ۔ ہوگا ۔ اس طرح شیطان کو ہنسی کا موجد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔

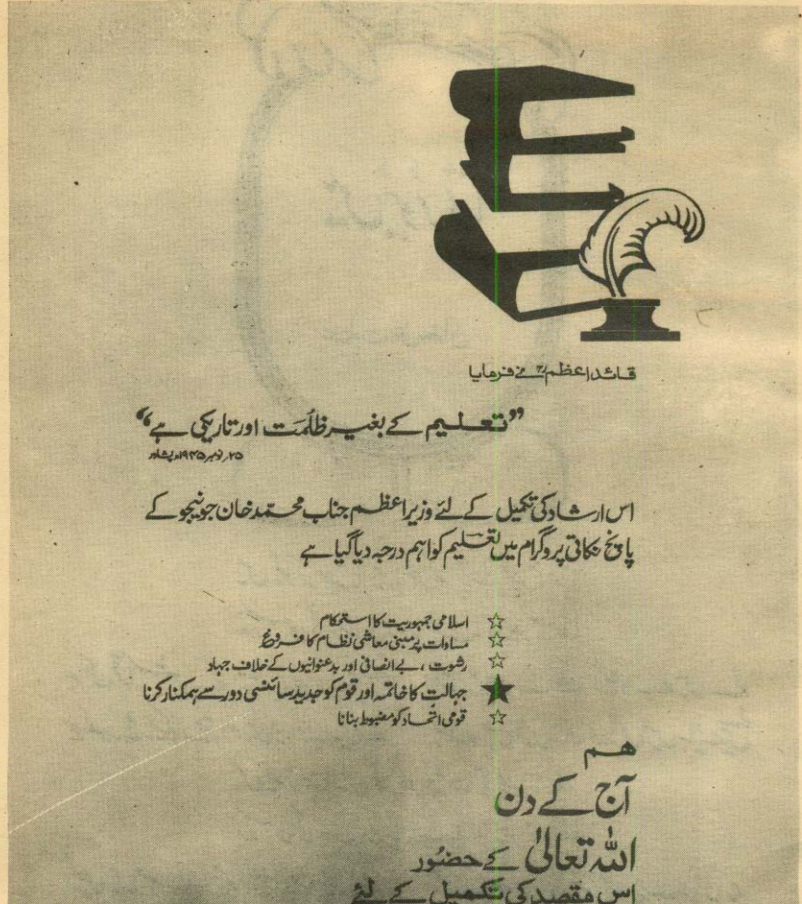

United

PID-1-29/87

میں ٹیوٹر تھا

عنایت علی خان

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

ہر اک قماش کے بچّے پڑھا دیے میں نے
مَتاعِ علم کے نلکے لگا دیے میں نے
جو کھوٹے سکّے تھے وہ بھی چلا دیے میں نے
جو اے.ایس.ایلٹ تھے سی.ایس.ایس بنا دیے میں نے

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

کہیں میں صوفے پہ بیٹھا کہیں چٹائی پر
کہیں بٹھایا گیا کھُرّی چارپائی پر
کہیں سے نکلا کسی "لال" کی پٹائی پر
کسی عزیز نے ٹرخا دیا مٹھائی پر

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

جو چھوٹا بھائی بھی شاگرد کا کوئی ہوتا
تو وہ بھی آن کے میری ہی گود میں سوتا
بڑا جو پٹتا تو چھوٹا بھی "پھوٹ" کر روتا
میں شیروانی کے دامن کو بیٹھ کر دھوتا

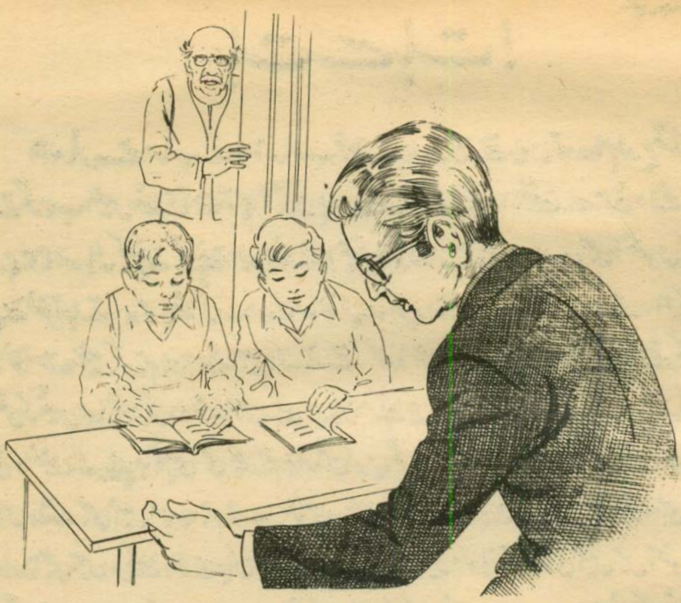

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

نہ کوئی شام مری اپنی شام ہوتی تھی   کہ میری شام تو بچوں کے نام ہوتی تھی
یہ جب کسی کی "ممی" ہم کلام ہوتی تھی   تو میرے علم کی پونجی تمام ہوتی تھی

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

نہ قدر دان کوئی صاحبِ نظر پایا   نہ گھاٹ ہی کا رہا میں نہ کوئی گھر پایا
خطاب پایا تو بچوں کا ٹیوٹر پایا !   میں اپنی قوم کے بچے پڑھا کے بھر پایا

میں ٹیوٹر تھا میں گھر گھر پڑھاتا پھرتا تھا
مُدرّسی کی بندریا نچاتا پھرتا تھا

ASS - گدھا   CSS - سینٹرل سول سرونٹ (اعلیٰ حکام)

محمد جاوید خالد

بات سے بات!

ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب غصّے کے بہت تیز تھے۔ یوں تو وہ عام طور پر مُسکراتے نظر آتے مگر جب انھیں غصّہ آتا تھا تو پھر آتا ہی چلا جاتا تھا۔ ابتدا کان اینٹھنے سے ہوتی، اگلے ہی لمحے ہاتھ سر پر ہوتا اور بال کھنچتے کھنچتے ایسا زنّاٹے کا تھپّڑ پڑتا کہ دن میں تارے اور وہ بھی آنکھوں کے عین سامنے ناچتے نظر آجاتے۔ یہ جو پٹنے کی روداد کے ساتھ اپنے اُوپر بیتی ہم بیان کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ ہم ہوم ورک نہیں کرتے تھے۔ کند ذہن تھے یا نالائق واقع ہوئے تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ بتّیس بھائیوں کی وہ شریر بہن جسے "زبان" کہتے ہیں، ایسے موقعوں پر شرما کر یا گھبرا کر اپنے بھائیوں یعنی دانتوں کے پیچھے جا چُھپتی تھی پھر ہم ہزار جتن کریں مگر یہ خدا کی بندی ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی۔ حتّٰی کہ اس وقت بھی نہیں، جب ہم بڑے اہتمام اور شاندار طریقے سے پٹ رہے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا رونا بھی ہمیں دیکھنے والا ہی جان سکتا تھا۔ کوئی آواز نہیں، کوئی آہ وزاری نہیں بس آنسو ہیں کہ ٹپ ٹپ گرتے جاتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ بھلا زبان کا چُپ رہنے سے پٹائی کا کیا تعلق مگر ہمیں

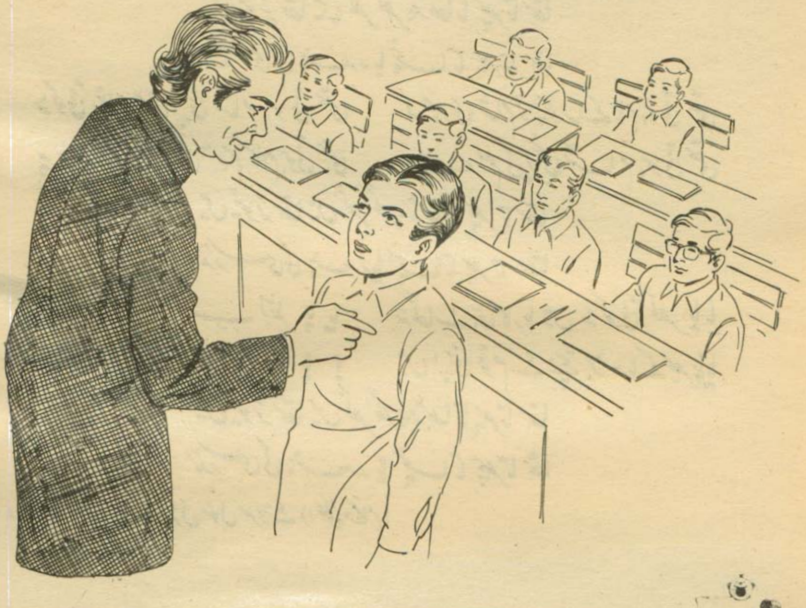

یہ بھی یقین ہے کہ بہت سے ساتھی اس حقیقت کو جانتے ہوں گے کچھ کو تجربہ ہو گیا ہو گا اور کچھ کے اُوپر بیت رہی ہو گی۔ ہوتا یہ تھا کہ ماسٹر صاحب نے سوال چیک کرتے کرتے ایک جگہ انگلی رکھ دی۔
"یہاں جو پانچ لکھا ہے، کیسے آیا؟" انھوں نے پوچھا۔ آپ قسم لے لیں، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ پانچ کا ہندسہ ہم نے کس ہندسے سے عاریتاً قرض لیا ہے مگر۔۔۔ بولنا چاہتے ہیں، نہیں بول سکتے۔"
"سوال خود کیا تھا؟" ماسٹر صاحب کی آواز اونچی ہونا شروع ہوئی۔ جواب میں خاموشی۔"
" ابّا نے کر کے دیا ہے؟" انھوں نے کاپی بند کر کے اور قلم میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک چُپ سو کو ہراتی ہے لیکن ہم نے تو یہی دیکھا کہ سامنے صرف ایک ماسٹر صاحب ہیں اور ہرانا تو دُور کی بات ہے، مقابلہ برابر ہی نہ رہا اور پھر وہی ہوتا جو ہم نے شروع میں بیان کیا یعنی دن میں تارے وغیرہ، بڑھتے بڑھتے ہم پہلے سے بڑے ہو گئے اور پڑھتے پڑھتے میٹرک تک پہنچ گئے۔ زبان اگرچہ پہلے کی طرح تنگ نہ کرتی تھی مگر وہ جو بزرگوں نے کہا ہے کہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے تو ہماری خاموشی پریشان کرتی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے زیادہ پٹتے تھے اب کم بلکہ اکثر ڈانٹ ڈپٹ ہی سے بلا ٹل جاتی تھی۔ میٹرک ہی میں ہمیں ایسے دوست بھی ملے جن کو دیکھ کر، سُن کر، ہمیں زبان دانتوں تلے دبانے کا محاورہ بے ساختہ یاد آ گیا۔ ظالم کام نہیں کرتے تھے اور وہ، وہ بہانے ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ بس۔ سوال نقل سے کرتے اور اس میں بھی اکثر غلط، مگر اس کے حق میں ایسی ایسی دلیلیں دیتے کہ ماسٹر صاحب کو چُپ ہوتے ہی بنتی۔ ماسٹر صاحب اگرچہ اُنھیں کبھی کبھی بُری طرح پھٹکارتے اور تاریک مستقبل کا ہولناک نقشہ کھینچتے مگر سچی بات یہ ہے کہ ان کی "زبان دانی" پر ہمیں بہت رشک آتا تھا۔ ہمارے اس رشک کو ہمارے ان دوستوں نے یہ کہہ کر بڑی حد تک ختم کر دیا۔ "کالج میں جاؤ گے تو تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ گے۔"
ہمارے تجسس نے کالج کے متعلق ہمیں مزید معلومات حاصل کرنے پر اُکسایا اور جب ہم پر یہ انکشافات ہوئے کہ کالج ایک ایسی جگہ ہے، جہاں جب چاہے جاؤ اور جب چاہے اُٹھ کر چلے آؤ۔ جہاں کوئی ہوم ورک نہیں ہوتا۔ جہاں پٹائی تو کجا ڈانٹ ڈپٹ تک نہیں ہوتی بلکہ بعض اساتذہ تو اتنے شریف النفس ہوتے ہیں کہ طلبہ سے ڈرتے ہیں اور موقع بے موقع جتنا چاہے بولو کوئی پوچھنے والا نہیں تو ہمیں بالکل ایسا ہی محسوس ہُوا کہ ہم میٹرک نہیں کریں گے گویا کسی جیل سے آزادی پائیں گے۔
خدا خدا کر کے آخر وہ دن بھی آیا کہ خیر سے ہم میٹرک پاس ہو گئے۔ ہمارے بڑوں نے مٹھائی بھی بانٹی اور نصیحتوں کا دفتر بھی کھول دیا۔ امّاں نے پیار سے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا "میرا بیٹا

تو بہت بڑا آدمی بنے گا" کہ ابا جھٹ سے بول پڑے " صحیح پڑھائی تو اب شروع ہو گی، برخوردار! اپنی دوسری مصروفیات اب ختم کر دو اور پڑھنے پر زیادہ سے زیادہ وقت لگاؤ "

ہم نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ بھائی جان نے ارشاد فرمایا: "ایک زمانے میں میٹرک پاس ڈپٹی کلکٹر ہو جایا کرتے تھے۔ اب تم ذمّہ دار بنو۔ جب بھی بولو، سوچ سمجھ کر بولو" گویا ہم اب تک بغیر سوچے سمجھے بولتے آئے تھے۔ حالانکہ ہم بولتے ہی کب تھے۔ یعنئے صاحب زبان بے چاری خاک کھُلے ؟ وہ تو بھلا ہو ہمارے دوستوں کا جو خاص طور پر اپنے کالج سے چھٹیاں کر کے ہمارے کالج میں آئے اور چند دن ہمارے اوپر صرف کیے۔ اور ہمیں بقول اُن کے "کالج کے قابل" بنایا۔ بہر حال باقی باتیں تو ایک طرف، ہماری زبان رواں ہونا شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چل نکلی یہاں تک کہ بولتے بولتے ہم کمرۂ جماعت میں اور ماسٹر صاحب کے سامنے بھی جنھیں اب پروفیسر صاحب کہنا چاہیئے، بولنے لگے۔ ایک روز اسی طرح حسب معمول چہک رہے تھے کہ پروفیسر صاحب بولے " میں بڑھ چڑھ کر بولنے والوں کو دیکھ رہا ہوں ٹیسٹ ہو گا تو پتہ چل جائے گا کتنے پانی میں ہیں"

"پانی تو سرے سے ہے ہی نہیں سر! چاروں طرف خشکی ہی خشکی ہے " ہم نے فوراً جواب دیا، کلاس ہنس پڑی پروفیسر صاحب تھوڑے سے سنجیدہ ہو گئے۔ ایک ساتھی نے پوچھا "ٹیسٹ کس روز ہو گا سر؟"

"اسی جمعرات کو" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

"بہت اچھا کیا سر! جو آپ نے جمعرات کو ٹیسٹ رکھا، کچھ نمبر اللہ کے نام پر بھی مل جائیں گے "

ہم پھر بولے۔ کلاس ایک بار پھر ہنس پڑی۔ پروفیسر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر آہستہ آہستہ ہماری جانب آئے۔ ہمیں اگرچہ اطمینان ہو چکا تھا کہ کالج میں پٹائی نہیں ہوتی مگر دل کی دھڑکن اور خون کا دوران دونوں بڑھنے میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے پر تُلے ہوئے تھے۔

"برخوردار!" پروفیسر صاحب قریب سے بول رہے تھے مگر معلوم ہوتا تھا بہت دُور سے بول رہے ہیں " اللہ تعالیٰ نے سُننے کو دو کان دیے ہیں جبکہ بولنے کو صرف ایک زبان۔ معلوم ہُوا سُننے کا کام زیادہ ہے۔ بولنے کا کم، سمجھے "

"جی سر" ہم نے جیسے تیسے جواب دیا۔ اور اس کے بعد ظاہر ہے پورا ماضی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ زبان پھر آگے آتے ہوئے گھبرانے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا استعمال سوالوں کو رٹا لگانے تک محدود ہوتا گیا۔

پھر ایک دن ہم کالج سے بھی رخصت ہوئے اور ہماری عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ نت نئے تجربے ہوئے۔ نئی نئی باتیں سامنے آئیں۔ بلکہ یہ کھلا کہ جو زیادہ باتیں کرلے، وہ زیادہ کامیاب ہے۔ ایک سردار جی کا قصہ آپ بھی سُن لیں ان کا نام منگل وال تھا اور الیکشن میں کھڑے ہوگئے تھے۔ مشکل اس وقت پیش آئی جب جلسے کا اہتمام ہوا اور سردار جی کو بتایا گیا کہ الیکشن جیتنے کے لیے جلسہ اور جلسہ جیتنے کے لیے تقریر کرنا بے حد ضروری ہے۔ تقریر کا موقع آیا تو سردار جی گھبرائے یار لوگوں نے تسلّی دی کہ آپ گھبرائیں نہیں جلسے میں بولنا کوئی مشکل کام نہیں۔ تقریر کیا ہے بس دو چار باتیں کرنا ہیں اور باتیں کیا ہیں، بات سے بات نکالتے چلے جائیں وغیرہ۔ قصہ مختصر سردار جی اسٹیج پر پہنچے اور بعد القابات وغیرہ کے یوں گویا ہوئے: "جی مجھے تقریر و قریر تو کرنی نہیں، بس دو چار باتیں کرنی ہیں اور باتیں بھی کیا کریں کہ باتیں تو کر گئے ہمارے بڑے۔ واہ! باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں اور پھول۔۔۔! واہ! پھولوں میں پھول گلاب کا۔ اور گلاب کے پھولوں کی کیا بات ہے، پھولوں کا بادشاہ ہے اور اس سے بنتی ہے گُلقند۔ گلقند تو آپ کو معلوم ہوگا، کیسی زبردست چیز ہے؟ قبض کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے اور جڑ۔۔۔ جڑوں میں جڑ خربوزے کی۔۔۔ اور خربوزہ؟ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔۔۔ رنگ؟ رنگوں میں رنگ سفید رنگ۔۔۔ اور سفید رنگ انگریز کا۔ اور انگریز وہ جس نے دو جنگیں لڑیں۔ فرسٹ ورلڈ وار، سیکنڈ ورلڈ وار۔ میرا نام منگل وال ہے، مجھے یاد رکھیں۔

الیکشن کا نتیجہ نکلا سردار جی کامیاب ہوگئے۔ ہم نے اس بات کو سنجیدہ نہیں لیا۔ سوچا کہ الیکشن کی حد تک ہی یہ بات ٹھیک ہوگی کہ ووٹ دینے میں کسی کی اپنی جیب سے جاتا ہی کیا ہے۔ اور اس لیے لوگ بھی کام، کردار، اخلاق سے زیادہ باتوں پر نظر رکھتے ہیں مگر جلد ہی ہمیں ایک پڑھے لکھے قابل آدمی کے بارے میں پتہ چلا کہ اُس نے باتوں کا سہارا لے کر نہ صرف بگڑی ہوئی بات بنالی بلکہ اپنی عزت بھی بچالی۔ وہ بات کچھ یوں ہوئی کہ ان صاحب کو ایک طویل عرصے بعد ایک پُرانے دوست ملے اور کھانے کا اصرار کرکے انھیں گھر لے آئے۔ بیوی بدمزاج تھی۔ انھوں نے جو بلند آواز سے کھانا بھیجنے کو کہا اور پوچھا کہ کیا پکا ہے۔ تو تڑسے جواب آیا کہ کچھ نہیں ہے، خاک پکا ہے۔"

پُرانے دوست نے یہ رنگ دیکھا تو اُٹھنا چاہا مگر اس قابل آدمی نے کہا: "میری بیوی کی باتوں پر نہ جاؤ۔ وہ اشاروں میں بات کرتی ہے۔ اس نے پکنے کے لیے "خاک" کہا ہے نا۔ خاک کو اُلٹا کرکے پڑھو تو "کاخ" بنے گا۔ جس نے معنی "محل" کے ہوتے ہیں۔ محل کو اُلٹا کرکے پڑھو تو "لحم" بن جائے گا اور عربی میں لحم، گوشت

کو کہتے ہیں۔ سو آج ہمارے ہاں گوشت پکا ہوگا!"

رفتہ رفتہ ہمیں یقین ہوگیا کہ باتیں بنانا ایک ایسا فن ہے جو شارٹ کٹ مارتا ہُوا کامیابی کی طرف نہایت تیزی سے لے جاتا ہے۔ لیکن یہ رنگ ابھی ہم پر پوری طرح نہیں چڑھا تھا کہ ایک بڑا عبرت انگیز واقعہ ہوا۔ واقعہ یوں تھا کہ ہمارے ایک دوست کو "سائنس ٹیچر" کی ملازمت کے لیے انٹرویو دینے جانا تھا اور پہلا موقع ہونے کی وجہ سے وہ تھوڑے سے پریشان تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا "میاں کوئی ڈرنے گھبرانے والی بات نہیں ہم نے بہت انٹرویو دیے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم انٹرویو لینے والوں کو اپنی باتوں سے رام کر لو اور اس کے لیے یہ کرو کہ سوال جیسا بھی ہو، جواب کو اپنے موضوع کی طرف لے آؤ۔" ان بزرگ نے اور جانے کیا کیا کچھ ہمارے ان دوست کو سمجھایا۔ بہرحال یہ انٹرویو دینے گئے۔ انٹرویو لینے والے تین افراد تھے اور تینوں بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے مُسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"انسان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات بتائیں"۔

انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا "صاحب انسان کی ابتدا کے بارے میں مختلف لوگوں نے بہت سی باتیں کی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ میں کہتا ہوں ابتدا میں رکھا ہی کیا ہے۔ ساری بات تو انتہا کی ہے دُنیا دھوکا ہے فریب ہے اور انسان بقول میر ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے

اسی موضوع کو ——" انٹرویو لینے والوں میں سے ایک نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں چُپ کرا دیا۔ ان انٹرویو لینے والوں کی مُسکراہٹ غائب ہوگئی تھی تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر دوسرے نے سوال کیا۔

"اچھا یہ بتائیں انسانی جسم میں دل کیا کام کرتا ہے؟"

ہمارے دوست نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور شروع ہو گئے "جی دل بظاہر تو گوشت کا ایک لوتھڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت انسان کے پورے جسم میں سب سے زیادہ حسّاس یہی چیز ہے۔ محبّت کے، نفرت کے جذبات سب سے پہلے یہی محسوس کرتا ہے۔ کسی نے ہنس کے بات کی تو خوشی سے اُچھلنے لگا۔ کہیں چوٹ لگی تو بھر آیا بقول غالب ؎

دِل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں"

ہمارے دوست کچھ اور بھی کہتے مگر انٹرویو لینے والوں کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ایک دم چُپ ہو گئے۔ جو یقیناً اچھے نہ تھے اب کے خاموشی بھی کچھ زیادہ دیر رہی۔ تیسرا کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے فائل بند کر دی تھوڑی دیر بعد وہی بولا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ تشریف لے جائیں۔"

"تو پھر میں اُمید رکھوں؟" ہمارے دوست نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد کیا ہُوا یہ ہمارے دوست نے نہیں بتایا مگر یہ ضرور بتایا کہ "وہاں نوکری کی اُمید نہیں ہے۔"

باتوں اور زبان کے استعمال پر کشمکش میں ہمیں کئی دن گزر گئے۔ ایک روز اتفاقاً کالج کے پروفیسر صاحب سے ملاقات ہو گئی ہم تو خیر اُنھیں جانتے ہی تھے وہ بھی ہمیں پہچان گئے۔ محبّت سے ملے، ہم نے اُنھیں بٹھایا۔ خاطر تواضع کی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم نے جھجکتے جھجکتے اپنی اُلجھن انھیں بتا ہی دی۔۔۔ پروفیسر صاحب مُسکرائے، کہنے لگے "برخوردار! صحیح بات یہ ہے کہ خاموشی بھی اچھی ہے اور گفتگو بھی۔ یہ دونوں چیزیں بُری اُس وقت ہوتی ہیں جب ان کا مقام بدل دیا جائے یعنی سُننے کی جگہ بولا جائے اور بولنے کے موقع پر خاموشی اختیار کر لی جائے۔ ان دونوں میں اہمیّت کے لحاظ سے گفتگو کا درجہ قدرے اونچا ہے۔ تم نے بچپن میں پڑھا تھا نا پہلے تولو پھر بولو۔" تو تولنے سے مراد باقاعدہ باٹ اور ترازو لے کر وزن کرنا نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بات کرنے سے پہلے اسے سوچو کہ کیا یہ بات کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں۔" پروفیسر صاحب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے پھر ان کی مُسکراہٹ تھوڑی سی اور گہری ہو گئی۔ کہنے لگے "یاد رکھو! بے وقوف بھی اس وقت تک عقل مندوں میں شمار ہوتا ہے، جب تک وہ چُپ رہتا ہے۔ یہ راز اُس وقت کُھلتا ہے جب وہ بولنا شروع کرتا ہے اور چونکہ بن سوچے بولتا ہے اس لیے بے وقوف ٹھہرتا ہے۔"

"بہت شکریہ سر!" ہم نے کہا "یہ بات میں نے گرہ میں باندھ لی۔"

وہ چلتے چلتے ایک دم رُکے، مڑے مُسکرائے اور کہنے لگے۔ "یہ بات باندھنے کی نہیں، استعمال کرنے کی ہے۔"

ہم نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر فوراً ہی بند کر لیا۔ خیال آیا کہ پہلے سوچ لینا چاہیے کہ جو بات ہم کہنے جا رہے ہیں پروفیسر صاحب کے سامنے کہنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ کچھ دیر سوچ کر دماغ نے فیصلہ دے دیا کہ ہاں یہ بات کہہ دینے میں کچھ ہرج نہیں۔ از سرِ نو منہ کھولا مگر پھر بند کرنا پڑا۔ پروفیسر صاحب دُور جا چکے تھے!

بھئی پرچہ تو ہو گیا تمھیں سوالات کیسے لگے ؟
سوالات تو خیر، بہت اچھے تھے مجھے تو اس کے جوابات نے پریشان کر دیا۔
SCHOOL
اُف میرے خدا! یہ چوہا... ! میرا تو دم نکلا جا رہا ہے!
مگر مس آپ تو کہتی تھیں کہ انسان کو صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے
سر! مُردہ طوطے کی شکل کو۔
سلیم بتاؤ کہ کثیر الزاویہ شکل کسے کہتے ہیں ؟
اس طرح میں کم از کم پانچ سو سال کی تاریخ پڑھنے سے تو بچ جاتا۔
ارے بھئی کیوں؟
کاش میں آج سے پانچ سو برس پہلے پیدا ہوا ہوتا۔
بچو! آج رات نو بجے چاند گرہن ہوگا اپنے والدین سے اجازت لے کر دیکھنا نہ بھولیے گا۔
سر! چاند گرہن کا پروگرام ٹی وی کا کون سا اسٹیشن پیش کرے گا؟
Teecher
Teecher
میری سمجھ میں ایک بات آج تک نہیں آئی کہ ہمارے ٹیچرز حضرات خود لکھتے پڑھتے کیوں نہیں جو بات اُنھیں معلوم نہیں ہوتی وہ ہم سے باری باری پوچھنا شروع کر دیتے ہیں؟

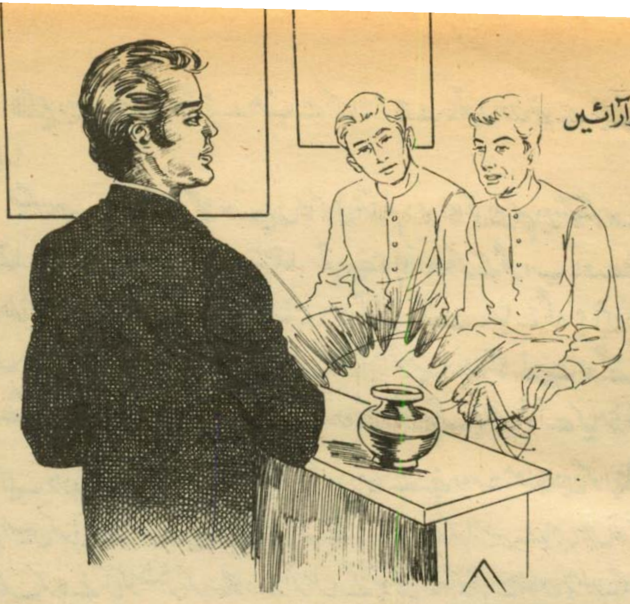

محمد پرویز آرائیں

اکبری لوٹا

لالہ کرم دین کو کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ لاہور کے انار کلی بازار میں ان کا مکان تھا۔ نیچے دو دکانیں تھیں، جن سے چھ سو روپے کرایہ وصول ہوتا تھا۔ بال بچّے ابھی نہیں تھے۔ صرف میاں اور بیوی کا خرچ تھا۔ اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے۔ مگر ایک ہزار روپے یکمشت اکھٹے کرنے کے لئے بھی نہ ملتے تھے۔ ایک دن لالہ کرم دین کی بیوی نے اُن سے ہزار روپے کا مطالبہ کیا تو ان کا دل دہل گیا۔ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ کو بھانپ کر ان کی بیوی نے کہا۔ "اگر آپ کے پاس اتنی رقم نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنے بھائی سے مانگ لوں گی۔"

لالہ کرم دین اس میٹھی مار سے تلملا اُٹھے انہوں نے رعب سے کہا۔ "اجی ہٹو۔ ایک ہزار روپے کے لئے بھائی سے بھیک مانگو گی؟ مجھ سے ہی لے لینا۔"

"مگر مجھے اسی زندگی میں چاہئیں!"

"ابھی اسی ہفتے لے لینا۔"

"ہفتے سے آپ کا مطلب سات دن سے ہے یا سات سال سے؟"

لالہ کریم دین نے کھڑے ہو کر بڑے رعب سے کہا "آج سے ساتویں دن مجھ سے ایک ہزار روپے لے لینا۔"

لیکن جب چار دن گزر گئے اور روپوں کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تو لالہ کرم دین کو فکر ہونے لگی۔ آن کا سوال تھا۔ اپنے ہی گھر میں اپنی ساکھ کا مسئلہ تھا۔ رقم دینے کا پکا وعدہ کر کے اگر اب نہ دے سکے تو ان کی بیوی دل میں کیا سوچے گی؟ اُس کی نظروں میں ان کی کیا وقعت رہ جائے گی؟ اپنی دلیری کی کتنی ہی کہانیاں وہ اپنی بیوی کو سُنا چکے تھے اب جو ایک کام آپڑا تو چاروں شانے چت ہو گئے۔ پہلی بار ان کی بیوی نے کچھ رُوپوں کا سوال کیا تھا۔ اِس وقت اگر۔۔ وہ دُم دبا کر بھاگ جائیں تو اُسے کیا مُنہ دکھائیں گے؟

ایک دن اور گزر گیا۔ پانچویں دن گھبرا کر لالہ کرم دین نے اپنے دوست معراج دین کو اپنا دکھڑا سنایا تقدیر کچھ ایسی کھوٹی تھی کہ معراج دین بھی خالی ہاتھ تھے۔ انہوں نے کہا "میرے پاس ہیں تو نہیں، مگر کسی سے مانگ کر لانے کی کوشش کروں گا۔ اور اگر مل گئے تو کل شام کو تم سے مکان پر ملوں گا۔"

وہی شام آج تھی۔ کل ایک ہزار روپے یا تو گن دینے ہیں یا ساری ہیکڑی سے ہاتھ دھو لینے ہیں۔ یہ سچ تھا کہ کل روپے نہ ملنے پر اُس کی بیوی اُسے سولی پر نہیں چڑھا دے گی صرف ذرا سا ہنس دے گی مگر وہ کیسی ہنسی ہوگی؟ اس ہنسی کے تصور سے ہی لالہ کرم دین کی رُوح کانپ جاتی تھی۔

ابھی تک معراج دین نہیں آیا تھا۔ آج شام کو اس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اب ان ہی کا بھروسہ تھا۔ اگر وہ نہ آئے تو؟ اگر وہ رُوپوں کا بندوبست نہ کر سکے تو؟ اسی اُدھیڑ بُن میں لالہ کرم دین چھت پر ٹہل رہے تھے کہ انہیں پیاس لگی۔ انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر نہیں تھا۔ خود ان کی بیوی پانی لے کر آئی۔ وہ پانی تو ضرور لائی مگر گلاس لانا بھول گئی۔ صرف پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور لوٹا بھی وہ، جو اپنی بے ڈھنگی وضع کے باعث لالہ کرم دین کو سخت ناپسند تھا۔

لالہ کرم دین نے کچھ کہے بغیر لوٹا لے لیا۔ بیوی کا وہ خاص الحاظ کرتے تھے۔ اس لئے غصّہ تھوک کر پانی پینے لگے۔ اس وقت وہ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے تھے۔

جن لوگوں نے پانی پینے سے متعلق یہ اصول بنائے تھے کہ کھڑے کھڑے پانی نہ پیو۔ سوتے وقت پانی نہ پیو۔ دوڑنے کے بعد پانی نہ پیو۔ انہوں نے پتہ نہیں کبھی یہ اصول بھی بنایا تھا یا نہیں کہ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر پانی نہ پیو مگر خیال یہی کہتا ہے کہ شاید انہوں نے اس اہم ترین موضوع پر رائے ظاہر نہیں

کی تھی۔ اس لئے لالہ کریم دین نے کوئی برائی نہیں کی، اگر وہ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر پانی پینے لگے مشکل سے دو ایک گھونٹ انہوں نے پیے ہوں گے کہ نہ جانے کیسے ان کا ہاتھ ہل گیا اور لوٹا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

لالہ کرم دین کا لوٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ انارکلی جیسے بازار میں تین منزلہ مکان سے لوٹے کا گرنا دل لگی نہیں ہے۔ نہ جانے کس بچارے کی کھوپڑی پر گرے اور اُسے دوسری دنیا میں پہنچا دے۔..... کچھ ایسا ہی ہُوا۔ بازار میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لالہ کرم دین جب تک دوڑ کر نیچے اُترے، اُس وقت تک لوگوں کی بھیڑ اُن کے آنگن میں گھس آئی تھی۔

نیچے اُتر کر لالہ کرم دین نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں ایک انگریز بھی شامل ہے، جو سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا ہے اور جو اپنے ایک پاؤں کو ہاتھ سے سہلاتا ہوا دوسرے پاؤں پر ناچ رہا ہے۔ اُس کے پاس قصوروار لوٹے کو دیکھ کر لالہ کرم دین کی سمجھ میں سارا ماجرا آ گیا۔ ہُوا یہ تھا کہ گلی میں گرنے سے پہلے لوٹا دکان کے سائبان سے ٹکرایا اور دکان پر کھڑے ہوئے اس انگریز کو سر سے پاؤں تک نہلا دیا اور پھر اسی کے بُوٹ پر جا گرا۔

اُس انگریز کو جب معلوم ہوا کہ لالہ کرم دین ہی اس لوٹے کے مالک ہیں تو اس نے انگریزی میں گالیوں کا فوّارہ چھوڑ دیا۔ لالہ کرم دین کو اس روز ہی معلوم ہوا کہ انگریزی زبان میں بھی گالیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسی وقت مجمع کو ہٹاتے ہوئے معراج دین آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اس انگریز کو چھوڑ کر اور جتنے بھی آدمی آنگن میں گھس آئے تھے، سب کو نکال باہر کیا۔ پھر کرسی آنگن میں رکھ کر اس نے انگریز سے کہا۔ "آپ کے پاؤں میں شاید کچھ چوٹ آئی ہے۔ آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیے۔"

انگریز معراج دین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا اور لالہ جی کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ "آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

"بالکل نہیں اور میں ایسے آدمی کو جاننا بھی نہیں چاہتا جو بے گناہ اور معصوم راہ گیروں پر لوٹے سے وار کرے۔ میرے خیال میں یہ خطرناک پاگل ہے یا خطرناک مجرم۔" اگر خدا نے لالہ کرم دین کی آنکھوں کو اس وقت دیکھنے کے ساتھ ساتھ کھا جانے کی بھی طاقت عطا کی ہوتی تو وہ یقیناً معراج دین کو اب تک کھا چکا ہوتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معراج دین کو کیا ہو گیا ہے۔

انگریز نے معراج دین سے پوچھا۔ "تو اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"پولیس میں اِس معاملے کی رپورٹ کرا دیجئے تاکہ اس آدمی کو گرفتار کرلیا جائے۔"

"پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟"

"قریب ہی، چلیئے میں بتاتا ہوں"

"چلیئے"۔ انگریز اُٹھنے لگا۔

"ابھی چلتا ہوں، مگر چلنے سے پہلے آپ کی اجازت ہو تو یہ لوٹا اس آدمی سے خرید لوں۔ کیوں جی بیچو گے؟ میں دو سو روپے تک اس لوٹے کے دے سکتا ہوں۔"

لالا کرم دین تو خاموش رہا مگر انگریز نے پوچھا: "اس ردّی لوٹے کے آپ دو سو روپے کیوں دے رہے ہیں؟"

"آپ اس لوٹے کو ردّی سمجھتے ہیں؟ تعجب ہے۔ میں تو آپ کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سمجھا تھا۔"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ بتایئے بھی؟"

"جناب، یہ ایک تاریخی لوٹا معلوم ہوتا ہے۔ معلوم کیا ہوتا ہے مجھے پورا یقین ہے، یہ مشہور اکبری لوٹا ہے جس کی تلاش میں تمام دنیا کے میوزیم سرگرداں ہیں۔"

"یہ بات ہے"! انگریز بولا۔

"جی ہاں جناب۔ سولہویں صدی کی بات ہے۔ بادشاہ ہمایوں، شیر شاہ سے ہار کر بھاگا تھا تو سندھ کے صحرا میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ایک موقع پر پیاس سے اس کی جان نکل رہی تھی کہ اس وقت ایک برہمن نے اسی لوٹے سے پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔ ہمایوں کے بعد جب اکبر بادشاہ بنا تو اس نے اس برہمن کا پتہ لگا کر اس سے یہ لوٹا لے لیا اور اس کے بدلے میں اُسے اسی نمونے کے دس سونے کے لوٹے دیئے۔ شاید یہ لوٹا شہنشاہ اکبر کو بے حد عزیز تھا، اسی لئے اس کا نام "اکبری لوٹا" پڑا۔ وہ ہمیشہ اسی سے وضو کرتے تھے ۱۸۵۷ء تک یہ لوٹا شاہی گھرانے میں رہا مگر اس کے بعد لاپتہ ہو گیا۔ کلکتہ کے میوزیم میں اس کا ماڈل رکھا ہوا ہے۔ پتہ نہیں یہ لوٹا اس آدمی کے پاس کیسے آیا؟ میوزیم والوں کو اگر اس کا علم ہو جائے تو بھاری رقم دے کر اسے خرید لے جائیں۔"

لوٹے سے متعلق اتنی حیران کُن تفصیل سُن کر انگریز ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ خود اس لوٹے کو حاصل کرنے کے لئے تڑپ اُٹھا۔ اس نے معراج دین سے دریافت کیا۔ "تو آپ اس لوٹے کا کیا کریں گے؟"

"مجھے پُرانی اور تاریخی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔" معراج دین بولا۔

فراسٹ
مزہ خود بتاتا ہے
فراسٹ
میں فروٹ زیادہ ہے

Interflow-APL-100

یہ ایک خوش نصیب گھوڑا ہے ۔ یہ اسکول نہیں جاتا ہے ۔ لکھنے پڑھنے سے اِسے کوئی دلچسپی نہیں پھر بھی اِسے سب پسند کرتے ہیں اور کوئی اسے بُرا نہیں کہتا ۔ ہم روزانہ اسکول جاتے ہیں، گھر پہ ہوم ورک بھی کرتے ہیں لیکن کسی نہ کسی بہانے ہمیں روزانہ ڈانٹ پڑتی ہے ۔ گھوڑوں کو ڈانٹ نہیں پڑتی ۔ اس لیے کبھی کبھی ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم گھوڑے ہوتے ۔!

یہ صحیح ہے کہ ہم گھوڑے نہیں انسان ہیں، لیکن ہم میں چند خوبیاں ایسی ہیں جو گھوڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً ہم گھوڑے کی طرح خوب تیز دوڑ سکتے ہیں ۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ گھوڑا چار ٹانگوں کی مدد سے بھاگتا ہے اور ہمارے پاس کُل دو ٹانگیں ہیں ۔ بقیہ دو ٹانگیں نہ ہونے کے سلسلے میں ہم بالکل بے قصور ہیں ۔ گھوڑا گھاس کھاتا ہے ۔ ہمارے بارے میں بھی گھر والوں کو اکثر شبہ سا ہو جاتا ہے کہ شاید ہم بھی گھاس ہی کھاتے ہیں ۔ گھوڑا اپنے مالک کا کہا مانتا ہے ۔ ہم بھی اپنے والدین کا اپنے اساتذہ کا ہر حکم بجا لاتے ہیں، چونکہ حکم عدولی کی صورت میں ہمیں مُرغا بنا دیا جاتا ہے ۔ اس لیے ہم اسی میں مصلحت دیکھتے ہیں کہ مُرغا بننے سے بہتر ہے کہ گھوڑے کی طرح فرمانبردار رہا جائے ۔

گھوڑا ایک مفید جانور ہے ۔ لیکن جب اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے تو یہ بہت زیادہ مفید نہیں رہتا، کیونکہ پھر یہ پولو کھیلنے کے قابل نہیں رہتا ۔ ہماری ٹانگ ٹوٹ جائے تو ڈاکٹر اسے جوڑ دیتے ہیں، گھوڑے کی ٹانگ کو ڈاکٹر نہیں جوڑ سکتے ۔ اس لیے کہ جب وہ قریب جاتے ہیں تو گھوڑا لات مار دیتا ہے ۔ ایسے میں گھوڑے کی ٹانگ اچھا

اِتنے سارے پھلوں کا
تازہ نِکھرا روپ
احمد
مِکسڈ فروٹ جام
TASTE AHMED PRESERVES
AHMED'S
JAM
MIXEDFRUIT

"مجھے بھی پُرانی اور تاریخی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ جس وقت یہ لوٹا میرے اُوپر گرا تھا۔ اس وقت بھی میں اس دُکان سے پیتل کی کچھ پُرانی چیزیں خرید رہا تھا۔" انگریز نے کہا۔

"مگر صاحب یہ لوٹا تو میں ہی خریدوں گا" معراج دین بولا۔

"واہ۔ آپ کیسے خریدیں گے۔؟ اسے میں خریدوں گا۔ یہ میرا حق ہے۔" انگریز بولا۔

"حق ہے؟ کیسے حق ہے؟" معراج دین کی آواز بلند ہوگئی۔

"پورا حق ہے۔ یہ بتایئے کہ اس لوٹے نے آپ کے پیروں کو زخمی کیا یا میرے؟ اس نے میرے انگوٹھے کا بھرتا بنایا ہے، آپ کے انگوٹھے کا نہیں۔ اس لوٹے کے پانی سے میں نے غسل کیا ہے، آپ نے نہیں۔ اس لئے اسے میں خریدوں گا یہ حق میرا ہے، صرف میرا۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دام لگایئے۔ جو زیادہ دے گا، وہ لوٹا لے جائے۔" معراج دین نے تجویز پیش کی۔

"یہی سہی۔ آپ اس کے دو سو روپے لگا رہے تھے، میں تین سو روپے دیتا ہوں۔"

"میں پانچ سو دیتا ہوں۔" معراج دین نے جوش سے کہا۔

"میں سات سو دیتا ہوں۔" انگریز اس سے بھی زیادہ خروش سے بولا۔

"ابھی میں ایک ہزار روپے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر معراج دین نے ایک ہزار کے نوٹ لالہ کرم دین کے آگے پھینک دیئے۔

انگریز کو بھی اب تاؤ آگیا۔ اس نے کہا۔ "آپ دس سو دیتے ہیں تو میں پندرہ سو روپے دیتا ہوں۔" معراج دین افسوس بھرے انداز میں اس طرح اپنے روپے اُٹھانے لگا، جیسے اپنے ارمانوں کی لاش اٹھا رہا ہو۔ اور پھر انگریز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "لوٹا آپ کا ہوا۔ لے جایئے میرے پاس ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔" یہ سننا تھا کہ انگریز کے چہرے پر خوشی ناچنے لگی۔ اس نے جھپٹ کر لوٹا لیا اور بولا "اب میں خوشی اور فخر سے اپنے دیس لوٹوں گا۔ میجر ڈگلس کی ڈینگ سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے تھے۔"

"میجر ڈگلس کون ہے؟" معراج دین نے پوچھا۔

"میجر ڈگلس میرے پڑوسی ہیں۔ پُرانی اور تاریخی چیزیں جمع کرنے میں میری اور ان کی دوڑ لگی رہتی ہے۔ پچھلے سال پاکستان آئے تھے۔ اور یہاں سے جہانگیری انڈا لے کر گئے تھے۔"

"جہانگیری انڈا؟"

"جی ہاں، جہانگیری انڈا۔ میجر ڈگلس نے سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان سے بس وہی اچھی اور نادر اشیاء

لے جا سکتے ہیں۔"

"مگر جہانگیری انڈا ہے کیا بلا؟" معراج دین نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"آپ جانتے ہوں گے کہ ایک کبوتر نورجہاں اور جہانگیر میں محبّت پیدا کرنے کا وسیلہ بنا تھا۔ جہانگیر کے پوچھنے پر کہ کبوتر تم نے کس طرح اڑایا؟۔ نورجہاں نے دوسرے کبوتر کو اڑا کر بتایا کہ ایسے۔ اُس کے اِس بھولپن پر جہانگیر بے ساختہ واہ واہ پکار اُٹھا۔ کبوتر کا احسان وہ کبھی نہیں بھُولا۔ اس کے ایک انڈے کو اس نے بڑے جتن سے رکھ چھوڑا۔ ایک بلوّر کی ہانڈی میں وہ اس کے رُوبرُو ٹنگا رہتا تھا۔ بعد میں وہی انڈا جہانگیری انڈے کے نام سے مشہور ہُوا۔ اسی کو میجر ڈگلس نے پچھلے سال بھاٹی سے ایک کبوتر باز سے دو ہزار میں خریدا۔ مگر اب میجر ڈگلس میرے آگے ڈینگ نہیں مار سکے گا۔ کیونکہ میرا اکبری لوٹا اس کے جہانگیری انڈے سے بھی ایک پُشت پُرانا ہے۔"

"اس رشتے سے تو آپ کا لوٹا اس انڈے کا باپ ہوا۔" معراج دین نے انگریز سے کہا۔

انگریز نے لالہ کرم دین کو پندرہ سو روپے دے کر اپنی راہ لی۔ لالہ کرم دین کا چہرہ اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے معراج دین سے پوچھا۔ "یہ ایک ہزار روپے تم میرے لئے کہاں سے لے کر آئے تھے؟"

معراج دین نے کہا۔ "جہاں سے بھی لے کر آیا، لے تو آیا۔" یہ کہہ کر معراج دین چل پڑا۔

"مگر آپ چلے کہاں؟ ابھی تو مجھے آپ سے دو گھنٹے تک کام ہے" لالہ کرم دین نے کہا۔

"دو گھنٹے تک؟"

"ہاں اور کیا؟ ابھی میں آپ کی پیٹھ ٹھونک کر شاباش دُوں گا۔ ایک گھنٹہ اس میں لگے گا۔ پھر گرم جوشی سے بغلگیر ہو کر آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔ ایک گھنٹہ اس میں لگ جائے گا۔"

"اچھا پہلے پندرہ سو روپے اٹھا کر رکھ لیجئے۔ اب میں چلتا ہوں۔ باقی باتیں پھر کبھی ہوں گی۔"

اُس رات کافی دیر تک لالہ کرم دین کو نیند نہ آئی۔ وہ چادر لپیٹ کر چارپائی پر لیٹے رہے۔ رات ایک بجے وہ اُٹھے۔ بڑی احتیاط سے اپنی سوئی ہوئی بیوی کے گلے سے چابی نکالی۔ پھر اس کے کمرے میں جا کر چابی سے صندوق کھولا۔ اس میں ایک ہزار روپے رکھ کر اس کو بند کیا اور دبے پاؤں لوٹ کر چابی کو دوبارہ اپنی بیوی کے گلے میں ڈال دیا۔

"اکبری لوٹا!" انھوں نے ہنستے ہوئے زیرِ لب دُہرایا۔ ایک اطمینان بھری انگڑائی لی۔ اور سو گئے۔

☆☆☆

جگنو بمقابلہ ویسٹ انڈیز

علی ذوالقرنین جگنو

بچّو! ہر عظیم کھلاڑی کی طرح، ہمارا بھی بچپن گزرا ہے۔ خُدا جھوٹ نہ بلوائے پانچ مہینے دو دن تین گھنٹے پچیس منٹ تیس سیکنڈ کی عمر سے ہی ہم نے کرکٹ کھیلنے کا آغاز کر دیا تھا۔ نو سال کی عمر کو پہنچے تو اس کھیل میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ ہمارے کھیل کی شہرت اپنے محلّے، شہر اور مُلک کی حدود سے نکلتی ہوئی ساری دنیا میں سورج کی روشنی کی طرح پھیل گئی اور دنیا بھر سے لوگ ہمارا کھیل دیکھنے کے لیے ٹیچر کالونی

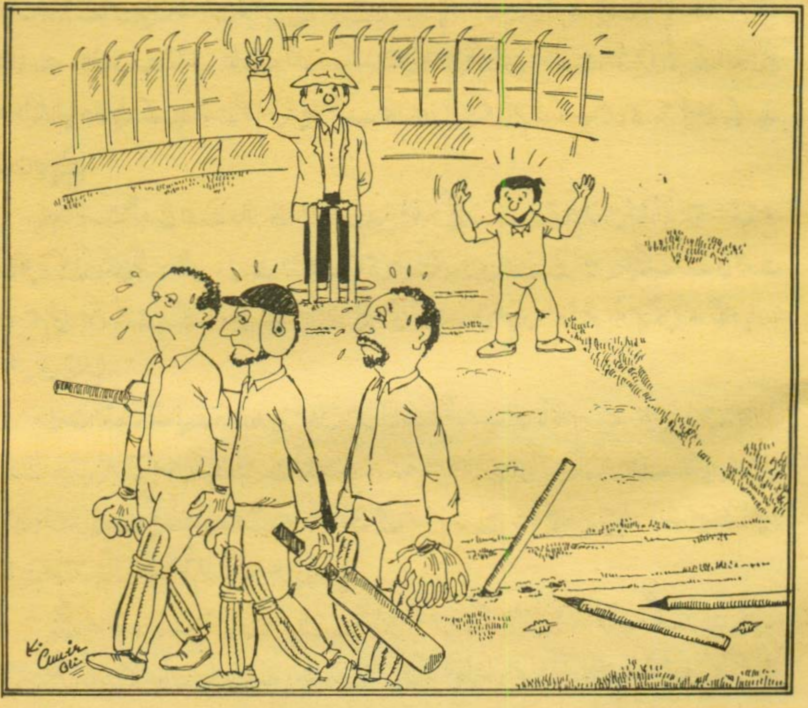

نامی محلّے میں آنے لگے۔ ٹیچر کالونی میں ہمارے ہاتھوں روزانہ دنیائے کرکٹ کا کوئی نہ کوئی ریکارڈ ضرور ٹوٹ جاتا تھا۔ یا پھر قائم ہو جاتا۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی ہمیں اتنے آٹوگراف دینے پڑتے کہ رات کو نیم گرم پانی میں چٹکی بھر نمک ڈال کر انگلیوں کی سکائی کرنا پڑتی۔

اِدھر ہم ٹیچر کالونی کی گلیوں میں کرکٹ کے یہ گُل کھلا رہے تھے، اُدھر ویسٹ انڈیز کے دورے کے لیے قومی ٹیم کے انتخاب کا عمل جاری تھا۔ لوگوں کا خیال تھا۔ اس انتہائی مشکل دورے کے لیے ٹیم کی کپتانی کا بار خاکسار کے کاندھوں پر ہی ڈالا جائے گا۔

دورے کے لیے ٹیم کا اعلان ہوا تو پوری دنیا حیرت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔ کیونکہ پوری ٹیم کے طور پر صرف ہمارے نام کا اعلان کیا گیا تھا۔ جیسے ہی ہماری ایک رُکنی ٹیم کا اعلان ہوا، ویسٹ انڈیز کے کرکٹ کنٹرول بورڈ نے یہ کہہ کر سیریز کھیلنے سے انکار کر دیا کہ ایک رُکنی ٹیم سے سیریز کھیلنا بے معنی سی بات ہے۔ ویسٹ انڈیز کے بورڈ نے اپنے بیان میں طنزاً یہ بھی کہا کہ کیا اتنے بڑے مُلک میں صرف ایک ہی کھلاڑی ہے۔ پاکستانی کرکٹ بورڈ نے اس بیان کا سخت نوٹس لیتے ہوئے جواب دیا کہ ایک پوری ٹیم کے لیے ہمارا ایک کھلاڑی ہی کافی ہے۔ ہمت ہے تو آپ ہمارے اس واحد کھلاڑی کا مقابلہ کر لیں۔ ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ مقابلے کے لیے لندن کا اسٹیڈیم منتخب ہوا۔ اور ہم پوری ٹیم کے رُوپ میں سیریز کھیلنے کے لیے لندن جا پہنچے۔

پہلا ٹیسٹ شروع ہونے والا تھا۔ اس انوکھے میچ کو دیکھنے کے لیے تمام لندن اُمڈ آیا تھا۔ اسٹیڈیم میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ ویسٹ انڈیز نے ٹاس جیت کر بڑی شان سے ہمیں بیٹنگ کرنے کی دعوت دی۔ ہم تیّار ہو کر وکٹ پر گئے اور جم گئے۔ ہر گیند اپنی مرضی کے مطابق کھیلی۔ موڈ ہوا تو چھکّا چوکا لگا دیا ورنہ سنگل ہی بنا لیا۔

ویسٹ انڈیز نے اپنے تمام بولرز میدان میں اتارے مگر سب ہی ناکام رہے۔ ہمیں آؤٹ نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ جب ہم نے محسوس کیا کہ ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے تمام کھلاڑی بھاگ بھاگ کر تھک گئے ہیں اور کسی بھی وقت یکے بعد دیگرے بے ہوش ہو کر گر سکتے ہیں تو ہم نے لنچ سے کچھ دیر پہلے آؤٹ ہوئے بغیر سات سو رنز بنا کر اننگز ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

لنچ کے بعد ویسٹ انڈیز کی ٹیم میدان میں اُتری۔ اُس کے کھلاڑی بڑے خوفزدہ لگ رہے تھے۔ تاہم بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہم نے ۷۰۰ رنز بنا کر اُن کو کھیلنے کی دعوت دے کر بیوقوفی کی ہے۔ کیونکہ

ان کے خیال میں بولنگ کے ساتھ فیلڈنگ بھی کرنا ایک ناممکن کام تھا۔ مگر ہم نے مُسکراتے ہوئے بولنگ شروع کی اور ہر گیند پر ایک بیٹسمین کو پویلین بھیجنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ٹیم دس گیندوں پر آؤٹ ہوگئی۔ ہماری اس غیر معمولی کارکردگی سے دنیائے کرکٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ برطانیہ کے وزیرِاعظم تک یہ میچ دیکھنے تشریف لائے تھے۔ اور ہر گیند پر کھلاڑی کو آؤٹ ہوتا دیکھ کر حیرت سے انگلیاں منہ میں دبائے بیٹھے رہے۔ دوسرے تماشائی مارے حیرت کے اپنی سیٹوں سے کھڑا ہونا بھول گئے تھے۔

ویسٹ انڈیز کے کوچ کو اپنی ٹیم کی کارکردگی پر شرم آئی تو بولے "میاں جگنو! ایک گیند پر ایک کھلاڑی آؤٹ کرنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کارنامہ تو تب ہوگا، جب ایک گیند پر دو دو وکٹیں لے کر دکھاؤ۔"

ہم بھلا کوئی معمولی کھلاڑی تو تھے نہیں۔ بس آگئے مُوڈ میں پھر کیا تھا ویسٹ انڈیز کے دو نامور کھلاڑی ویوین رچرڈ اور رچرڈسن فیلڈ میں آئے اور وکٹ سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔ اِدھر ہم نے گیند سنبھال کر بولنگ نشان کا رُخ کیا۔ اس کے بعد کرکٹ کے شائقین نے دیکھا کہ ہم نے طوفانی انداز میں اسٹارٹ لیا۔ دوڑے اور مقرّرہ جگہ پہنچ کر عجیب و غریب انداز میں ہاتھ گھماتے ہوئے گیند کرائی۔ گیند کسی توپ کے گولے کی طرح دندناتی ہوئی سامنے کی وکٹ سے ٹکرا کر ہمارے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ ایمپائر نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھادیے۔ جس کا مطلب تھا کہ دونوں کھلاڑی آؤٹ ہوگئے ہیں۔

ہمارے اس کارنامے پر سارے تماشائی پندرہ منٹ تک کھڑے ہوکر تالیاں بجاتے رہے۔ مگر وہاں کے کوچ نے ہار نہ مانی اور ہم سے بولا "جگنو میاں اگر تم ایک گیند پر تین وکٹیں لے کر دکھاؤ تو میں تم کو ویسٹ انڈیز کے شہری حقوق دلوادوں گا۔"

ہمارے لیے یہ کون سی بڑی بات تھی۔ فوراً تیار ہوگئے۔ کوچ صاحب نے بہترین کھلاڑی میدان میں بھجوادیے۔ ہم نے پہلے کی طرح طوفانی اسٹارٹ لیا اور مقرّرہ جگہ پر آکر گیند پھینک دی۔ گیند ہمارے ہاتھ سے اس طرح نکلی، جیسے بندوق سے گولی! اور دو وکٹوں کو گراتی اُس طرف پلٹی جہاں پہلی وکٹ گرنے پر تیسرا کھلاڑی آکھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بڑے ماہرانہ انداز میں گیند کو کھیلا اور اپنے خیال میں چوکا لگا بیٹھا مگر بچّو ہم بھلا کیسے چوکا لگنے دیتے فوراً لپکے اور گیند کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی کیچ کرلیا۔ واپس پلٹے تو ایمپائر تینوں کے آؤٹ ہوجانے کا اشارہ کررہا تھا۔

اچھا بچّو اب اجازت دو، انشاءاللہ اگلے قہقہہ نمبر میں پھر ملاقات ہوگی !! ☆☆☆

آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے

نمبر ۱ ۔ اصلی شکل

نمبر ۲ ۔ نقلی شکل

ہر انسان کو کچھ نہ کچھ بنانے کا شوق ہوتا ہے ۔ کوئی پیسہ بناتا ہے تو کوئی گھر اور کوئی بے وقوف ۔ یہ صاحب منہ بناتے ہیں اور منہ بھی درجنوں اقسام کے ، تصویر نمبر ۱ ۔ ان صاحب کی اصلی صورت ہے ۔ جبکہ تصویر نمبر ۲ ۔ ان کی بگڑی ہوئی صورت کی ہے ۔ ذرا سوچئے ان صاحب نے کتنی مشکلوں سے اپنے موٹے موٹے لبوں ، پچکی ہوئی ناک ، باہر نکلی ہوئی آنکھوں ، اور ماتھے پر اُبھری ہوئی لکیروں کو غائب کر کے ہنستی مُسکراتی شکل بنائی ہوگی ۔

کیا کیا بنیں گے ہم؟

الف، خ، دل

ابّو کو ہے اُمید کہ افسر بنیں گے ہم
امّی تو سوچتی ہیں منسٹر بنیں گے ہم

اِک اِک کو ہم کلاس میں مُرغا بنائیں گے
اپنے کلاس کے جو مونیٹر بنیں گے ہم

ٹیچر سے پٹ کے آئے تو ابّو نے دی سزا
کس کس کے اور پاؤں کی ٹھوکر بنیں گے ہم

اتنی سی جان اور ستم اس پہ اِس قدر
کیوں آگے چل کے پھر نہ ستمگر بنیں گے ہم؟

دینی ہے ہم کو جو بھی ابھی دیجئے سزا
پھر دیکھئے گا جب کوئی افسر بنیں گے ہم

کیا فرق ہے جو فیل ہوئے امتحان میں
ماضی نہیں بنے ہیں تو فیوچر بنیں گے ہم

انجینئرنگ تو پاس کریں گے یہاں مگر
جا کر سعودیہ میں پلمبر بنیں گے ہم

سروس نہ مل سکے گی تو ٹیوشن پڑھائیں گے
انگلش کے اور حساب کے ٹیوٹر بنیں گے ہم

دھوکا فریب جھوٹ وغا سب روا جہاں
ایسی جگہ پہ جا کے پلیڈر بنیں گے ہم

دِل اس میں کوئی قید تو تعلیم کی نہیں
پڑھ لکھ نہیں سکیں گے تو لیڈر بنیں گے ہم

۳۵ سوال

انور مقصود سے

چند سال پہلے ٹیلی وژن پر ایک پروگرام "ففٹی ففٹی" شروع ہُوا۔ اس کے لکھنے والے انور مقصود تھے۔ یہ پروگرام اور انور مقصود ایک ساتھ مشہور ہوئے اور مشہور ہوتے چلے گئے۔ خاکے، اسٹیج شو، ڈرامے، انور مقصود نے سبھی کچھ لکھا اور جو لکھا مقبول ہو کے رہا۔ اب انور مقصود کا نام ٹیلی وژن کے کسی بھی پروگرام کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ انھیں اسکرین پر دیکھ کر لوگ ہنسنے لگتے ہیں۔ حالانکہ کسی کو دیکھ کر ہنسنا بُری بات ہے، لیکن اس سے یہ بھی تو پتہ چلتا ہے کہ انور مقصود بحیثیت مزاح نگار کتنے مقبول ہیں۔

انور مقصود کو بچوں سے محبت ہے۔ بچوں کو بھی یقیناً ان سے اُنسیت ہو گی۔ اس لیے "آنکھ مچولی" نے ان سے چند سوالات پوچھے اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں نہایت دلچسپ جوابات دیے۔ ملاحظہ ہو!

○ آپ کیوں پیدا ہوئے؟

مجھے آنکھ مچولی میں جوابات دینا تھے۔

- آپ کی پیدائش سے کیا کیا اور کس کس کو نقصانات ہوئے ؟

پیدائش کے وقت میں بہت چھوٹا تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں کس کس کو نقصان پہنچا۔

- کیا پیدائش کے وقت بھی آپ کے بال سفید تھے ؟

پیدائش کے وقت صرف میں سفید تھا۔

- آپ بوڑھے کیسے ہوں گے ؟

جب تک تحریر میں دَم ہے، ہم بوڑھے نہیں ہوں گے ۔

- اپنی تحریروں کے عوض آپ نے معاشرے سے کیا لیا ؟

معاشرے سے کچھ لیا نہیں بلکہ معاشرے کو بہت آٹوگراف دیے۔

- اپنے اسکول سے آپ کی سب سے بڑی شکایت ؟

ہمارا دو پہر کا تھا لڑکیوں کا صبح والا ۔

- آج کل کے اسکولوں پر آپ کا سب سے بڑا اعتراض ؟

ہمیں تو صرف ایک اعتراض ہے "الف" کیوں نکال دیا۔

- کس مضمون سے آپ کو چڑ تھی ؟

شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جس سے چڑ نہ ہو ۔

- ایک امتحان کو عام طور پر کتنے مرحلوں میں پاس کیا ؟

ساتھ بیٹھنے والا اگر ذہین نکلا تو ایک مرحلے میں بھی بہت سے امتحان پاس کر لیے ۔

- گندے بچے آپ کو کیسے لگتے ہیں ؟

کوئی بچہ گندہ نہیں ہوتا ، نہا دھو کر سب ایک سے لگتے ہیں ۔

- بڑی عمر کے بچوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

بڑی عمر کے بچے غور سے دیکھو تو چھوٹے نکلتے ہیں ۔

- بچپن کے ناپسندیدہ ترین مصنّف یا شاعر ؟

جس شاعر یا مصنّف پر ہوم ورک دیا جاتا تھا وہ ناپسندیدہ ہو جاتا تھا۔

- وہ واقعہ جس پر آپ کی پٹائی ہونی چاہیئے تھی اور نہیں ہوئی ؟

ایک مرتبہ سیکنڈ آئے تھے مگر سیاہی سے سیکنڈ کے درمیان جگہ بھر کر بہت موٹا فرسٹ

بنا دیا تھا اور تحفے میں کرکٹ کا بلّا لے لیا تھا ۔

- بچوں پر پیار کب آتا ہے اور یہ کب بُرے لگتے ہیں ؟

بچّے جب تیار ہوکر اسکول جاتے ہیں اس وقت بہت پیار آتا ہے ۔ بچّے مجھے کبھی بُرے نہیں لگتے ۔

- وہ دن جب آپ کو اسکول نہ جانے پر پچھتاوا ہُوا؟

ایک دن گھر پر اسکول سے زیادہ ڈانٹ پڑی تھی ۔

- پہلی تحریر کب اور کیوں لکھی ؟

پہلی تحریر والدہ کی طرف سے کلاس ٹیچر کو لکھی تھی کہ انور بیمار ہیں، دو دن اسکول نہیں آئیں گے۔

- لکھنے اور ٹی وی پر آنے کے علاوہ پسندیدہ مشغلہ ؟

یہ دونوں مشغلے نہیں ہیں ، مجبوریاں ہیں ۔

- لکھنا ، پڑھنا اور سوچنا ۔۔۔ اہمیّت کے لحاظ سے ترتیب دیجئے ؟

سوچنا ، پڑھنا ، لکھنا ۔

- کس بات پہ جھنجھلا جاتے ہیں ؟

جب کوئی بڑا کسی بچّے کی شکایت کرتا ہے ۔

- آپ کی زندگی کے دو یادگار دن ؟

میری بیٹی اور بیٹے کا اسکول میں داخلہ لینا ۔

- بچّوں کے لیے کیوں نہیں لکھتے ؟

ہمارے یہاں کے بڑے بچّوں سے بہت چھوٹے ہیں ۔ اس لیے ان کا حق پہلے بنتا ہے ۔

- اپنے بچّوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں ۔ ؟

والدین کا فرض بچّوں کی دیکھ بھال ہے ، پڑھنے لکھنے کے بعد جو اُن کی مرضی وہ ہماری مرضی ۔

- کس قسم کے لوگوں کی صحبت سے آپ بچتے ہیں ؟

اگر انسان خود ٹھیک ہے تو پھر کوئی بھی صحبت ہو کچھ فرق نہیں پڑتا ۔

- پھول ، چاند ، تتلی ، کرن اور بچّے ۔۔۔ ان میں سے کسی ایک کو چُننے کے لیے کہا جائے تو آپ کسے چُنیں گے ؟

بچّے ۔۔۔کیونکہ ان میں ہی مجھ کو پھول، چاند، تتلی اور کرنیں نظر آتی ہیں ۔

- مشہور ہوکر کیسا لگتا ہے ؟

جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے ۔ اچّھا لگتا ہے ۔

- اب گمنامی کے بارے میں کیا رائے ہے ؟

آج کل صرف ایک ہی دُعا مانگ رہا ہوں اور وہ ہے گمنامی ۔

- آپ کی تین پسندیدہ شخصیتیں ؟

رسول اللہؐ ، حضرت بلالؓ ، میری والدہ ۔

- مطالعے کو کتنا وقت دیتے ہیں ؟

مطالعے کو جو بھی وقت دیا جائے وہ کم ہے ، پڑھتے رہنا چاہیئے ۔

- کوئی ایسی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو ؟

اتنی بڑی خواہش ہی نہیں کی ۔

- اپنے لطیفے پر ہنسنے میں خود پہل کیوں کرتے ہیں ؟

سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو جانتا ہوں ، اگر ہنسی میں پہل کی جائے تو کسی کو نقصان نہیں پہنچتا ۔

- کوئی ایسی کتاب جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہوں ؟

دیوانِ غالب ۔

- کوئی ایسی بات جسے آپ بار بار سوچتے ہوں ؟

میرے وطن میں پڑھنے والے بچّے بڑے ہوکر کیا بنیں گے ؟

- بچپن کی یادگار حماقت ؟

ایک مرتبہ اونچی دیوار سے کُودنا چاہ رہا تھا مگر ڈر گیا، اگر نہیں ڈرتا تو (۳۵) سوالوں کے جوابوں سے بچ جاتا ۔

- بچّوں کے نام کوئی ایسا پیغام جو آپ نہ دینا چاہیں ؟

بچّوں کے لیے میرے پاس ویسے بھی کوئی پیغام نہیں ہے ۔صرف دعائیں ہیں ، اللہ تمھیں خوش رکھے ، پڑھو ، لکھو ، ماں باپ کا خیال رکھّو ، استادوں کی عزّت کرو ۔اپنے سے کم حیثیت والے کو خود سے بڑا جانو ۔

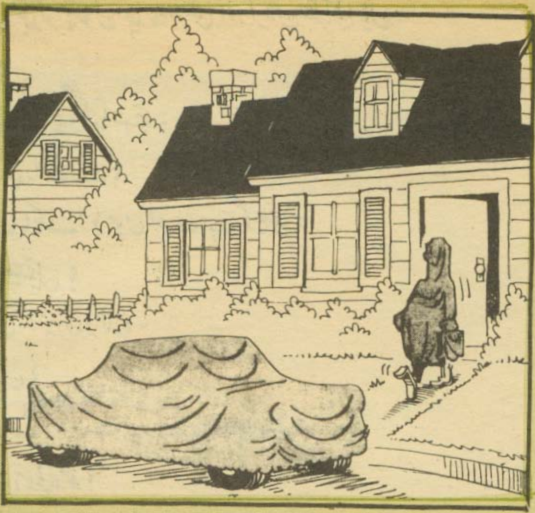

فرق بتائیں

یہ دونوں تصاویر ایک ہی مصوّر کی بنائی ہوئی ہیں۔ لیکن ایک تصویر بنا کر مصوّر صاحب چونکہ بہت تھک گئے تھے اِس لیے دوسری تصویر بنانے میں اُن سے کچھ غلطیاں ہوگئیں جس کے باعث اِن دونوں تصاویر میں کچھ فرق واقع ہوگئے۔ کیا آپ اُن کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟

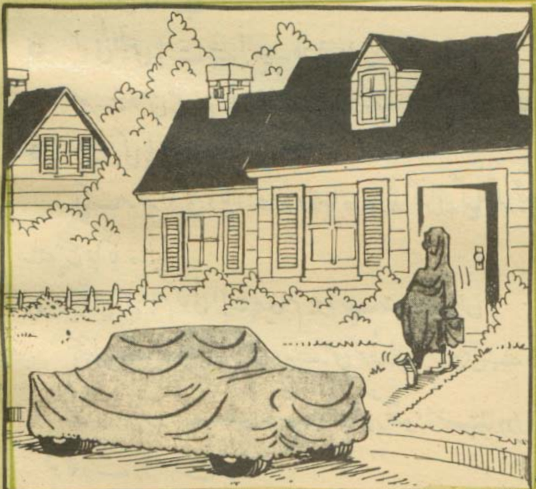

جواب صفحہ ۸۲ پر دیکھیے

ابنِ شہباز خان

ملنا ہمارا بندر سے

"اُونہوں اس کا تو موڈ ہی کچھ صحیح نہیں لگتا۔ یہ بھلا ہمارے سوالوں کے کیا جواب دے گا!" ہم نے چڑیا گھر کے منتظم سے کہا تو اُس کا منہ بن گیا۔

"آپ کو کس قسم کا بندر چاہیئے، صاحب! آخر آپ بندروں سے چاہتے کیا ہیں؟" وہ شاید مکمّل طور پہ جھلّا گیا تھا۔

"ارے بھئی، ہم نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا کہ کسی معقول اور شریف سے بندر سے ملوادو، اس کا انٹرویو کرنا ہے۔ یہی بات ابھی تمھارے صاحب آفس میں بھی تمھیں سمجھا رہے تھے، مگر لگتا ہے، تمھاری کھوپڑی بندروں

کے ساتھ رہتے رہتے کچھ ہٹ گئی ہے، اپنی جگہ سے !" ہم نے چشمہ ناک پر درست کرتے ہوئے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کیا۔ مگر وہ منتظم، نام جس کا شمشاد انوکھا تھا، ہمارے اس شگفتہ جملے کی تاب نہ لاسکا اور ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

"کیا مطلب ہے، صاحب آپ کا! کیا میں پاگل ہوں، چڑیا ہوں؟ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ نہ جانے اس نے ہم سے سوال کیا تھا یا ہماری بات کی تصدیق کی تھی، یہ ہم سمجھ نہ سکے!

"ارے بھئی، یہ ہم نے کب کہا۔ ایک تو تم غلط باتوں کا صحیح مطلب بہت نکالتے ہو! ---ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ---!" اس سے آگے ہم کچھ نہ کہہ سکے۔ ہماری نظریں اُس پر جمی رہ گئیں۔ ہم گفتگو کرتے ہوئے چل بھی رہے تھے اور ایک ایسے پنجرے کے سامنے جا پہنچے تھے، جس میں ہمارے مطلب کا بندر موجود تھا۔

"صاحب! آپ ہی کا کوئی بھائی بند لگتا ہے!" شمشاد انوکھا اس بندر کی تھوتھنی پر موجود بچوں کی چھوٹی سی عینک دیکھ کر بولا۔ اور ہی ہی کرنے لگا۔

"چُپ، نامعقول! ڈارون کی تھیوری کے مطابق یہ انسانوں ہی کے خاندان میں سے ہے۔ لہٰذا اس رُو سے ممکن ہے، یہ تمھارا بھتیجا ہو!" ہم اُس بندر پر نظریں جمائے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"بس صاحب! اب میں مزید یہاں نہیں رُک سکتا۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ آپ تو ان بندروں سے میرا خون کا رشتہ ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں!" شمشاد انوکھا ایک بار پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ اور تیز تیز قدموں سے لوٹ گیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور دوبارہ اس "شریف آدمی" کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ اپنے مختصر سے چہرے پر مضبوطی سے عینک جمائے سلاخوں کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا سوچوں میں گم نظر آرہا تھا۔ سرسری نظر میں وہ ایک ایسا فلسفی معلوم ہوتا تھا، جو یہ سوچ رہا ہو کہ اُس کی دُم کیوں ہے؟

"سلاما لیکم بھائی صاحب ---مم ---میرا مطلب ہے، ڈارون کے بھائی جان!" ہم سلاخوں کے قریب جاتے ہوئے خیر سگالی کے انداز میں بولے۔ ہمارے سلام کے جواب میں اُس نے آہستہ سے چہرہ اُوپر کیا۔ عینک کے پیچھے سے ہمیں گھورا اور بڑی بے نیازی سے اثبات میں سر ہلا کر دوبارہ غرق ہو گیا غالباً اسی "مسئلۂ دُم" میں۔

"عرض یہ ہے جناب! کہ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں!" ہم کچھ گھبراتے ہوئے بولے۔ کیونکہ اُس کی سنجیدگی دیکھ کر ہمیں خوف آنے لگا تھا۔

"تم انسانوں کے پاس سوائے باتیں کرنے کے کوئی اور کام بھی ہے۔" وہ عینک کو اپنے بوتھے سے نوچ کر دُور پھینکتا ہوا بولا۔ اور ایک دم کھڑا ہو کر سلاخوں کو پکڑ کے خوخیانے لگا۔ ہم ڈر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"میں کوئی آپ سے سیاسی گفتگو کرنے تھوڑا ہی آیا ہوں۔ میں تو بچوں کے لیے آپ سے کچھ چٹ پٹی اور

مزید ارسی باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔ ہم نے مسکین سے انداز میں وضاحت کی۔
"اچھا اچھا" وہ سر ہلاتے ہوئے یوں بولا، جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ "بچّوں کے لیے۔ بچّے تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں" یہ کہہ کر وہ مُسکرانے لگا۔ مگر ہمیں یوں لگا، جیسے وہ ہمارا منہ چڑا رہا ہو۔۔۔!
"تو کیا میں سوالات کا آغاز کروں" ہم فوراً نوٹ بُک اور قلم سنبھالتے ہوئے بولے۔
"ہاں ہاں، بھئی۔ میں تم انسانوں کی طرح فضول تکلّفات کا قائل نہیں" وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔ اور سلاخوں سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا۔
"سب سے پہلے تو آپ اپنا نام بتائیے"۔
"نام میں کیا رکھا ہے۔ کوئی اور سوال کرو" یہ کہہ کر وہ زور زور سے خوخیایا اور پورے پنجرے میں قلابازیاں کھانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے اُس نے اپنے تئیں ہمیں لاجواب کر دیا تھا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کا "بندر ناچ" ختم ہوا تو وہ دوبارہ سلاخوں کے پاس آ بیٹھا۔
"سر! دراصل، دورانِ گفتگو مجھے آپ کو بار بار مخاطب کرنا پڑے گا، جس کے لیے نام لینا ضروری ہوگا۔ اگر آپ بُرا محسوس نہ کریں تو بتا دیجئے۔ کیا حرج ہے۔ بچّے خوش ہو جائیں گے" ہم نے اُس کی کمزوری بھانپتے ہوئے حربہ آزمایا۔
"بچّے۔۔۔ آہ بچّے!" اُس نے ایک بازو چہرے پر رکھتے ہوئے فلمی ہیرو کے انداز میں کہا اور تُوتھا لٹکا کے بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔
"جی ہاں بچّے!" ہم نے اُسے اُکسایا۔
"بچّے۔۔۔! کِس کے بچّے؟" وہ غائب دماغ پروفیسر کے سے انداز میں بولا۔
"میرا مطلب ہے، جناب! آپ بچّوں کی محبّت میں اپنا نام۔۔۔؟"
"اچھا اچھا۔ میرا نام لارون ہے" اس نے بڑی اُداسی سے بتایا۔
"جی، تو کیا آپ ڈارون کے خاندان۔۔۔"! ہم حیرت سے چیخے، مگر اُس نے ہمیں جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔
"خاموش!" وہ رازدارانہ انداز میں ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر بولا "جانوروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کیا تم نے یہ محاورہ نہیں سُنا؟" اُس نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔
"مگر وہ تو دیواروں کے۔۔۔؟"
"ایک ہی بات ہے۔ ایک تو تم انسانوں کو بات بات میں زبان پکڑنے کی بہت عادت ہوتی ہے" وہ

بُرا سا منہ بنا کر بولا اور اس کا منہ کچھ اور زیادہ لٹکنے لگا۔

"جی ہاں، بجا فرمایا آپ نے!" ہم شرمندگی سے سر جُھکاتے ہوئے انکساری سے بولے اور وہ ایک بار پھر یہاں سے وہاں قلابازیاں کھانے اور غوخیانے لگا۔

"سر! آپ کی دُم ہِل رہی ہے۔" اس کے شور پر ہماری چیختی ہوئی آواز حاوی ہو گئی۔ ہماری بات سُن کر وہ تیزی سے اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اب کے وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ دُم ہم سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"لارون صاحب! کیا آپ پڑھے لکھے ہیں؟" ہم نے اگلا سوال کیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ اس کا ثبوت وہ عینک ہے۔ جس طرح تم انسانوں میں جو عینک لگائے ہوتا ہے لوگ اُسے لازمی پڑھا لکھا سمجھتے ہیں، چاہے اس نے کبھی کسی کتاب کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔" اس نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

"لارون صاحب! آپ طنز بہت کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟"

"تم انسان لوگ میرے پاس زیادہ آنے لگے ہو، شاید اس لیے!" یہ کہہ کر اُس نے جماہی لی اور قریب ہی پڑا ہوا کیلا اُٹھا کر بڑی نفاست سے چھیلا اور تیزی سے کھانے لگا۔

"اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو۔ یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کو اکثر گلیوں میں ڈگڈگی پر ناچتے اور کرتب دکھاتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اس کے متعلق کیا کہتے ہیں آپ؟"

"یہ بھی تم انسانوں کا ہی کارنامہ ہے۔ اچھے بھلے جنگلوں میں آزاد پھرتے بندروں کو پکڑ کر اور گلے میں رسّی ڈال کے ڈگڈگی پر نچانے لگ جاتے ہو یا انھیں پنجروں میں بند کر کے اُن کا تماشا بناتے ہو۔" لارون کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ہم خاموش ہی رہے اور اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

"لیکن ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سُن لو۔ ڈگڈگی پر ہم محض بچّوں کی خاطر ناچتے اور کرتب دکھاتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔ چاہے وہ ہمارے ہوں یا تم انسانوں کے!" وہ ہماری طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا اور پھر اپنے جسم کے مختلف حصّوں سے جوئیں نکال نکال کے منہ میں ڈالنے لگا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" ہم احتجاج کرنے والے انداز میں بولے۔

"خاموش! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا تو ہم نے تقریر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، جو اُس کی اس حرکت کو دیکھ کر ہم تیار کرنے لگے تھے۔

"اچھا یہ بتائیے، آپ کو یہاں آنے والے لوگوں سے کوئی شکایت ہے؟" ہم نے ماحول کو بدلنے کی خاطر

پوچھا اور شاید یہ سوال کرنا ہماری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ یہ سوال سُنتے ہی اُس نے پورے پنجرے میں اِدھر اُدھر چھلانگیں لگا کر اور قلابازیاں کھا کر اور خوخیا خوخیا کر سارے چڑیا گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔

"مَیں سمجھ گیا سر! خدا کے لیے یہ بندروں والی حرکتیں ختم کیجئے اور میری بات سُنیے۔ آپ تو ثابت کر رہے ہیں کہ آپ واقعی بندر ہیں!" ہمارے اس جُملے نے جادوئی اثر کیا اور وہ "بندر نامہ" ختم کر کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"اچھا اب بندروں کے متعلق کچھ معلومات تو فراہم کیجئے؟" ہم نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔

"کس قسم کی معلومات...؟ کیا تم بندروں کو اپنے یہاں ملازمت دینا چاہتے ہو؟" وہ ہمیں گھور کر بولا۔

"نہیں جناب! میرا مطلب بندروں کی تاریخ اور عام معلومات سے تھا۔"

"اچھا اچھا" اس نے سر ہلایا، لپک کے عینک اُٹھائی اور اپنے چہرے پر اس طرح لگائی کہ سیدھے کان والی کمانی تو اپنی جگہ پر تھی جبکہ بائیں کان والی نیچے ٹھوڑی پر جا رہی تھی۔ "ہاں تو سنو... بندر ایسا جانور ہے، جو انسان اور گوریلا کے زُمرے میں آتا ہے۔ انسان بندر سے پیدا نہیں ہُوا۔ اس راز سے آج میں پردہ اُٹھا رہا ہوں۔ البتہ لاکھوں برس پہلے غالبًا انسان بہت کچھ بندر سے مشابہ تھے۔ ویسے مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم کیونکہ میں اس واقعے کے بہت بعد میں پیدا ہوا۔"

"شکر ہے، آپ بوڑھے نہیں ہیں۔ ویسے آپ کی عُمر کیا ہے؟" ہم نے درمیان میں دخل دیا۔

"اب یہ بات بتانے والی تو نہیں، نا!" وہ اپنی دُم مروڑتا ہُوا بولا۔

"اچھا امریکہ کے بندر کیسے ہوتے ہیں؟" ہم نے اس کی عُمر کے متعلق زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"وہاں کے سینیٹرز سے بہتر ہی ہوتے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور چاروں ہاتھ پیروں پر چلتا ہوا کچھ آگے پڑا ایک مالٹا اُٹھا لایا اور ایک جگہ دانتوں سے چھلکا ہٹا کر وہاں سے ایک ٹکڑا توڑ کے کھانے لگا۔

"بندروں کی قسموں کے متعلق کچھ بتائیے؟" ہم نے اُسے کُریدا۔

"انسانوں کی طرح بندروں کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔ انسانوں کی تو خیر دُم ہوتی ہی نہیں ہے لیکن بندروں میں کچھ ایسے ہیں، جن کے دُم یا تو ہوتی ہی نہیں ہے یا اگر ہوتی ہے تو بہت مختصر سی ہوتی ہے۔ اس قسم کو "بندر بے دُم" کہا جاتا ہے۔ ان کا جسم قریب قریب سیدھا انسان کی طرح ہوتا ہے اور لمبے بازو ہوتے ہیں۔ کیوں کچھ تسلی ہوئی؟" اس نے آدھ کھائے مالٹے کو سونگھا اور بڑی تیزی سے ہماری طرف پھینکا، مگر ہم ڈاج دے کر اپنا سر بچا گئے۔

"بندر کہیں کا!" ہم زیرِ لب بڑبڑائے اور پھر اونچی آواز میں بولے۔ "اچھا یہ بتائیے، سب سے زیادہ

بندر کہاں پائے جاتے ہیں ؟

"ہندوستان، یعنی بھارت میں!" وہ عینک اُتار کر زمین پہ پٹختا ہوا بولا۔

"درست کہا آپ نے۔ وہاں تو واقعی بندروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" ہم ہنستے ہوئے بولے۔

"بس اب میں چلتا ہوں۔ تم نے بہت کچھ پوچھ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

"ارے سُنیے تو لارون صاحب! بس دو باتیں اور ہیں!" ہم خوشامدی انداز میں بولے۔

"ایک تو تم انسان خوشامد بہت کرتے ہو۔" وہ بُرا ماننے والے انداز میں بولا۔ اور پلٹ آیا۔

"یہ عینک آپ کو کہاں سے ملی؟" ہم نے نیچے پڑی عینک کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک ننھے سے، پیارے سے، شرارتی بچّے نے مجھے تحفتاً دی تھی۔ لگانے کا طریقہ میں نے خود ہی سیکھا!" اس نے فخریہ بتایا اور نیم دائرے میں گھومنے کے بعد اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

"یہاں کے منتظمین سے کوئی شکایت؟" ہم نے سوال تو کر دیا، مگر ساتھ ہی خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے بھی لگے۔ کیونکہ پہلے بھی لفظ شکایت پر اُس نے اتنا اودھم مچایا تھا کہ خود ہمیں اس سے شکایت ہونے لگی تھی۔

"یہ تم دیکھ ہی رہے ہو، میرے کمرے کی حالت، کتنا گندا ہو رہا ہے۔ ہفتوں اس کی صفائی نہیں ہوتی۔"

"آپ کی شکایت انتظامیہ تک پہنچا دی جائے گی۔ یہ بتائیے، آپ اکثر کیا سوچتے ہیں؟" ہمیں اس کا ابتدائی فلسفیانہ انداز یاد آ گیا۔

"یہی کہ اب انسانوں نے سوچنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔" وہ تاؤ دلانے والے انداز میں بولا اور بتیسی نکالنے لگا۔

"بڑے بدتمیز ہیں آپ تو!" ہم غصّے سے بولے۔

"تو جاؤ، نہیں دیتا میں تمھارے سوالوں کے جواب!" وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا اور ہماری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"پیارے لارون! مان جاؤ... اچھا، بچّوں کے نام، آپ کا کوئی پیغام؟" یہ سُنتے ہی وہ فوراً ہماری طرف گھوم گیا۔

"بچّوں کے نام!" وہ بڑے جوش اور مسرّت سے بولا۔ ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بچّوں سے میں یہی کہوں گا کہ وہ کبھی کبھار مجھ سے ملنے ضرور آیا کریں۔ انھیں دیکھ کر میں بہت خوش

ہوتا ہوں۔ اور یہ کہ سُنا ہے، بچّے ٹی وی اور وی سی آر بہت دیکھتے ہیں اور وڈیو گیم بھی بہت کھیلتے ہیں۔ میں دوست کی حیثیت سے اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ بے شک ٹی وی بھی دیکھیں اور وی سی آر بھی اور وڈیو گیم بھی کھیلیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی شوق اور محنت سے کریں۔ کیوں کہ آپ انسانوں کا ہی کہنا ہے کہ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیل کے وقت کھیل، مگر آپ انسان ہی اپنی کہی ہوئی بات پر عمل نہیں کرتے۔ کتنے افسوس کی بات ہے!" ہم نے دیکھا کہ یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ جنھیں شاید چھپانے کے لیے وہ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تمھارا بہت بہت شکریہ لارون! تم سے بڑی اچھی اور مفید گفتگو ہوئی۔ خدا حافظ!" ہم نے زور سے کہا۔ مگر وہ بدستور پیٹھ موڑے خاموش کھڑا رہا۔ البتّہ اُس نے دایاں ہاتھ اُٹھا کر ہلایا۔ یقیناً وہ بھی ہمیں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

اشتہار

"کہاں جا رہے ہو دین محمد؟"

"چاچا اسکول جا رہا ہوں۔"

"کون سے اسکول؟"

"بس ہے ایک!"

"تمھیں کیا معلوم، میں تمھیں بتاتا ہوں۔ اچھا اسکول وہ ہے جہاں فیس زیادہ ہو۔ تعلیم کم ہو۔ بچّوں کے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ ہو، بستے کا وزن پورے پندرہ کلو ہو۔"

"چاچا پرائیویٹ انگلش اسکول کی بات کر رہے ہو نا؟"

"ہاں ہاں"

"وہیں تو جا رہا ہوں۔"

ملاٹ جاوید اقبال

PID (Islamabad) manhattan International

احمد حاطب صدیقی

ٹنکو میاں نے نانی اے ہے کی مدد کی

ڈِنکو میاں بھی... بس کیا بتائیں... ایک عجیب ہی تماشا تھے!

اِن کا نام تو اُن کے داداجان نے مرزا اظہر خانِ خاناں رکھا تھا مگر جتنا لمبا چوڑا اور بھاری بھرکم اُن کا نام تھا خود اُتنے ہی چُھٹنے مُنّے سے تھے، اسی لیے محلّہ بھر میں "ٹِنکو میاں" کے نام سے مشہور تھے۔

گول گول آنکھیں ہر وقت شرارت سے ناچتی رہتی تھیں۔ چہرے پر ہر وقت معصومیت اور ایک مُسکراہٹ سی طاری رہتی۔ اُن کو جاننے والے تو اُن کی رگ رگ سے واقف تھے، لیکن جو لوگ انھیں اچھی طرح جانتے نہیں تھے وہ یہی سمجھتے تھے کہ ٹِنکو میاں بھی ویسے ہی سیدھے سادے اور بھولے بھالے ہیں جیسے دوسرے بچّے ہوتے ہیں۔

اللہ جانے کس حکیم نے ان کو یہ مشورہ دے دیا تھا کہ:

"اسکاؤٹ بن جاؤ، صحت کے لیے بہت مفید ہے!"

اس ننھی سی جان کو اسکول والے اسکاؤٹ تو بنا نہیں سکتے تھے۔ آفت مچانے اور ضدّم ضِدّا کرنے پر ان کو "کب"

بنالیا گیا۔ کیوں کہ ان کی عمر کُل ۱۱ رسال تھی اور ۱۲ رسال سے کم عُمر کے بچّے اسکاؤٹ نہیں بن سکتے وہ "کب" کہلاتے ہیں۔

"کب" بن جانے کے بعد ان کی صحت کو تو کیا فائدہ پہنچتا، اس قدر گولُو مٹولُو تھے کہ صحت کو مزید فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی تو کسی غبارے کی طرح دھماکے سے پھٹ جاتے، البتّہ خود ضعیفوں اور کمزوروں ہی کے لیے نہیں، اچھے خاصے صحت مند افراد کے لیے بھی ایک مستقل خطرہ بن گئے تھے۔

کب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اسکاؤٹ ہی کہتے تھے۔

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اسکاؤٹ بچّے نیکی کے کام کرتے ہیں اور روزانہ کم از کم کوئی ایک نیک کام ضرور کرتے ہیں۔ انتہائی تیز طرّار ہونے اور شرارتوں میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھنے کی وجہ سے اپنے دوسرے کب ساتھیوں کے خود بخود سردار بن گئے تھے۔ وہ بچارے بھی ان کی سرداری کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اور تسلیم نہ کرتے تو کیا کرتے، ان کو اپنے ہاتھ پیر تھوڑا ہی تڑوانے تھے۔

ایک روز اپنے ساتھیوں کو لے کر اسکاؤٹ ماسٹر صاحب کے پاس گئے، اور ان سے پوچھا۔

"سر! اسکاؤٹ لوگ نیکی کے کام کیسے کرتے ہیں؟"

ماسٹر صاحب انھیں دیکھ کر مُسکرائے۔ پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگے،

"دوسروں کی مدد کرتے ہیں... مثلاً اگر محلّہ میں کسی کے گھر میں بڑے بچّے نہیں ہیں تو اس کا سودا سلف لا دیا... کوئی بیمار ہے تو ڈاکٹر صاحب کو بُلا لائے، اور ان کی دوائیں لا دیں۔۔ سڑک کے کنارے اگر کوئی بوڑھا شخص کھڑا ہے تو ہاتھ پکڑ کر اُسے سڑک پار کرادی۔ مطلب یہ کہ جو کام تم آسانی سے دوسروں کی مدد کے لیے کر سکو، وہ کر لو!"

یہ باتیں سُن کر وہ سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے، جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں، چلے آئے۔ اگلے روز اسکاؤٹ ماسٹر صاحب کو ان کی ٹولی پھر نظر آئی، انھوں نے آواز دے کر بلایا، تاکہ ان سے پوچھیں کہ انھوں نے نیکی کا کوئی کام کیا بھی یا نہیں!

نیکی کا کام تو انھوں نے کیا تھا، لیکن جو نیکی فرمائی، اُس سے آپ بھی واقف ہوں گے، کیونکہ اب تو یہ قصّہ پورے پاکستان میں ایک لطیفے کی طرح مشہور ہو چکا ہے۔

جب یہ لوگ دوڑتے ہوئے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے، تو انھوں نے مُسکرا کر ان سے پوچھا:

"آپ میں سے کسی نے نیکی کا کوئی کام کیا؟"

"جی ہاں! سر!" ان سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"شاباش!" ماسٹر صاحب خوش ہو گئے اور پوچھا "آپ لوگ باری باری بتائیں کہ کیا نیک کام کیا؟"

"سر! ہم چاروں نے ایک بڑھیا کو سڑک پار کرائی" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

"چاروں نے ؟!!" ماسٹر صاحب حیرت سے بولے "چاروں نے کس طرح سڑک پار کرائی؟"

"سر ہم نے بوڑھی اماں کو اٹھا کر سڑک پار کرائی تھی" چاروں نے پھر ایک ساتھ جواب دیا۔

"اوہ! اچھا، اچھا، تو کیا وہ بڑی بی چلنے پھرنے سے معذور تھیں ۔؟ پھر تو تم لوگوں نے بہت اچھا کیا!"

ماسٹر صاحب شاباش دینے لگے تو ٹنکو میاں نے ہچکچاتے کچھ کچھ ہکلاتے ہوئے کہا کہ،

"سر! اصل میں وہ بڑی بی سڑک پار کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں، لیکن ہمیں تو نیکی کرنی تھی، ہم نے ان کی پرواہ کیے بغیر ان کو پکڑ کر اٹھایا اور سڑک پار کرادی!"

"ہائیں ؟!!" ماسٹر صاحب اچانک غصّہ میں لال پیلے ہو گئے۔

ماسٹر صاحب نے پہلے تو انھیں مرغا بنایا، پھر ایک ایک بید رسید کر کے انھیں اس "نیکی" کا "انعام" عطا فرمایا۔

جب ان کا غصّہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو انھوں نے بچّوں کو پھر سمجھایا کہ:

"کوئی چاہے یا نہ چاہے، اُسے پکڑ کر زبردستی سڑک پار کروا دینا، نیکی نہیں ہے، سڑک پار کروانا اُس وقت نیکی کہلائے گا۔ جب کوئی ضعیف یا معذور شخص خود سڑک پار کرنا چاہتا ہو۔ آئندہ اس طرح زبردستی کی نیکی مت کرنا"

پہلی ہی نیکی ٹنکو میاں اینڈ کمپنی کے اس طرح گلے پڑ گئی تو وہ محتاط ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی بس اسٹاپ پر کوئی بڑی بی، یا بڑے میاں خود بھی ان سے کہتے کہ:

"اے بیٹا! ذرا مجھے سڑک پار کرا دو!"

تو یہ چار کے چاروں پہلے باقاعدہ ان کا انٹرویو لیتے :
" کیا آپ سچ مُچ سڑک پار کرنا چاہتے ہیں ؟"
" ہاں بیٹا! مجھے سڑک کے اُس پار ڈاکٹر کے یہاں جانا ہے!"
"جناب سچ سچ بتائیے، آپ اپنی مرضی سے سڑک پار کرنا چاہتے ہیں نا؟"
" ارے تو کیا میں جھوٹ بولوں گا' لڑکے تمھارا دماغ تو صحیح ہے "
" تو ہم آپ کو سڑک پار کرا دیں ؟ سچّی ؟!! مذاق تو نہیں کر رہے ؟"
اور اتنے میں بڑے میاں آپے سے باہر ہو کر اور اپنی لاٹھی کھینچ کر ان کو مارنے کو دوڑتے کہ ،
" دیکھو ! یہ ذرا ذرا سے چھوکرے میرا مذاق اُڑا رہے ہیں' ان کے ماسٹروں نے یہی سکھایا ہے ؟ اماں ابا نے یہی تربیت کی ہے ؟ ٹھہرو تو سہی ابھی نکالتا ہوں تمھارا مذاق!"
اور یہ وَن ... ٹو ... تھری کے بغیر وہاں سے ریس شروع کر دینے پر مجبور ہو جاتے ۔ اگر اتفاق سے کوئی ہنس مکھ بزرگوار ان کے انٹرویو کو ان کا بھولپن اور معصومیت سمجھ کر ان باتوں پر مُسکراتے ہوئے سڑک پار کرنے پر تیار بھی ہو جاتے تو یہ بیچ سڑک میں پہنچ کر وہیں رُک جاتے' اور اُن سے ایک بار پھر کہتے کہ
"اب بھی سوچ لیجیے' آپ سچ مچ سڑک پار کرنا چاہتے ہیں یا ہم آپ کو واپس وہیں لے چلیں ؟"
اس پر تو ان بڑے میاں کو ایسا تاؤ آتا کہ وہ جھنجھلا کر ان مسخروں کو وہیں دھکا دیتے ہوئے تیز رفتار گاڑیوں اور اپنے انجام کی پرواہ کیے بغیر اکیلے سڑک کے دوسرے کنارے کی طرف دوڑ لگا دیتے ۔
ان کو بھی آتی ہوئی گاڑیوں سے بچنے کے لیے مختلف سمتوں میں بھاگنا پڑتا ۔
اب ٹنکو میاں نے سوچا کہ سڑک پار کروانا تو بڑی خطرناک قسم کی نیکی ہے ۔
حالانکہ ایسی بات نہیں ۔ خطرناک حرکتیں تو وہ خود ہی کرتے تھے ۔ اگر سلیقہ سے کام لیتے تو یوں اپنی نیکیاں برباد کرنے کے بجائے لوگوں کی دعائیں لیتے ۔
ہاں تو اب انھوں نے یہ سوچا کہ محلّے والوں کے ساتھ نیکیاں کرنی چاہئیں ۔
چھٹّی کا دن تھا ۔ صبح سویرے انھوں نے یونیفارم پہنا اور نکل کھڑے ہوئے ۔ سب سے پہلے خالہ خوش مزاج کے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا ۔ خالہ خوش مزاج کے یہاں کوئی بچّہ نہیں تھا ۔ لیکن محلّے بھر کے بچّوں سے وہ بڑی خوش مزاجی سے پیش آتی تھیں ۔ اسی وجہ سے ان کا یہ نام پڑ گیا ۔
خالہ نے دروازہ کھولا اور ٹنکو میاں کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رہ گئیں ۔

"یا الٰہی خیر! کہو ٹنکو میاں کیسے آئے، امّی نے بھیجا ہے؟"

"جی نہیں، خالہ جان میں آپ کی مدد کرنے کے لیے آیا ہوں!"

خالہ نے غور سے ان کو اور ان کے یونیفارم کو دیکھا۔ ٹنکو میاں کو بھلا خالہ نہ جانتیں! وہ تو اُن سے اچھی طرح واقف تھیں۔ بہت سنجیدہ سا منہ بنا کر کہنے لگیں کہ:

"بہت بہت شکریہ! ٹنکو میاں! میں اس وقت بہت مصروف ہوں اور میرے پاس تم سے اپنی مدد کروانے کی فرصت نہیں ہے۔ خدا حافظ"

یہ کہہ کر خالہ نے دروازہ بند کر لیا۔

ٹنکو میاں نے بُرا سا منہ بنایا اور "ہُنھ" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

پروفیسر اوقیانوس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب جغرافیہ کے ماہر تھے۔ ان کا اصل نام تو شائد ہی کسی کو یاد ہو، سب ان کو پروفیسر اوقیانوس کہتے تھے، ان کے گھر میں بچّے تو کیا کوئی بھی نہیں رہتا تھا وہ اکیلے ہی تھے۔ کھلا ہوا دروازہ دیکھ کر ٹنکو میاں گھر میں داخل ہو گئے، حالانکہ یہ کوئی نیکی نہیں، بلکہ بہت بُری بات ہے، کسی کے گھر میں بغیر پوچھے داخل نہیں ہونا چاہیئے۔

پروفیسر صاحب اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں ایک اسٹول پر چڑھے ہوئے تھے۔ اور اپنی کتابوں کی الماری کے سب سے اوپر والے خانے سے پُرانی پُرانی کتابیں نکال کر اُن کی گرد جھاڑ رہے تھے۔

ٹنکو میاں کے آنے کی انھیں خبر بھی نہ ہوئی اور وہ اُسی طرح اپنے کام میں مصروف رہے۔ ٹنکو میاں پہلے تو چپ چاپ کھڑے ان کو دیکھتے رہے پھر اچانک اپنی سیٹی جیسی آواز میں بولے:

"پروفیسر صاحب! کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

پروفیسر صاحب بے چارے اچانک ایک غیر متوقع آواز سن کر ڈگمگا سے گئے۔ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں جو پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ٹنکو میاں کی شکل پر نظر پڑی بدحواسی میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور اپنے اسٹول سمیت اڑاڑا دھڑام ٹنکو میاں کے قریب ہی ڈھے گئے۔

ٹنکو میاں نے جو یہ منظر دیکھا تو پروفیسر صاحب کے جواب کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اُلٹے قدموں وہاں سے دوڑ لگا دی۔

اگلے ہی کونے پر نانی "اے ہے" کا گھر تھا۔ نانی اپنا ہر جملہ "اے ہے" سے شروع کرتی تھیں، اسی وجہ سے ہر کوئی ان کو "نانی اے ہے" کہتا تھا۔ ان کے گھر میں بھی ان کے علاوہ کوئی نہیں رہتا تھا۔ ٹنکو میاں نے نانی کے گھر کا دروازہ

بند پاکر اُس پر دستک دی۔ دروازہ کھُلا اور نانی سَر پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے، ہاتھ میں جھاڑو لیے نظر آئیں۔ ٹنکو میاں پہلے تو انھیں دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں نانی اپنی مدد سے پہلے ہی ان جھاڑو سے مرمّت نہ شروع کر دیں۔ لیکن جب نانی اس کو دیکھ کر مسکرائیں تو ان کی ہمّت بڑھی اور انھوں نے کہا کہ:

"نانی اماں! آپ کو کوئی کام تو نہیں؟ میں آپ کی مدد کرنے کے لیے آیا ہوں۔" نانی اماں یہ سُن کر خوش ہوگئیں اور ٹنکو میاں کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔

"اُے ہے، کتنا اچھا بچّہ ہے ٹنکو، جا میرے لال ذرا دوڑ کر دکان سے ایک درجن انڈے اور مکھن کی ایک بڑی ٹکیا لے آ۔ یہ لے پیسے!"

ٹنکو میاں کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ چلو کوئی تو نیکی کا کام ملا۔ وہ دوڑتے ہوئے بیکری تک گئے۔ اور دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں انڈوں کا تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں مکھن کی ٹکیہ تھی۔ اسی طرح دوڑتے ہوئے وہ "نانی اُے ہے" کے گھر میں بھی گھُس گئے۔ مگر انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ نانی اپنے گھر کا فرش دھونے میں مصروف تھیں، اُن کا جوتا گیلے اور چکنے فرش پر پھسلا اور انھوں نے سَرکس کے مسخروں کی طرح ایک شاندار قلابازی کھائی، سر نیچے، پاؤں اوپر، انڈے ان کے ہاتھوں سے چھُوٹ کر پہلے تو اُڑتے ہوئے چھت تک گئے پھر واپس نیچے آئے تو عین "نانی اُے ہے" کے سر پر گر کر پھُوٹ بہے۔

"نانی اُے ہے" نے سَر پر ہاتھ پھیرا تو اُن کا ہاتھ انڈوں کی زردی اور سفیدی میں لتھڑ گیا۔ وہ بے چاری بس، "اُے ہے... اُے ہے..." کر کے رہ گئیں۔ ٹنکو میاں نے زمین پر سے مکھن کی ٹکیا اُٹھا کر کرسی پر رکھی اور اپنی کمر سہلاتے ہوئے بولے کہ،

"خدا کا شکر ہے کہ مکھن نہیں ٹوٹا!"

مگر نانی اُے ہے، یہ بات سُن کر ذرا بھی خوش نہیں ہوئیں۔ خفا ہو کر بولیں،

"اُے ہے لڑکے کیسی بے وقوفی کی بات کر رہا ہے، کہیں مکھن بھی ٹوٹتا ہے؟ لیکن اگر مکھن بھی ٹوٹ سکتا ہوتا، تو تُو اس کو بھی توڑ چکا ہوتا۔"

اب ٹنکو میاں نے وہاں سے رفوچکّر ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی کہنے لگے۔

"میں اب جا رہا ہوں۔"

"نانی اُے ہے" بولیں!

"اُے ہے! اب میں تیری مدد کرتی ہوں"

یہ کہہ کر انھوں نے جھاڑو اُٹھایا اور "سَٹ سَٹ" ٹنکو میاں کے پیچھے رسید کر دیا۔ ٹنکو میاں نے دروازے سے چھلانگ لگا دی۔ باہر گلی میں پروفیسر ادقیانوس لمبے لمبے قدم اُٹھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے، ٹنکو میاں اُن کے قدموں میں آگرے۔ پروفیسر ایک بار پھر اس بلا کو اپنے قدموں میں دیکھ کر گھبرا گئے اور ٹنکو میاں کے اوپر سے کُود گئے، پھر غرّا کر بولے!

"کیوں میاں لوگوں کے گھروں سے اس طرح نکلتے ہیں؟!!"

اب ٹنکو میاں ان کو کیا بتاتے کہ وہ نکلے نہیں تھے، نکالے گئے تھے۔ وہ تو پروفیسر صاحب کے ہاتھ آنے سے بچنے کے لیے اُٹھ کر سرپٹ اپنے گھر کی طرف دوڑ گئے۔

لیکن آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ٹنکو میاں کی نیکی کا جذبہ پھر بھی سَرد نہیں ہوا۔ انھوں نے اور بھی کارنامے سَرانجام دیے۔ کیا کریں بے چارے تمیز اور سلیقہ سے کام ہی نہیں لے سکتے۔

تکلّف کا خمیازہ

ایک مولوی صاحب اپنے شاگردوں سے ہمیشہ فرماتے رہتے تھے کہ طلبہ کی گفتگو بہت مرصّع و مسجّع یعنی خوبصورت الفاظ کی صورت میں ڈھلی ہونی چاہیئے۔ مولوی صاحب قبلہ فارسی پڑھایا کرتے تھے اور حُقّے کے بے حد شوقین تھے۔ بعض اوقات وہ کلاس روم میں ہی حُقّہ نوش فرمایا کرتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب حُقّہ پی رہے تھے، گرمیوں کا موسم تھا۔ پنکھا چل رہا تھا، حُقّے کی چلم سے ایک شرارہ اُڑا، اور مولوی صاحب کی پگڑی پر جا گرا۔ ایک شاگرد نے اس کی ابتدائی رپورٹ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کی۔

"قبلہ گاہی ایک شرارۂ آتش چلم سے پرواز کر کے دستارِ فضیلت (پگڑی) پر کچھ گستاخیاں کرنے کی منحوس کوشش میں مصروف ہے اگر بروقت اس کی سرکوبی کے لیے اس بے ادب کی ابلیسی کوششوں کو ناکام نہ بنایا گیا تو چند لمحات میں حضورِ والا صفات کی جانِ مبارک کو ایک عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور یہ سانحہ مکمل فارغ البالی۔۔۔" مولوی صاحب ابھی یہیں تک سُن پائے تھے کہ کھوپڑی پر جلن محسوس ہوئی اور انھوں نے پگڑی اُتار کر پھینک دی اور شاگرد کو بڑی مرصّع و مسجّع جھاڑ پھٹکار سے نوازا۔

ملک جاوید اقبال ۔ راولپنڈی

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھئے
غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔
سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ.... مگر
دُودھ تو پیو
قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھّی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنالیجئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔
یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا
اشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

طاہر مسعود

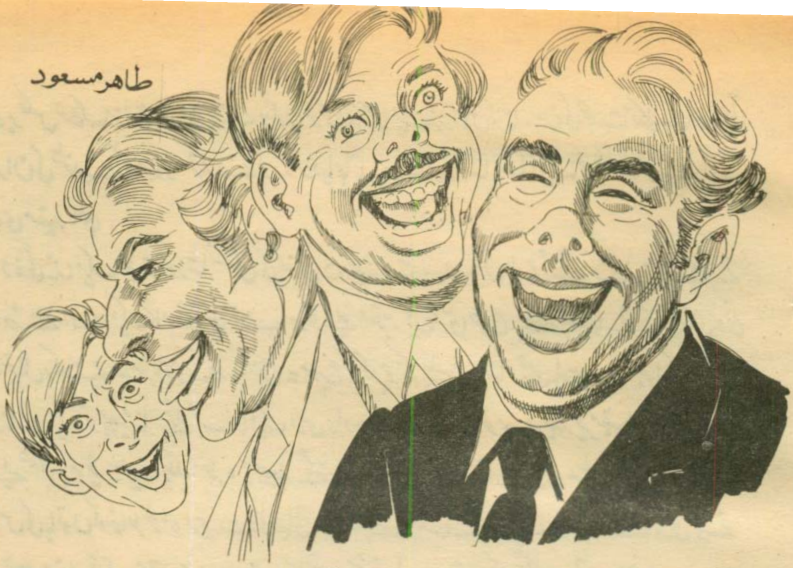

ہنسنا ہنسانا

ہنسی کسے نہیں آتی اور کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اُسے کبھی ہنسی نہیں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ ہنسنے یا قہقہہ لگانے کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس طرح ہنستے ہیں کہ انھیں ہنستے دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ کچھ اس طرح ہنستے ہیں جیسے کسی پر احسان کر رہے ہوں۔ کچھ اس بے تحاشہ طریقے سے ہنستے ہیں جیسے ابھی ابھی لاٹری نکل آئی ہو۔ اور کچھ لوگوں کی ہنسی تو اتنی دلدوز ہوتی ہے کہ سوتے ہوئے بچے اُٹھ کر رونے لگتے ہیں۔ لیکن ہنستے سبھی ہیں، کوئی کم اور کوئی زیادہ۔

ہنسنا ہنسانا انسانی جبلّت ہے۔ اس سے خوشی کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ ماحول خوشگوار ہوتا ہے تعلقات میں گرمجوشی پیدا ہوتی ہے۔ اور بھی دیگر بہت سے فوائد ہیں۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ اگر کسی جگہ پہ چند افراد جمع ہوں، ماحول سنجیدہ ہو، چہروں پہ شگفتگی نہ ہو تو ایک گھٹن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہن بوجھل ہو جاتا ہے۔ اعصاب تھک جاتے ہیں۔ لیکن یہی اصحاب جب آپس میں ہنسنے بولنے لگتے ہیں، فضا میں قہقہے گونجتے ہیں تو ماحول یکایک تبدیل ہو جاتا ہے۔ چہروں کا تناؤ دُور ہو جاتا ہے اور جب محفل برخاست ہوتی ہے تو ہر ایک ہشّاش بشّاش ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہنسی ایک بیش بہا دولت ہے۔

ہنسی انسان کی شخصیت کو پُرکشش بناتی ہے۔ جن ہونٹوں پہ ہر وقت تبسّم کھیلتا ہے۔ وہ چہرے نگاہوں کو بھی بھلے لگتے ہیں۔ ایسے خوش باش لوگ پسند کیے جاتے ہیں اور ان کی کمی ہر جگہ محسوس کی جاتی ہے۔

اس کے برعکس خشک مزاج اور چڑچڑے لوگوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ ان کی صحبت تکلیف دہ ہوتی ہے اور ان کی شخصیت کو "بور" قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے۔ پس ہنسنا ہنسانا ایک خوشگوار عمل ہے اور ساتھ ہی مفید بھی

زندگی میں ایک سلیقہ اور شائستگی کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ جس طرح اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پہننے اوڑھنے اور ہر ایک کام کے کچھ آداب اور طریقے مقرر ہیں اسی طرح ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی موقع محل کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ محض یہ سوچ کر کہ چونکہ ہنستے رہنا اچھی بات ہے۔ ہر ایک سے مذاق کرنا، ہر ایک کو چھیڑنا، جُملے کسنا ایک ایسی عادت ہے جو آدمی کو بہت جلد غیر مقبول بنا دیتی ہے۔ لوگ ایسے شخص کو غیر سنجیدہ بلکہ مسخرہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اسے سنجیدہ محفلوں میں مدعو نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس کی باتوں کو خاطر خواہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ہنسنے ہنسانے اور ایک دوسرے سے مذاق کرنے کے بھی تقاضے اور آداب مقرر ہیں۔ ہر وقت کا ہنسی ٹھٹھول بے وقت کی راگنی ہوتی ہے جس سے نہ صرف ماحول پراگندہ ہوتا ہے۔ بلکہ شخصیت کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔ ان چیزوں کا خیال نہ رکھا جائے تو ہنسی مذاق تعلقات میں گرمجوشی پیدا کرنے کے بجائے تعلقات کو کشیدہ کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

آیئے اب اس پہ غور کریں کہ ہم عموماً کن باتوں پر ہنستے ہیں؟ انسانوں سے چند اعمال اضطراری طور پر ایسے سرزد ہو جاتے ہیں جو بذاتِ خود مضحکہ خیز ہوتے ہیں جس پر ہمیں ہنسی آ جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص چلتے چلتے اچانک کیلے کے چھلکے پر پیر پڑنے سے پھسل کر گر پڑے یا کوئی عجلت میں اُلٹی قمیص پہن کر گھر سے باہر نکل کھڑا ہو۔ کوئی غائب دماغ شخص سر پر ٹوپی پہن کے گھر بھر ٹوپی تلاش کرتا پھرے۔ ان اضطراری باتوں پہ ہنسنا فطری سی بات ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے کہ دوستوں کی محفل میں دوسروں کی خامیوں، کوتاہیوں اور مجبوریوں کو موضوع بنا کر ہنسنے ہنسانے کی فضا گرم کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہنسی اصلاح کا زبردست ذریعہ ہے۔ ہم بہت سے احمقانہ کاموں سے اس لیے بھی بچتے ہیں کہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع نہ ملے، یا ہم اپنی کوتاہیوں کو عین عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ یہ کوتاہیاں اور غلطیاں مذاق کا نشانہ نہ بنائی جا سکیں۔ لیکن دوسروں کی مجبوریوں یا حماقتوں کا اس طرح مذاق اُڑانا کہ اس میں دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو کسی طور بھی مناسب نہیں۔

بہت سے ناسمجھ لوگ دوسروں کے رنگ کا، ان کی شکل و صورت کا، ان کے لباس کا، ان کے کسی جسمانی عیب کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔ نہ صرف ان کی موجودگی میں، بلکہ ان کی غیر موجودگی میں بھی۔ اس سے

زیادہ بُری بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی کی مجبوری پر ہنسنا قدرت کو بھی سخت ناپسند ہے۔ کسی کا رنگ سیاہ ہو یا سفید۔ کسی کی ناک لمبی ہو یا چپٹی، کوئی لنگڑا کر چلتا ہو یا ہکلا کر بولتا ہو۔۔ کسی کو حق نہیں وہ ایسی باتوں پر ہنسے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی ایک سیدھے سادے شخص کو بہت سے لوگ مل کر اُلّو بناتے ہیں۔ اس کی سادگی اور معصومیت پر فقرے کستے ہیں اور اُسے بیوقوف بنا کر اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے ہمالیہ کی چوٹی سر کر لی ہو۔ یہ نہایت غیر شریفانہ بات ہے۔ تعلیم ہمیں تہذیب و شائستگی کا درس دیتی ہے۔ یہ ہمیں احترامِ آدمیت سکھاتی ہے۔ کسی کی توہین و تضحیک سے خوش ہونا، بیمار ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تعلیم نے تہذیب نہیں سکھائی بلکہ شخصیت کو اور مسخ کر کے رکھ دیا۔

اکثر نوجوان بڑے بوڑھوں سے بھی بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بدتمیزی کی حد تک بے تکلّف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہنسی مذاق اپنے ہم عمروں ہی میں زیب دیتی ہے۔ عمر اور مرتبے کا لحاظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ بزرگ عزّت و احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی کی پروا کیے بغیر ہنسی ٹھٹھا کرنا خلافِ تہذیب بات ہے۔ خواہ ایسے بزرگ اجنبی ہی کیوں نہ ہوں

شخصیات کے ساتھ ساتھ بعض مقامات بھی ایسے ہوتے ہیں جو لائقِ احترام ہوتے ہیں اور ان جگہوں کی سنجیدگی اور تقدّس کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً مسجد، کلاس روم، لائبریری، علمی مجالس۔ ان جگہوں پر دوستوں کی ٹولی بنا کر ہنسنا ہنسانا اور غل غپاڑہ مچانا کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔ بلکہ پبلک ٹرانسپورٹ یعنی بسوں اور منی بسوں پر بھی اس طرح کی فضا دیگر مسافروں کے لیے تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب دوست احباب ایک جگہ اکٹھا ہو کر ہنسی مذاق کر رہے ہوں تو اس میں جُملہ بازی اور فقرے بازی سے بڑھ کر جسمانی مذاق بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کسی کو چپت لگا دی، کسی پہ چھلکا اچھال دیا۔ کسی کے جُوتے چھُپا دیے، کسی کا پرس اُڑا لیا۔ اکثر اوقات اس قسم کا مذاق محض تفریحِ طبع کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن بعض صورتوں میں یہ مذاق سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے اور نوبت مار پیٹ تک پہ آجاتی ہے۔ اور یوں ایک غیر سنجیدہ مذاق تعلقات کو ختم کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ اور ایک دوست دوسرے اچھے دوست سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے اور پھر اس صورتحال پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔

بلاشبہ ہنسنا ہنسانا ایک شگفتہ عمل ہے لیکن اس شگفتگی میں شائستگی بھی ہونی چاہیئے۔ اس طرح ہم اس کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں اور تبھی کہہ سکتے ہیں کہ بے شک ہنسی علاجِ غم ہے۔

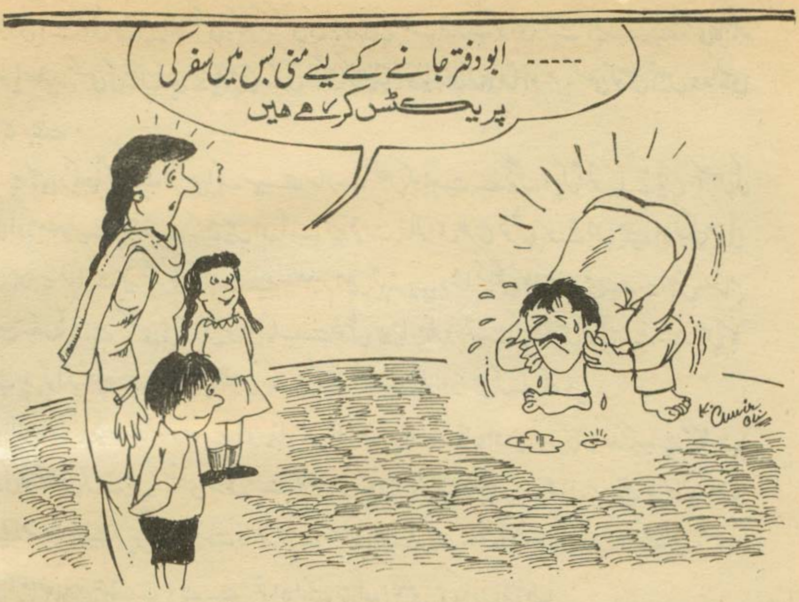
----- ابو دفتر جانے کے لیے منی بس میں سفر کی پریکٹس کر رہے ہیں

آنکھ مچولی کا قہقہہ نمبر آ رہا ہے ۔ میں بھی اُس کے لیے کوئی کہانی لکھ کر بھیجوں گا
میری مانو تو کوئی ایسی چیز بھیجو جس پر لوگ ہنس سکیں
مثلاً کیا ؟
اپنی نئی تصویر

ADARTS
Scanner AFI-2/86

کوئس® کا نشان معیار کی علامت
کوئس®
مشروبات
شربتِ لیموں
شربتِ انناس
مشروبِ کوئس® رل شربت
آئسکریم سیرپ
شربتِ سنترہ
ومٹو سیرپ
مشروبِ کوئس
QUICE Lemon Syrup
QUICE Ice Cream Syrup
QUICE Pineapple Syrup
QUICE Vimto Syrup
QUICE Orange Syrup
مفت
ہر بوتل
کیساتھ ایک عدد
خوبصورت گلاس کا تحفہ
انڈس فروٹ جوس کمپنی
پوسٹ بکس نمبر 8026 کراچی 75400 پاکستان
فیکٹری: پلاٹ نمبر 47 سیکٹر 23 کورنگی انڈسٹریل ایریا
فون: 311282 کراچی پاکستان

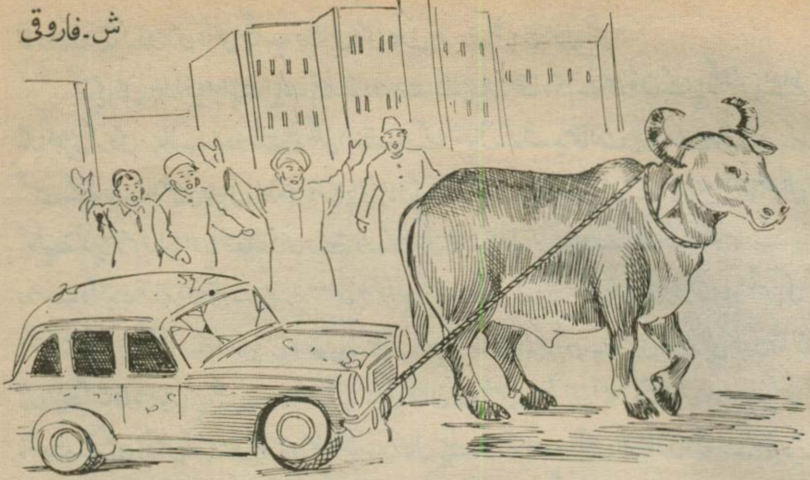

ش۔ فاروقی

اور ہم نے کار خریدی

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہم نے اپنے باس اور بیگم سے پریشان ہو کر کراچی کا سفر اختیار کیا۔ کراچی میں دیکھنے کی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً سمندر، اونٹ، کرفیو وغیرہ۔ تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ کراچی میں اپنی سواری کے بغیر گھومنا اپنی جیب اور صحت دونوں کو خطرے میں ڈالنا ہے اور چونکہ ہم طبعاً احتیاط پسند واقع ہوئے ہیں اس لیے ہم نے سوچا کہ کراچی گھومنے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید ہی جائے۔ یہ سوچ کر ہم ایک بہت بڑے شوروم میں جا پہنچے جو شوروم کم اور کاروں کا جمعہ بازار زیادہ لگ رہا تھا۔ بازار میں داخل ہوتے ہی ہماری نظر ایک غیر معمولی کار پر پڑی۔ کار پر نگاہ پڑتے ہی ہم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جو ہماری زندگی کا آخری قہقہہ ثابت ہوا۔ کیونکہ کار خریدنے کے بعد تو دوسرے ہم پر قہقہہ لگاتے رہے۔ مزاحیہ شاعر عبدالکریم بھونپو جو اُس وقت ہمارے ساتھ تھے اور جن کی خیر خواہی پر ہم پختہ ایمان رکھتے تھے ہمیں جوش دلانے کے لیے ٹھنکتے ہوئے بولے "یہ کار تم خرید رہے ہو یا میں خرید لوں؟" ہم نے جلدی سے کہا "نہیں! نہیں! ہم خرید رہے ہیں" اور یوں صاحب ہم نے چھ ہزار روپے میں چھ میٹر لمبی تین میٹر اونچی اور سولہ سو کلوگرام کی ہلکی پھلکی کار خرید لی۔ جس کا نام اُس کے بنانے والوں نے "مرکری فورڈ" رکھ چھوڑا تھا۔ ہم نے کار فروخت کرنے والے سے جب کار کی تاریخ پیدائش پر روشنی ڈالنے کو کہا تو پتا چلا کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے مزید تحقیق نہیں کی ورنہ کار کا مالک یہ بھی

ثابت کر دیتا کہ دوسری عالمی جنگ دراصل اسی کار کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔
کراچی میں ہمارا قیام اپنے ایک پُرانے دوست کے یہاں تھا۔ ہم نے کار اُن کے اپارٹمنٹس احاطے میں کھڑی کر دی۔ ہمارے یہ دوست غیر ملکی اشیاء کے استعمال کے شدید مخالف ہیں۔ ایک مرتبہ اُن کے کسی رشتے دار نے انھیں جاپانی ریفریجریٹر کا پانی پلا دیا۔ اس کے بعد سے موصوف نے ریفریجریٹر کے استعمال کو اپنے اُوپر حرام کر لیا اور انتقاماً اُس رشتے دار کے گھر کی طرف پاؤں کر کے سونے لگے۔ رات کو ہمارے یہ دوست دفتر سے آتے ہی ہم سے بولے "اس کار کو آپ کسی اور جگہ لے جا کر کھڑی کر دیں کیونکہ اپارٹمنٹس کی انتظامیہ نے اپارٹمنٹس کے آس پاس کاٹھ کباڑ جمع کرنے پر پابندی عائد کر دی ہے" اپنی نئی نویلی کار کی شان میں ایسے گستاخانہ بیان پر ہمیں بے حد غصہ آیا۔ کار کی شان میں ایسی۔۔۔ توہین آمیز باتیں اگر ہمارے کسی ماتحت نے کہی ہوتیں تو ہم اس کو کبھی کا دفتر سے نکال چکے ہوتے اور یہ باتیں اگر ہماری بیگم نے کہی ہوتیں تو ہم خود اُن کے گھر سے نکل چکے ہوتے۔ مگر یہاں واسطہ ماتحت اور بیگم سے نہیں، دوست سے تھا۔ اور دوست بھی وہ جسے ہماری میزبانی کا شرف پہلی بار نصیب ہُوا تھا۔
جو پچھلے چند برسوں میں بیسیوں مرتبہ ہمیں خط لکھ کر دھمکی دے چکا تھا کہ اگر تم نے جلد ہی شرفِ میزبانی نہ بخشا تو میں قریبی تھانے میں تمھارے خلاف "ہتکِ دوستی" کی رپٹ درج کروا دوں گا اور جو پچھلے چند روز سے ہمیں دیکھ دیکھ کر اس قدر خوش ہو رہا تھا کہ اس کا چہرہ مسرت کی سرخی سے کشمیری سیب ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم خاموش رہے بلکہ مُسکرا دیے۔ ابھی اس واقعے کو تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ محلے کے کچھ بچّے آئے اور بولے "انکل اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کی کار میں "آنکھ مچولی" کھیل لیں دِل میں تو آیا کہہ دیں کہ نامرادو یہ کار ہے، کوئی پبلک اسکول نہیں مگر پھر یہ سوچ کر اُنھیں اجازت دے دی کہ بچّے کبوتروں کے کابُک جیسے فلیٹوں سے اُکتائے ہوئے ہیں ذرا کشادہ جگہ پر کچھ دیر کھیلیں گے تو اِن کا دِل بہل جائے گا۔ ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ اُن بچّوں میں سے ایک پانچ چھ سالہ بچّہ ہاتھ میں ہتھوڑا اُٹھائے ہوئے ہمارے پاس آیا اور بولا "انکل یہ لیجئے آپ کی کار کی چابی۔ کار کی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی"۔ ہتھوڑا لے کر جی چاہا کہ اس سے اپنا سر پھوڑ لیں یا اس بچّے کے والدین کو تلاش کریں جن کی ناقص تربیت کی وجہ سے اس گستاخ کو ہماری کار کے خلاف زہر اُگلنے کی جرأت ہوئی۔ کراچی میں ہم پردیسی تھے، سو خون کا گھونٹ پی کے چُپ ہو رہے۔
اگلے روز ہم اپنے ایک رشتے دار سے ملنے کے لیے لیاقت آباد گئے اور ہم نے اُنھیں بڑے چاؤ

سے اپنی کار دکھائی۔ وہ صاحب کار دیکھ کر بولے "میرے دادا ابّا نے بھی اسی ماڈل کی ایک کار خریدی تھی۔ جسے تین مہینے چلانے پر اتنا خرچ آگیا کہ کار گیراج کے اندر پہنچ گئی اور ہمارا خاندان سڑک پر آگیا۔" کیا پتھراؤ کرنے کے لیے؟ ہم نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں بھیک مانگنے کے لیے۔" انھوں نے بے مزہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ اور اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ تو خدا کا کرم ہو گیا کہ دادا جی کو جلد ہی عقل آگئی اور انھوں نے کار کو مستقل طور پر گیراج ہی میں رہنے دیا۔ دادا جی کے انتقال کے بعد سات ہزار روپے میں خریدی ہوئی کار سات سو روپے میں فروخت ہوئی۔ اور اُس کی فروخت کے دو ہفتے بعد ہی خریدار کار کو دھکیلتا ہوا لے کر آیا اور کہنے لگا۔ کار آپ رکھ لیں، رقم بے شک واپس نہ کریں۔" باتیں کرتے کرتے ہمارے باتونی رشتے دار کی نظر اچانک کار پر پڑے ہوئے ایک گڑھے پر گئی۔

"ارے شانی صاحب! وہ چیخے۔ "یہ تو وہی کار ہے۔" پھر اپنے کان کے نچلے حصّے کو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے بولے "نمبر تو مجھے یاد نہیں لیکن دادا جی نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ ہمارے گھر کے تمام افراد نے کار کے ایک مخصوص حصّے پر اتنی بار سر پھوڑا تھا کہ وہاں ایک گڑھا بن گیا تھا۔ یہ وہی گڑھا ہے۔ ہاں ہاں بالکل وہی۔ یہ وہی کار ہے۔" چند لمحے بعد انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور تسلّی دینے کے انداز میں کہنے لگے۔ "تم فکر نہ کرو انشاءاللہ میں ہر ماہ تمھاری مالی کفالت کے لیے کچھ نہ کچھ روپے بھیجتا رہوں گا۔ کیونکہ اب تمھاری تنخواہ تو اس کار کے پیٹ میں جایا کرے گی۔" ان کی اس تقریر اور تسلّی کا ہم پہ شمّہ برابر اثر نہ ہوا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اکثر رشتہ دار اپنے دوسرے رشتہ داروں کو ترقی کرتا دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔

کراچی میں ابھی ہمارے قیام کو پانچواں دن تھا کہ لاہور سے بیگم کا فون آیا۔ وہ سخت ناراض تھیں۔ بولیں "سنا ہے آپ نے کار خرید لی۔ فوراً کار سمیت پہنچیے۔ میرے بھتیجے کی لڑکی کا عقیقہ ہے۔ اس میں شرکت کرنی ہے۔" اس گفتگو سے اتنا تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ مجھ سے زیادہ کار کا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ ہمارے ایک قریبی دوست نے جو محکمہ ریلوے میں ملازم ہیں مجھ سے کہا کہ تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تم لاہور پہنچو۔ کار میں پیچھے سے روانہ کرتا ہوں۔

میرے لاہور پہنچتے ہی کار کے بارے میں بڑی تشویشناک خبریں ملنے لگیں مثلاً یہ کہ ریلوے انتظامیہ نے کار کو بحفاظت لاہور پہنچانے کی ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ جس کے بعد کار کو ایک جاننے والے صاحب کے حوالے کیا گیا جو لاہور جا رہے تھے اور جب وہ صاحب کار پر سوئے لاہور روانہ ہوئے تو ناظم آباد چورنگی تک کامیابی سے چلنے کے بعد کار ہاتھی کا پاؤں ہو گئی اور کراچی کی اُس مصروف ترین شاہراہ پر ایک گھنٹے تک ٹریفک

معطل رہا۔ ایک گھنٹے کے بعد کار کو کرین کی مدد سے ایک مکینک کی دکان پر پہنچایا گیا۔ جس کے بعد ان صاحب نے کار سے باعزت علیحدگی اختیار کی اور اب وہ مرکری فورڈ ان ہی دوست کے پاس ہے جن کے پاس ہم چھوڑ کے آئے تھے۔

ایک رات ڈیڑھ بجے کراچی سے ہمارے دوست کی بیوی نے فون پر سسکیوں بھری آواز میں ہمیں اطلاع دی: "بھائی صاحب آپ کے دوست صبح سویرے کار لے کر گئے تھے اور شام گئے تک واپس نہیں لوٹے... ڈھونڈنے پر گاڑی تو مل گئی مگر اُن کا کہیں پتا نہیں ہے، خدا کے لیے آپ اس کار کا کچھ کیجئے ورنہ ہمارا ہنستا مسکراتا خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔" اگلے روز ہم نے کراچی فون کیا تو معلوم ہوا کہ کار پانچ چھ گھنٹے چلنے کے بعد راستے میں کہیں خراب ہو گئی تھی لیکن چونکہ وہ شہر بھر میں مشہور ہو گئی تھی اس لیے شہر کا کوئی مستری اُسے ٹھیک کرنے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارا دوست ساری رات ورکشاپوں کے چکر لگاتا رہا ہم نے جب پوچھا کہ وہ جو ہمارے دوست کے گھر کے سامنے ایک مستری صاحب تھے اُن سے مدد کیوں نہیں مانگی تو جواب ملا "اللہ دتہ ایک ہفتہ ہوا اپنے بیوی بچّوں سمیت محلّہ چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ پر جا کر رہنے لگا ہے۔ محلّہ چھوڑ کر جانے کی وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ آخری بار اُسی نے کار کی مرمّت کی تھی۔"

چھ ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد وہ دن آ پہنچا جب کار کراچی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی اور بیس دن بعد لاہور پہنچی۔ کس طرح پہنچی اس کا قصّہ طولانی ہے۔ مختصراً اتنا سُن لیجئے کہ ڈرائیور نے کار پر بیٹھنے سے پہلے ہمارے ٹرانسپورٹر دوست سے کہا۔

میں نے بہت دنوں تک آپ کی خدمت کی ہے اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بیوی بچّوں کا خیال رکھئے گا۔" ہمارے دوست نے اُسے تسلّی کے ساتھ ساتھ ایک خط بھی تھما دیا جس میں اُس نے راستے میں پڑنے والی اپنی کمپنی کی تمام برانچوں کو ہدایت کی کہ کار کو جہاں کہیں بھی جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو فراہم کی جائے۔

بالآخر کار کراچی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی اور ہمیں ہر روز فون پر اس طرح کی اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ کار نے آج رُکے بغیر دس میل تک کا سفر کیا۔ آج کار فلاں شہر سے کامیابی کے ساتھ گذر گئی، آج کار فلاں جگہ پہنچ کر لیٹ سکتی تھی لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اُس نے صرف بیٹھنے پر اکتفا کیا۔

کار لے کر آنے والا ڈرائیور سر سے پاؤں تک دھول میں اٹا ہوا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ عمر قید کی سزا کاٹ کر جیل سے نکلنے والے قیدی جیسا ہو رہا تھا۔ اُس وقت ہم دونوں کی آنکھوں

میں آنسو تھے ہماری آنکھوں میں ڈرائیور کی حالت دیکھ کر غم کے، اور ڈرائیور کی آنکھوں میں کار سے نجات پانے پر خوشی کے آنسو تھے.

کار کو آئے ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ہمارا خاندانی گوالا ہمارے پاس آیا اور بولا" بابو جی سُنا ہے کہ آپ اپنی کار کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔اگر آپ پانچ سو روپے کے علاوہ ۲۰ کلو چارے کا خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں تو آپ کی کار کے چلنے کی ضمانت دیتا ہوں"۔"مگر وہ کس طرح" ہم نے حیرت سے پوچھا۔اس نے کہا۔

" آپ میرا بھینسا خرید کر کار میں جوت لیں۔مجھے پیسہ مل جائے گا اور آپ کی کار چل جائے گی"۔

لاہور میں، ہماری کار کا شمار بہت جلد تاریخی عجائبات میں ہونے لگا۔ شہر کے قابلِ دید مقامات شالامار باغ نیز بادشاہی مسجد کے بعد ہماری کار کا نام لیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ کار کی شہرت اتنی پھیلی کہ کار کو میوزیم میں رکھنے کا مشورہ دیا جانے لگا۔ اس مشورے پر ہم نے اب تک عمل نہیں کیا ہے۔ کار اب بھی ہمارے پاس ہے اور اب ہماری شہرت اسی کار کے حوالے سے ہے اور یہ کس حالت میں ہے اس کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا سکتے ہیں جس کو سنانے کے بعد میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ کیونکہ مکینک کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

ایک محلّے دار نے جنھیں ہر طرح کے اوسط سے بڑی دلچسپی ہے ہم سے ایک دن پوچھا" گاڑی کے تیل کی اوسط کیا ہے"۔اس سے قبل کہ ہم جواب دیتے۔ برابر میں کھڑے ہوئے ہمارے چار سالہ بچّے نے جواب دیا ایک لیٹر میں ۱۷ کلو میٹر۔ محلے دار نے تعجب کرتے ہوئے کہا" کمال ہے صاحب اتنی پرانی کار اور تیل کا اوسط اتنا کم"۔ یہ سُن کر ہمارا بچّہ فوراً بولا" انکل کمال کی کوئی بات نہیں ہے کار ۴ کلو میٹر پیٹرول سے اور ۱۳ کلو میٹر دھکّے سے چلتی ہے"۔

☆☆☆

یہ ماڈرن کسان ہے، صبح دیر سے اُٹھتا ہے، کھیت میں تھوڑا سا کام کرنے کے بعد درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر گلہری کی اُچھل کُود سے دِل بہلاتا ہے، خود کو یہ کہہ کر کام سے روکتا ہے کہ بیوی کھانا لائے گی تو پھر کھانا کھا کر کام کروں گا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر آجاتا ہے، کیونکہ وہ ٹی وی کے پروگرام بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ پہلے کھیت میں ہل چلاتا تھا۔ اب ٹریکٹر چلاتا ہے، قدرتی کھاد کے بدلے آسان یوریا ڈالتا ہے، پانی نہر کے بدلے ٹیوب ویل سے حاصل کرتا ہے۔ جمعہ کا دن اس کی چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن موڈ میں ہوتا ہے اور چھٹی شہر میں آکر گزارتا ہے کبھی کبھی پینٹ بھی پہن لیتا ہے

ٹوپیوں کا سوداگر

امجد اسلام امجدؔ

("راوی" کے گرد بچے بیٹھے ہیں، راوی گانا شروع کرتا ہے۔)

راوی۔ اک سوداگر ٹوپیاں لے کر چلا دُور کے دیس

بچے۔ چلا دُور کے دیس۔ چلا دُور کے دیس

راوی۔ سَر پر ٹوپی

(بچے راوی کی آواز میں اپنی آواز ملاتے ہیں) سر پر ٹوپی۔

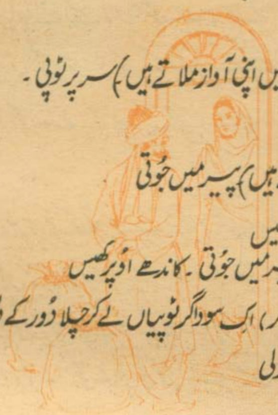

راوی۔ پیر میں جوُتی

(بچے پھر آواز ملاتے ہیں) پیر میں جوُتی

راوی۔ کاندھے اُوپر کھیس

بچے۔ سَر پر ٹوپی۔ پیر میں جوُتی۔ کاندھے اُوپر کھیس

راوی اور بچے (مِل کر) اک سوداگر ٹوپیاں لے کر چلا دُور کے دیس

راوی۔ جانے لگا تو بیوی بولی

بچے۔ بیوی بولی

بیوی۔ میری خاطر چاندی کا اِک ہار بھی لیتے آنا

جلدی واپس آنا

یہ لو روٹی کھیس میں رکھ لو۔ بھُوک لگے کھا لینا

رستے میں اِک ٹوپی میرے بھیا کو دے دینا

سوداگر۔ اچھی بیوی عہد کرو کہ بات مری مانو گی

جو بولوں گا اُس کو ہرگز جھوٹ نہیں جانو گی

بیوی۔ اچھا بابا
لے لو مجھ سے پکّا وعدہ
بات تمہاری سچ مانوں گی
ہرگز جھوٹ نہیں جانوں گی
جلدی سے اب کہہ بھی دونا
ضائع میرا وقت کرو نہ
گھر کا سارا کام پڑا ہے
سورج دیکھو سر پہ کھڑا ہے
سوداگر۔ دیکھ اے میری اچّھی بیوی
تیرا بھیّا لے کر ٹوپی
رکھّے گا نہ اپنے سر پر
پڑی پڑی وہ طاق کے اُوپر
میلی چکٹ ہو جائے گی
ساری زینت کھو جائے گی
بیوی ۔ جب بھی اپنے گھر والوں کو تحفہ میں نے بھیجا ہے
تم نے یونہی اُلٹا سیدھا کوئی بہانہ سوچا ہے
راوی ۔ سوداگر نے ٹوپیوں والا تھیلا پکڑا اور کہا
سوداگر۔ میں نے تو اِک بات کہی تھی ناحق ہی تم رُوٹھ گئیں
بھائی تمہارا سر آنکھوں پر ایسی کوئی بات نہیں
حکم کرو تو ساری ٹوپیاں جا کر اُس کی نذر کروں
وہ تو کیا ہے اس کے سارے بچّوں کو بھی پیش کروں
راوی ۔ یہ کہہ کر وہ ہُوا روانہ جوگی والے بھیس
بچّے ۔ اک سوداگر ٹوپیاں لے کر چلا دُور کے دیس
راوی۔ چلتے چلتے رات ہوئی اور گھور اندھیرا چھایا
سوداگر جب تھک کر بیٹھا بھوک نے خوب ستایا

کھانا کھا کر لمبی تانی، صبح تلک وہ سویا
اُٹھ کر اس نے کپڑے جھاڑے ندی پر منہ دھویا
ٹوپیوں والا تھیلا لے کر چلا پھر اگلے گاؤں
یہاں تلک کر چلتے چلتے تھک گئے اس کے پاؤں
سورج سر پر چمک رہا تھا جیسے آگ کا تھال
گرمی سے جب سوداگر کا حال ہوا بے حال
رستے کے اک پیڑ تلے وہ تھک کر بیٹھ گیا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند نے آن لیا
پیڑ کے اوپر بیٹھے اُس کو دیکھ رہے تھے بندر کچھ
سوداگر جب نیند میں کھویا نیچے اُترے بندر کچھ
ٹوپیوں والے تھیلے پر وہ سارے ٹوٹ پڑے
اک اک ٹوپی سر پہ رکھ کر واپس لوٹ گئے
دیکھا دیکھی اور بھی بندر پیڑ سے نیچے آئے
ساری ٹوپیاں ختم ہوئیں اور لمبے ہو گئے سائے
سوداگر کی آنکھ کھلی تو تھیلا خالی پایا
دل میں بولا لے گیا میری ٹوپیاں کون خدایا!
یوں ہی اس کی آنکھ پڑی تو اُوپر شاخوں پر
ٹوپیاں پہنے کھیل رہے تھے آپس میں بندر
دل میں کہا، اب کیسے اپنی ٹوپیاں واپس لاؤں
بھاگ دوڑ کر پکڑوں ان کو یا کوئی جال بچھاؤں
یکدم اُس کو بندر کی اک عادت آئی یاد
نقالی کی عادی ہے یہ بندر کی اولاد
سوچا اگر میں اپنی ٹوپی سر سے دوں اُتار
بندر اُس کی نقل کریں گے ہوگا بیڑا پار
جمع کروں گا ٹوپیاں اپنی، تھیلے میں بھر لوں گا
جلدی جلدی جا کر ان کو منڈی میں بیچوں گا
یہی سوچ کے پھینکی اس نے سر سے ٹوپی دُور
ٹوپیاں واپس ملنے کی اُمید سے تھا مسرور
سوداگر کی اس حرکت پر تھے بندر سب خاموش
نادانی پر پچھتایا وہ سوچا کہ افسوس
بندر بھی اب نقالی کی عادت بھول گئے

ٹوپیاں اب تک سر پر پہنے بیٹھے ہیں سارے
اتنے میں اک شاخ سے کودا موٹا سا بندر
چیتے جیسی تیزی سے وہ جھپٹا ٹوپی پر
سوداگر کی اپنی ٹوپی لے کر بھاگ گیا
وہ بے چارا پیڑ کے نیچے تھا حیران کھڑا
خالی تھیلا ہاتھ میں پکڑا، کاندھے اُوپر کھیس
بچّے۔ اک سوداگر ٹوپیاں کھو کر لوٹا اپنے دیس
(سب بچے ہنستے ہیں)

نگہت آرا چوہان

گھر کا بھیدی

ایک تو یہ ہماری نشّوبی سچ مچ آفت کی پڑیا ہیں۔ شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔ لو بھلا رفّو باجی کی شادی نہ ہوئی قیامت ہو گئی۔ بس جیسے ہی پتا چلا کہ اگلے جمعے وہ لوگ باجی کو دیکھنے آرہے ہیں انھوں نے سارا گھر اُلٹ پلٹ کر دیا۔ سارے کمرے صاف کئے گئے۔ نئی سفیدی ہوئی اور پاس پڑوس کی بے شمار آرائشی اشیاء ہمارے ڈرائنگ روم کی زینت بن گئیں اور پھر اُٹھتے بیٹھتے ان کے احکامات جی جلائے دیتے تھے: "ادھر مت آؤ، اسے ہاتھ مت لگاؤ۔ جوتوں سمیت صوفے پہ چڑھی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ خبردار جو ڈرائنگ روم میں گئی۔ ساری پُرانی چیزیں توڑ دے گی"۔ وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے کون کم بخت آرہے تھے۔ ضرور آسمان سے ٹپکے ہوں گے ورنہ نشّوبی ایسا طوفان نہ اُٹھاتیں۔ یہ سرگرمی دیکھ کر شامت کی ماری بے چاری اناںبی بھی بول پڑیں۔

"اے میں بولتی ہوں کی یہ سب دکھاوا کاٹے کو کرتے جی؟ اُتو لوگاں لڑکی سے شادی کریں گا کی ان چیزاں سے"؟ پھپھی بھڑک کر بولیں۔ "لیو اور سنو۔ آپ بھی کیسی باتاں کرتی ہیں۔ اب وہ پُرانے وختاں نہیں رہے۔ آج کل تو سب لوگاں کوٹھی بنگلہ دیکھ کو شادی کرتے ہیں"

یہ سُن کر وہ تو چُپ کی چُپ رہیں اور آئی گئی میرے سر آئی ۔ نشّو بی کے کان میں جانے کس شیطان نے پھونک دیا تھا کہ مہمان عموماً بچّوں سے ہی گھر کے خفیہ راز معلوم کرتے ہیں اس لیے وہ مجھے باقاعدہ ٹرینگ دینے پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔

"جب ڈرائنگ روم میں جاؤ تو بڑے ادب سے کہنا "گڈ مارننگ انکل۔ سمجھی کہ نہیں"؟ "سمجھ گئی"۔ میں نے سر ہلایا۔ اور دِل ہی دِل میں نادیدہ انکل کو بُرا بھلا کہا جو تشریف لانے سے پہلے ہی اتنے منحوس ثابت ہوئے تھے۔

"اور سُن" انھوں نے سرگوشی کی "اگر وہ اس پیانو کے بارے میں پوچھیں تو کہنا ہمارے ماموں فرانس سے لائے تھے۔ اور یہ جو قالین ہے وہ چاٹنا سے آیا ہے اور یہ ڈیک تایا نے جرمنی سے بھیجا تھا۔"

"مگر یہ تو آمنہ باجی کے گھر سے آیا ہے"؟

"پھر وہی بدتمیز۔ میں جو کہہ رہی ہوں وہی کہنا۔"

"میں تو کبھی نہیں کہوں گی۔" میں نے تُنک کر کہا۔

"کہے گی کیسی نہیں تُو۔" انھوں نے مجھے تھپیّڑ لگاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ جو ٹائم کلاک ہے وہ فرانس سے خریدا تھا"۔

"چہ ... پھر وہی فرانس"؟

"اور دیکھو اگر وہ تمھاری تعریف کریں تو کہنا تھینک یو۔ یہ نہیں کہ جاہلوں کی طرح دانت نکال دو۔" میں سچ مچ جل گئی۔

"ایسی کی تیسی۔ بڑے آئے لاٹ صاحب کہیں کے۔ ناک میں دَم کر دیا۔ ہونہہ ..." لیکن اس کے باوجود جب جمعے کو ان کے ساتھ آنے والی مُعزّز خواتین کو سلام کر کے میں ڈرائنگ روم چلی تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

انکل نُما صاحب ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی چیزوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کھا جائیں گے۔

"السلام علیکم! توبہ اللہ۔ گڈ مارننگ انکل"۔ مجھے اپنی آواز بھیک مانگتی ہوئی لگ رہی تھی۔

"او۔ گڈ مارننگ"۔ وہ جلدی سے بولے۔ "اوہ بے بی تم شاید ان کی بہن ہو۔ بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔ کیا نام ہے تمھارا۔"

"اے ... اے نام"۔ میں بوکھلا گئی۔ نشّو بی نے کہا تھا کوئی فیشن ایبل سا نام بتائیو۔ پھر کیا کہوں ... ڈالی؟ "ہشت۔ یہ کیسا نام ہوا؟ ڈالی تو درخت کی ہوتی ہے۔ ٹیمی۔ نہ یہ تو پڑوسن کی کُتیا کا نام ہے۔ افوہ ارے غضب۔ کچھ بھی تو یاد نہیں آ رہا۔ بھاڑ میں جائے۔ "ہمارا نام مُنّی ہے"۔ میں نے پھٹ سے سچ بول دیا۔

"پڑھتی ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"ہاں جی"۔

"کون سی کلاس میں"؟ مجھے غصّہ آگیا۔ کیسے پولیس والوں کی طرح سوال پہ سوال کیے جارہے ہیں۔ مگر خیر بتانا ہی پڑا۔ "اچھا کیا پڑھتی ہو؟ کچھ سناؤ"۔ وہ تو میرا امتحان ہی لینے پر تُل گئے تھے۔ میں ایسی بوکھلائی کہ کچھ بن نہ پڑا۔ نشّوبی نے کیسی مشکل سے "بابا بلیک شیپ" رٹائی تھی۔ کم بخت کیسی تھی یہ نظم کسی طرح یاد ہی نہ ہوتی تھی۔ پھر یہ شیپ کا S جس کی شکل سے مجھے چڑ تھی۔ بالکل بیہودہ۔ جیسے سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ یہ نظم تو کبھی نہ سناؤں گی۔ "ہمیں کچھ یاد نہیں" میں نے ڈھٹائی سے اعتراف کیا۔ انھوں نے ہونٹ سکوڑ کر مجھے دیکھا اور سگریٹ سلگانے لگے۔

میں احمقوں کی طرح بیٹھی رہی۔ نشّوبی کا سکھایا پڑھایا سب دماغ سے نکل گیا۔

"کیا تمھاری باجی کے بال لمبے ہیں"؟ اچانک انھوں نے عجیب سا سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔ وہ وِگ لگاتی ہیں"۔ میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ کچھ مایوس ہو کر بولے۔ "مگر تصویر سے تو معلوم نہیں ہوتا"؟

"تصویر سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے"۔ میں نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ "آپ کے بھی تو بال نہیں ہیں"۔ انھوں نے کچھ بُرا مان کر فوراً ٹوپی سر پر رکھ لی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تمھاری باجی کھانا کیسا پکاتی ہیں"؟

میں نے سوچا کہہ دوں "بہت مزے کا" لیکن باجی کے پکائے ہوئے کھانے کے تصوّر سے میری ہنسی چھوٹ گئی۔ "انکل اب کی عید پر انھوں نے فرنی پکائی تو چچا میاں بولے۔ کمال ہے اتنی ساری لئی پکانے کی کیا ضرورت تھی۔ سچ وہ تو چائے بھی ڈھنگ سے نہیں بنا سکتیں جی ہاں"۔ میں نے اُداس ہو کر کہا۔

"اوہ۔ یہ تو بہت بُری بات ہے"۔ وہ بدحواس ہو کر بولے۔ میں جل گئی۔ انھیں کیا تکلیف ہے آخر؟

چند لمحے خاموشی رہی۔ شاید انھیں سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر پیانو کی طرف دیکھ کر کچھ سنبھلے۔

"یہ غالباً تمھاری باجی ہی بجاتی ہیں"۔

"جی ہاں"۔ میں نے پہلی بار ان پر ترس کھا کر جھوٹ بولا۔

"خوب، خوب" وہ خوش ہو گئے۔ "پڑھتی بھی ہوں گی"۔

"سارا دِن پڑھتی رہتی ہیں"۔

"کیا"؟ انھوں نے مزید خوش ہو کر دریافت کیا۔

"یہی ناول، ڈائجسٹ اور کیا"۔

وہ ناراض ہو کر بولے۔ "میرا مطلب ہے کیا انھوں نے بی اے کا امتحان دیا تھا"؟

"پچھلے سے پچھلے سال تو فیل ہو گئی تھیں"۔ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"اور پچھلے سال"؟

"پچھلے سال بھی فیل ہو گئی تھیں"۔

"اور اِس سال"؟ وہ بھِنّا گئے۔

"اس سال انھوں نے امتحان ہی نہیں دیا"۔ میں نے ان کی ناک کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ ناک بھی عجیب بے تُکی سی تھی۔ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم؟

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمھارے گھر کار ہے"؟ انھوں نے اچانک موضوع بدل دیا۔

"جی نہیں"۔ میں نے ٹکا سا جواب دیا۔ مجھے وہ ناک سمیت بہت بُرے لگنے لگے تھے۔

"ہائیں۔ اس کا مطلب ہے تمھارے پاس وی سی آر بھی نہ ہو گا"؟

"یہ کیا ہوتا ہے"؟ میں نے جان کر پوچھا۔ ہُوں تو چچی جان ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ انھیں کوٹھی کار چاہیئے۔ ارے تو پھر باجی کا کیا اچار ڈالیں گے؟ بجلی گرے ان کی ناک پر۔

"یہ پیانو بھی تمھارا اپنا ہی ہے"۔ انھوں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ شاید کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔ میں نے سوچا اسلامیات کے ماسٹر جی نے کہا تھا کہ ہر حال میں سچ بولنا چاہیئے۔ یہ نشّو بی تو بکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"یہ آمنہ باجی کا ہے۔ وہ ہماری پڑوسن ہیں"۔

"کیا"؟ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ "تب تو یہ کلر ٹی وی"؟

"یہ بھی ہمارا نہیں ہے"۔ میں نے لقمہ دیا۔

"اور یہ ڈیک"؟

"یہ ثریا آنٹی کا ہے اور جناب وہ گلدان اور قالین بھی اُنھی کے گھر سے آئے ہیں"۔ میں نے جَل کر کہا۔

"خُدا کی پناہ"۔ وہ بے ساختہ ٹوپی اُتار کر اپنی گنجی کھوپڑی سہلانے لگے۔

"پانی لاؤں؟ شائستہ خالہ کے گھر سے جو فرج آیا ہے اس میں بہت ٹھنڈا پانی ہوتا ہے"۔

"بھاگ جاؤ"۔ انھوں نے غُرّا کر کہا اور میں جھٹ سے اندر چلی آئی۔ اب کبھی گھر میں مہمان آتے ہیں تو مجھے مٹھائی کا لالچ دے کر باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

10

یہ جواب آپ کو ص ۲۰۴ پر ملے گا۔

شیری

سب گھر والے آج رات گھر پر نہیں تھے۔ شیری اور میں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوم ورک کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب کسی طرح بھی دل پڑھائی میں نہ لگا تو طے پایا کہ نانی جان سے کہانی سُنی جائے۔ اب جو نانی جان کے پاس جا کر کہانی سُنانے کو کہا ہے تو وہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ اُنھیں غصّہ اس پر تھا کہ ہمارے امّی اور ابّو خود تو پارٹیوں میں چلے جاتے ہیں اور بچّوں کو یہاں اُودھم مچانے کو چھوڑ جاتے ہیں۔ جب اُن پر غصّہ نکل چُکا تو ہماری باری آئی۔ "میرے پاس کیا لینے کو آئے ہو، جاؤ فلمیں دیکھو، کرکٹ کھیلو۔" جلد ہی نانی جان پسیج گئیں اور کہانی سُنانے لگیں۔

"بہت زمانے پہلے کا ذکر ہے ایک بزرگ ہُوا کرتے تھے، دن میں مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے، رات میں نوافل ادا کرتے۔ کہتے ہیں کہ وہ رات بھر میں پانچ ہزار نوافل پڑھ لیا کرتے تھے۔۔۔"

یہاں شیری میاں کے کان کھڑے ہوئے، اور انھوں نے اعتراض کیا "یہ ممکن نہیں ہے۔"

"بھئی تم کہانی سنو۔" میں نے انھیں روکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ اب اُمید تھی کہ وہ کوئی گُل ضرور کھلائیں گے۔ مگر وہ کہاں بخشنے والے تھے۔ اُنھوں نے فوراً حساب لگا کر بتایا کہ "اگر وہ ایک منٹ میں ایک نفل پڑھتے ہوں تو رات بھر میں سات سو بیس نفل ہو سکتے ہیں۔"

نانی جان نے اُن کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہانی جاری رکھنے کی کوشش کی: "جب سحری کا وقت ہوتا تو وہ روزے کی نیت باندھ لیتے۔۔"

"سمجھ میں آگیا" شیری صاحب چلّائے۔ "وہ دو سو نفل پڑھ کر باقی کی صرف نیت کر لیا کرتے ہوں گے۔"

"کیسی پاگل پنے کی بات ہے۔ بھلا صرف نیت باندھنے سے عبادت کہاں مکمّل ہوتی ہے۔" میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر اب وہ ثابت کرنے پر تُل گئے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ نانی جان نے جب دیکھا کہ معرکہ خوب گرم ہو چکا ہے تو وہ نماز پڑھنے کے لیے اُٹھ گئیں۔ اور ہم بحث میں اُلجھتے اُلجھتے سو گئے۔

شیری اور میں کزن تھے اور ایک ہی اسکول میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ مجھے اس دور کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ اُن کی شرارتوں سے گھر اور اسکول کے لوگ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ ہماری کئی مرتبہ لڑائیاں بھی ہوئیں مگر فوراً ہی من جایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسکول میں سَر بچّوں سے انگریزی کا سبق سُن رہے تھے۔ شیری کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کو سبق یاد نہ تھا۔ شیری نے اُس کی مدد کر دی۔ سَر نے اُس لڑکے سے سبق سُنا تو خوب ناراض ہوئے اور پوچھا کہ "تمھیں کس نے بتایا ہے کہ cup سپ ہوتا ہے"۔ لڑکے نے بتایا کہ "شیری نے۔"

اب سَر نے شیری سے پوچھا کہ "تم نے عارف کو غلط کیوں بتایا؟"

"سَر جب تک عارف میرے دو روپے واپس نہیں کرتا cup سپ ہی رہے گا۔" شیری نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ سَر کے چہرے پر مُسکراہٹ آئی اور چلی گئی اور پھر گرج کر بولے "تم نے ہوم ورک کیا؟"

"سر! ہادی سے پوچھئے۔"

"کیوں اس سے کیوں پوچھوں؟"

"اس لیے کہ اس نے بھی نہیں کیا۔"

اب سَر میری طرف متوجّہ ہوئے اور مجھے نوافل والا سارا قصّہ سُنانا پڑا۔ اس روز تو خوب ڈانٹ پڑی اور سزا بھی ملی مگر شیری اس بات پر خوش تھے کہ اس بہانے ان کی جان سبق سُنانے

سے بچ گئی۔

ایک دفعہ میں اور وہ کمرے میں بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے کہ یکایک ایک عجیب سی آواز پیدا ہوئی۔ میں خوفزدہ ہو گیا اور شیری بھی۔ پھر شیری نے سنجیدگی سے بتایا کہ "ایسی آوازیں ضرور جن بھوت کی ہوتی ہیں۔" اب ہم اور ڈرے، تھوڑی دیر کے بعد ویسی آواز پھر بلند ہوئی۔ اس کے بعد تو لگاتار آوازیں آنے لگیں۔ خوف سے میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ شیری نے مجھے نصیحت کی کہ "ایسے مواقع پر جب جن بھوت کہیں آجائیں خوفزدہ ہو کر بھاگنا نہیں چاہیے۔" میں جو بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا جم کر بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس روز امی کمرے میں نہ آجاتیں تو بس کام ہو گیا تھا۔

دراصل انھیں نت نئی ایجادات کا شوق تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن اپنی کرسی میں فٹ کر رکھا تھا اور ڈراؤنی آوازیں کسی انگریزی گانے سے بھری گئی تھیں۔ یہ اُن کی ایجاد تھی جس کا مقصد بچوں کو خوفزدہ کرنا تھا۔

میری سالگرہ آئی تو انھوں نے مشورہ دیا کہ سالگرہ کسی انوکھے طریقے سے منائی جانی چاہیے۔ مگر اُن کی تجویز پر کسی نے کان نہ دھرا تو وہ تقریب سے واک آؤٹ کر گئے۔ جب مہمان چلے گئے تو انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ "سالگرہ کو انوکھے طریقے سے منانے کی آفر اب بھی موجود ہے۔ اگر تم تعاون کرو تو سالگرہ یادگار ہو سکتی ہے۔" میں مان گیا۔ سب لوگ سو گئے تو ہم آہستہ سے اُٹھے اور پروگرام کے مطابق لان میں چلے گئے۔ میں نے اُن کی تجویز کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ "بس چُپ چاپ بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ سب کچھ میں کر دوں گا۔" اور وہ سامنے بنچ پر بیٹھ کر سر کا طواف کرنے والے مچھروں کا شکار کرنے لگے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو میں نے گھبرا کر پوچھا کہ "بھئی پروگرام کیا ہے" تو وہ ڈانٹ کر کہنے لگے کہ "بس چُپ چاپ بیٹھے رہو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخر سال کو گرہ (گانٹھ) کیسے لگتی ہے۔ تمہاری تو سالگرہ ہے تم بھی دیکھنے کی کوشش کرو۔"

شیری کا خیال تھا کہ دنیا بھر کی نعمتیں کھا جاؤ مگر مزہ اُس وقت تک بالکل نہیں آتا جب تک چوری نہ کی جائے۔ ایک دفعہ گھر میں کچھ مہمان آنے والے تھے۔ سب گھر والے تیاریوں میں مصروف تھے۔ بہت سی چیزیں گھر میں تیار کی گئیں، کچھ بازار سے منگائی گئی تھیں۔ اتفاق سے اُس روز یکم اپریل بھی تھا۔ شیری نے تجویز پیش کی کہ "آج اپریل فول کی آڑ میں چوری کی جائے۔ تو کیسا مزہ رہے"۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے پی سی او پر جا کر گھر فون کیا اور احتیاطاً ماؤتھ پیس پر رومال رکھ دیا تاکہ آواز پہچانی نہ

جا سکے گھر والوں کو جب اچانک خبر ملی کہ ماموں جان ایئر پورٹ پر موجود ہیں اور ہمارا انتظار کر رہے ہیں، تو سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ ہم اچھی طرح آنے والوں کا استقبال کریں اور اُنھیں ڈرائنگ روم میں بٹھائیں اتنے میں ہم لوگ ماموں جان کو لے آئیں۔ دراصل ماموں جان ایک طویل عرصے سے امریکہ میں تھے اور اُن کی اچانک آمد کی خبر سب کو خوش اور بدحواس کرنے کے لئے کافی تھی۔

سب لوگ چلے گئے تو نانی جان سے آنکھ بچا کر چوری کرنا کیا مشکل تھا۔ چنانچہ چوری کر کے کھانے کا خوب خوب مزہ لیا۔ شیری نے مجھے سِکھایا کہ جب وہ لوگ ایئر پورٹ سے واپس آکر ڈانٹنے لگیں تو ہم اپریل فول کہہ کر چھوٹ جائیں گے اور مذاق الگ اُڑائیں گے مگر وہ لوگ واپس لوٹے تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ جلدی کی وجہ سے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ کوئی زخمی نہیں ہوُا ورنہ الگ مصیبت آتی۔ اُس روز جو گت بنی اُس کی روشنی میں مَیں نے طے کیا کہ آئندہ میں شیری کی کسی سازش میں شریک نہیں ہوں گا اور اپریل فول تو کبھی نہیں مناؤں گا۔ مگر شیری کا فیصلہ مجھ سے الگ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ شرارت صرف ذہین لوگ کرتے ہیں اگر وہ شرارت نہیں کریں گے تو ذہانت مَر جائے گی۔

کچھ عرصہ بعد جب ہم نے میٹرک کر لیا تو گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک ہم دونوں کو الگ نہیں کیا جاتا امن قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اُنھیں لاہور کے ایک کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ اُنھیں وہاں گئے بہت سال ہو گئے ہیں مگر اُن کی شرارتیں جب بھی یاد آتی ہیں تو دِل خوشی سے بھر جاتا ہے۔

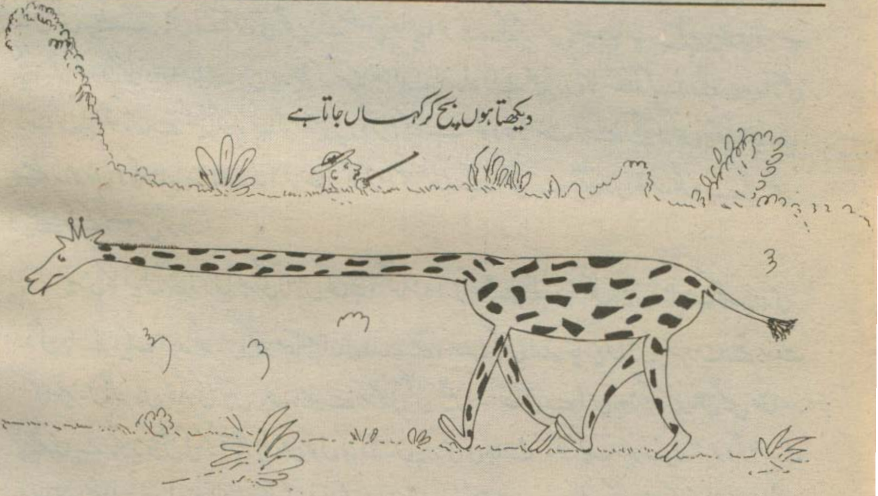

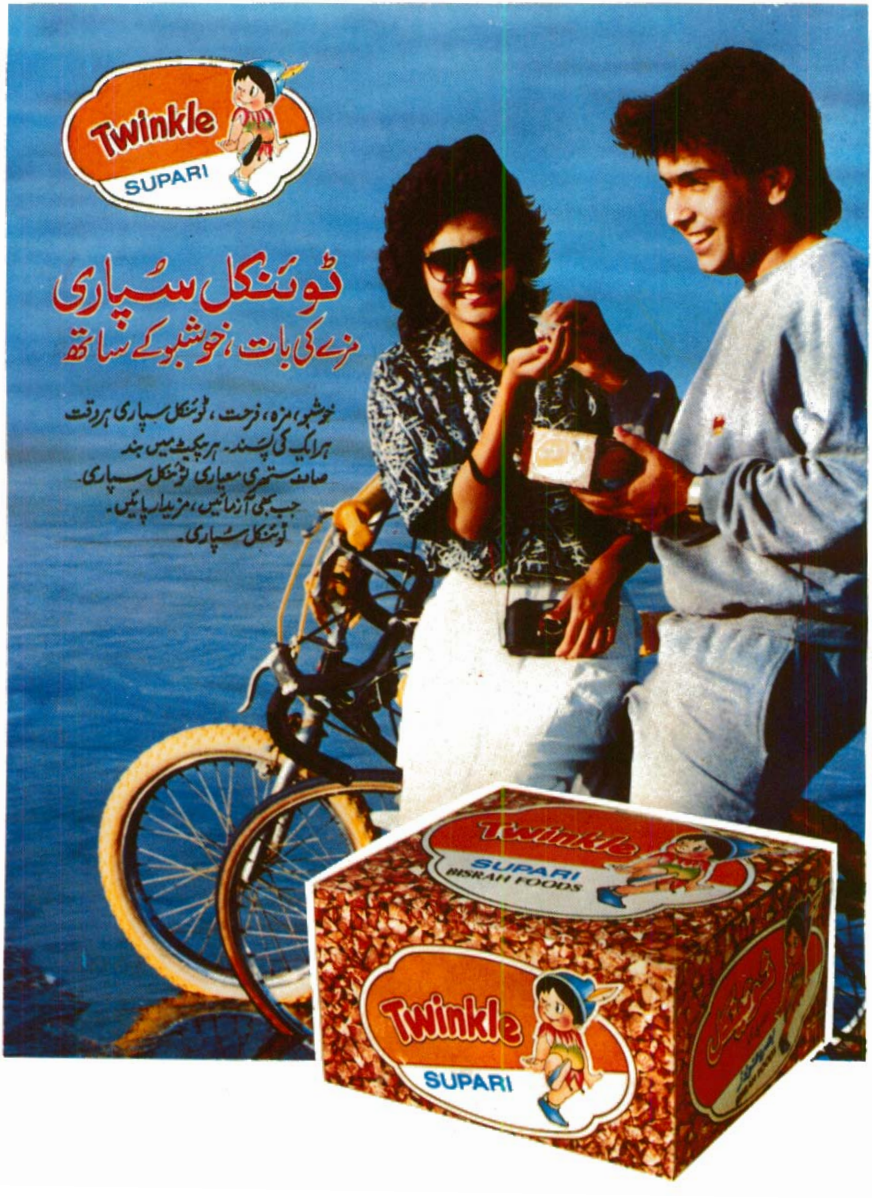
Twinkle
SUPARI
ٹوئنکل سُپاری
مزے کی بات ، خوشبو کے ساتھ
خوشبو، مزہ، فرحت، ٹوئنکل سپاری ہر وقت
ہر ایک کی پسند۔ ہر پیکٹ میں بند
صاف ستھری معیاری ٹوئنکل سپاری۔
جب بھی آزمائیں، مزیدار پائیں۔
ٹوئنکل سُپاری۔
Twinkle
SUPARI
BISRAH FOODS
Twinkle
SUPARI

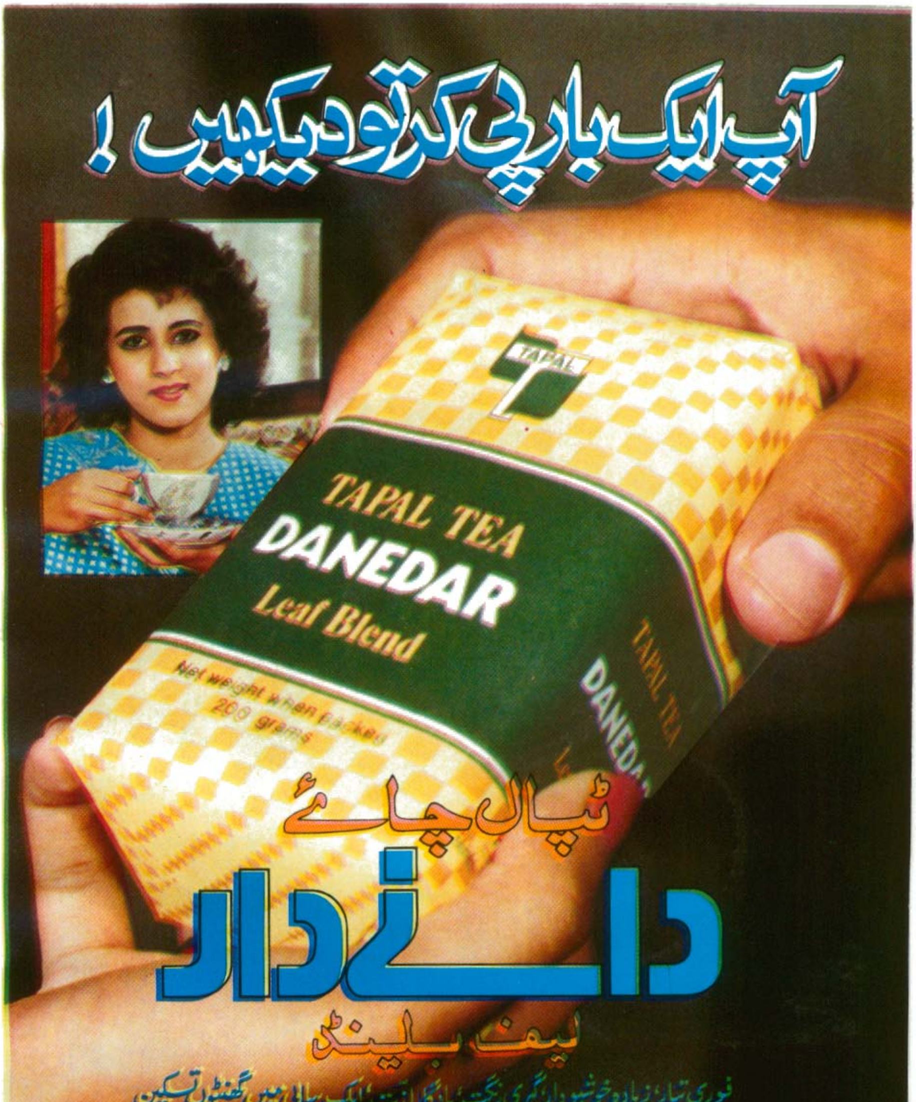

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں !
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
ٹپال چائے
دانےدار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

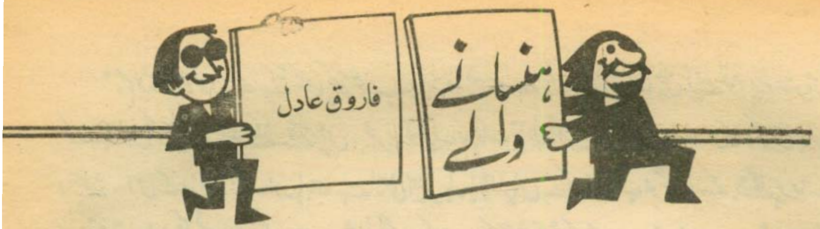

مزاح اور زندگی کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو مزاحیہ ادب سے محروم ہو ہماری پیاری زبان اردو کا دامن بھی اس سے خالی نہیں۔ مزاح اردو زبان کے آغاز سے ہی کسی نہ کسی شکل میں اس میں موجود رہا بعد میں ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کر گیا۔ جسے آغاز میں تو طنز و مزاح کہا گیا بعد میں ادب کے علمائے نے کئی نام دے دیے اردو نثر ہو یا شاعری ہر دو اصناف میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔

اردو میں مزاح نگاروں کی تعداد شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے مقابلے میں کم ہے۔ کیونکہ مزاح لکھنا بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن جتنے بھی مزاح نگار ہیں ان کی مزاحیہ تحریروں کا معیار بہت بلند ہے مثلاً رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، ابنِ انشاء، شفیق الرحمان مشتاق احمد یوسفی، محمد خان، سید ضمیر جعفری، فکر تونسوی ۔ نصر اللہ خان، مشفق خواجہ اور عطاء الحق قاسمی اور متعدد دیگر ادیب مزاح نگاری کے آسمان کے چمکتے دمکتے ستارے ہیں۔

اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ اردو ادب میں بچوں کے لیے لکھنے پر نسبتاً کم توجہ دی گئی یہی معاملہ مزاح میں بھی ہے۔ ایسی مزاحیہ تحریروں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی جو خاص طور سے بچوں کے لیے لکھی گئی ہوں ان صفحات میں اردو کے مزاح نگاروں کا تعارف اور اُن کی تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

پطرس بخاری

اصل نام سید احمد شاہ پطرس بخاری تھا۔ اردو اور انگریزی کے صاحب طرز ادیب اور قادر الکلام انشا پرداز اور منفرد مزاح نگار تھے۔ انھوں نے صرف آٹھ مزاحیہ مضامین لکھ کر تہلکہ مچا دیا جو "پطرس کے مضامین" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے متعدد مضامین نصابی کتب میں بھی شامل ہو چکے ہیں۔

پطرس انگریزی کے استاد رہے کچھ عرصہ تک اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ پطرس نے بچوں کے لیے بھی کچھ نظمیں کہیں اس کے علاوہ چند کتابوں کے دیباچے تحریر کیے اُن کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے مضمون "کتے" سے اقتباس دیا جا رہا ہے۔

"ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ کوٹ پتلون کو دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلے پر جانے کا اتفاق ہوا خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کر کے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اُس نے بھی پیار سے قدم اُٹھا کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں "بخ" کر دی بیچو کیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی، ہمارے کتے ہیں کہ راگ نہ سُر، نہ سَر نہ پیر، تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔"

مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت کا نام اردو صحافت کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کلکتہ سے شائع ہونے والے روزنامہ "نئی دنیا" سے کیا۔ جس میں وہ "کولمبس" کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ نئی دنیا کے بعد وہ مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" سے منسلک ہو گئے۔ بعد میں وہ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ بالآخر روزنامہ امروز کے مدیر ہو گئے۔ جہاں وہ "حرف و حکایت" کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری ایّام میں انھوں نے نوائے وقت میں بھی کالم لکھے۔ ان کا قلمی نام سندباد جہازی تھا۔

مولانا نے ہزاروں کی تعداد میں کالم لکھے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اتنا زیادہ لکھنے کے باوجود اُن کے معیار پر کبھی فرق نہیں پڑا۔ اُن کے یہی کالم جدید اُردو مزاح نگاری اور کالم نگاری کا آغاز ہُوا۔ ایک بزرگ ادیب اور صحافی مولانا عبدالمجید سالک نے اُن کے کالموں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

"۔۔۔پڑھنے والا لفظ لفظ پر پھڑک اٹھتا ہے۔"

ذیل میں اُن کے کالم کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو ۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کو روزنامہ امروز میں حرف و حکایت کے مستقل عنوان کے تحت شائع ہوا۔

ایک اخبار نویس نے اپنے نوکر سے پوچھا۔

"تمھیں معلوم ہے چین کی آبادی کتنی ہے ؟"

"نہیں صاحب میں کیا جانوں !"

"دیکھو چین بہت بڑا ملک ہے بس یہ سمجھ لو کہ جتنی دیر میں ہم سانس لیتے ہیں چین میں ایک سو انسان مر جاتے ہیں"۔

نوکر نے یہ سُن کر زور زور سے سانس لینا شروع کر دیا۔ آقا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہائیں ! یہ کیا کر رہے ہو"

جواب ملا۔ "چین کی آبادی کم کر رہا ہوں"۔

مجید لاہوری

اصل نام تو عبدالمجید چوہان تھا مگر مجید لاہوری اور نمک لاہوری کے قلمی ناموں سے لکھتے تھے۔ شاعری ادب اور صحافت، تینوں میدانوں میں اپنے قلم کے جوہر کھلائے۔ وہ کئی برسوں تک روزنامہ جنگ لاہور میں "حرف وحکایت" کے نام سے ایک کالم لکھتے رہے۔ ان کے کالموں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کم پڑھے لکھے لوگوں میں زیادہ مقبول تھے۔ انھوں نے اپنے کالموں کے لیے چند مخصوص قسم کے کردار تخلیق کر رکھے تھے۔ ان میں رمضانی، سائیں سلیمان بادشاہ، سیٹھ ٹیوب جی، ٹائر جی، جمّن شاہ، تجوری بھائی اور شیخ حمّاد اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

ان کی مزاح نگاری کی ایک نمایاں بات یہ ہے کہ زبان اور ادب کے چکّر میں نہیں پڑتے سادہ سے انداز میں بات کہہ دیتے ہیں۔ اسی لیے انھیں عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ذیل میں اُن کے کالموں کے انتخاب "مجید لاہوری کی حرف وحکایت" سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "کچھ ناموں کے متعلق"۔

"جھانسی میں ایک بزرگ رہتے تھے جن کا نام تھا عبدالغنی۔ لیکن انھوں نے "پیدائشی شاعری" شروع کر دی۔ یعنی بچوں کے نام ہم قافیہ رکھنا شروع کر دیے ان کے لڑکوں کے نام تھے۔ عبدالشافی، عبدالوافی عبدالکافی۔ جب چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو کسی دوست نے مشورہ دیا کہ اس کا نام عبدالثانی رکھ دو، نام پکارتے وقت منہ میٹھا ہو جائے گا۔

وہ تو کہیے کہ جھانسی میں حکیم سعید صاحب کا ہمدرد دواخانہ نہیں تھا۔ ورنہ وہ صاحب لڑکے کا نام "عبدالصافی" رکھ دیتے"۔

شوکت تھانوی

محمد عمر شوکت تھانوی کا شمار چوٹی کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے وہ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی، روزنامہ جنگ میں کالم لکھتے رہے۔ اُن کی متعدد کتابیں موجود ہیں جنھیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے انھوں نے ادب و صحافت کا آغاز روزنامہ ہمدم سے کیا۔ اُن دنوں آپ "دو دو باتیں" کے عنوان سے کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ متعدد اخبارات کے ایڈیٹر بھی رہے۔ دنیائے تبسم، بحرِ تبسم، بھانی، غزالہ، خدانخواستہ اور مولانا ان کی معروف کتابیں ہیں۔

ان کے ایک کالم کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"چند دن سے یہ کالم غائب تھا۔ اس لیے کہ کالم نویس راولپنڈی سے غائب تھا۔ اس کالم کے قارئین سے اپنی غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہونے کے بعد عرض پرداز ہوں کہ مجھ کو مشاعرہ ہوگیا تھا۔ آپ نے اخبارات میں یہ خبریں تو پڑھی ہوں گی کہ کراچی میں چیچک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہاں چیچک سے کہیں زیادہ مشاعرے پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے خود دیکھے ہیں۔ جہاں تک چیچک کا تعلق ہے اس کو قابو میں لانے کے لیے وہاں ٹیکے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔ مگر اب تک کوئی "اینٹی مشاعرہ ویکسین" ایجاد نہیں ہوا ہے لہٰذا مشاعروں کے تحفظ کے ٹیکے نہیں لگتے۔ اور اگر کسی جگہ مشاعرے کا کوئی کیس ہو جاتا ہے تو ایسا متعدی مرض ہے کہ چاروں طرف مشاعرے پھوٹ پڑتے ہیں۔"

ابنِ انشاء

ابنِ انشاءؔ مزاح نگاری کے درمیانی عہد میں شگفتہ ترین تحریریں لکھنے والوں میں سے ہیں وہ بنیادی طور پر شاعر تھے مگر جب انھوں نے ۱۹۶۰ء میں روزنامہ امروز کراچی میں کالم لکھنا شروع کیا تو ان کے اندر طنز اور مزاح کے چھپے ہوئے جوہر نکھر کر سامنے آئے اور دنیا نے انھیں اردو مزاح نگاری کا امام تسلیم کیا۔ اُن کی مزاحیہ تحریروں کے مجموعے "اردو کی آخری کتاب" اور "خمارِ گندم" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے "بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشاؔ جی کا کاٹا سوتے میں بھی مسکراتا ہے۔"

اس انتخاب میں ہم ابنِ انشاؔ کی کتاب "اُردو کی آخری کتاب" سے دو تحریریں پیش کر رہے ہیں۔

شفیق الرحمٰن

ابنِ انشاؔ

ایک دُعا

"یا اللہ کھانے کو روٹی دے، پہننے کو کپڑا دے، رہنے کو مکان دے، عزت اور آسودگی کی زندگی دے۔"

"میاں یہ بھی کوئی مانگنے کی چیزیں ہیں کچھ اور مانگا کر۔"

"بابا جی! آپ کیا مانگتے ہیں؟"

"میں؟ میں یہ چیزیں نہیں مانگتا، میں تو کہتا ہوں، اللہ میاں! مجھے ایمان دے، نیک عمل کی توفیق دے۔"

"بابا جی آپ ٹھیک دُعا مانگتے ہیں۔ انسان وہی چیز تو مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔"

حساب کا ایک اور قاعدہ ضرب کا ہے۔

ضرب

ضرب کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً ضربِ خفیف، ضربِ شدید، ضربِ کاری وغیرہ ضرب کی ایک اور تقسیم بھی ہے، پتھر کی ضرب، لاٹھی کی ضرب، بندوق کی ضرب۔ علامہ اقبالؒ کی ضربِ کلیم ان کے علاوہ ہے۔ حاصل ضرب کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ضرب کس چیز سے دی گئی ہے یا لگائی گئی ہے۔ آدمی کو آدمی سے ضرب دیں تو حاصل ضرب بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ زندہ ہو۔ ضرب کے قاعدے سے کوئی سوال حل کرنے سے پہلے تعزیراتِ پاکستان ر پاکستان کے قوانین کے مطابق جرائم کی سزائیں، پڑھ لینی چاہیئے۔

شفیق الرحمان

شفیق الرحمان مقبول ترین مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے قارئین سے چند ایسے کرداروں کو متعارف کرایا ہے جن کا ذکر آتے ہی آدمی مُسکرا اُٹھتا ہے۔ ان کرداروں میں روفی عرف شیطان، مقصود گھوڑا، رضیہ، حکومت آپا اور ننّھی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی کتابوں میں، حماقتیں، مزید حماقتیں، شگوفے، کرنیں وغیرہ شامل ہیں۔

اُردو ڈائجسٹ نے شفیق الرحمان کی مزاح نگاری پر اس طرح تبصرہ کیا ہے "شفیق الرحمان کو کون نہیں جانتا، شائد وہ نہ جانتے ہوں جو ہنسنا نہیں جانتے"

ذیل کا اقتباس اُن کی کتاب شگوفے کے آخری افسانے "شیطان" سے ہے۔

"ایک روز ماسٹر صاحب نے چہل قدمی کے معنی پوچھے، کسی کو بھی نہ آئے۔ روفی اُٹھ کر بولے" دو مرتبہ بیس قدمی"

انھوں نے وضاحت چاہی، روفی بولے "جناب چہل کے معنی ہیں چالیس اور چالیس قدمی کی بجائے دو مرتبہ بیس قدمی کہیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ٹہلتے ہوئے انسان آگے جاتا ہے اور پھر واپس آجاتا ہے"

جغرافیے کے ماسٹر صاحب نے ایک مرتبہ روفی سے پوچھا "اگر تم مشرق کی طرف منہ کرکے دونوں ہاتھ پھیلا دو تو تمھارے بائیں ہاتھ پر کیا ہوگا؟" روفی نے بڑی مسمسی شکل بنا کر کہا "انگلیاں"

جب ہماری جماعت میں انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے آئے تو وہ روفی سے بہت خوش ہوئے اور انعام دے کر گئے۔ انھوں نے پوچھا "اگر پانی کو ٹھنڈا کیا جائے تو کیا بن جائے گا؟" ہم نے سوچا کہ روفی کہہ دیں گے، برف بن جائے گا، روفی نے پوچھا "کتنا ٹھنڈا کیا جائے؟"

وہ بولے۔ "بہت ٹھنڈا کیا جائے"

روفی سوچ کر بولے "تو وہ بہت ٹھنڈا ہو جائے گا" (بہت پر زور دے کر)

"اگر اور بھی ٹھنڈا کیا جائے"

"تو پھر وہ اور بھی ٹھنڈا ہو جائے گا" روفی بولے۔

" اور اگر اُسے بے حد ٹھنڈا کیا جائے "

" تو وہ بے حد ٹھنڈا ہو جائے گا " انسپکٹر صاحب مُسکرانے لگے اور پوچھا " اچھا اگر پانی کو گرم کیا جائے تب ؟ "

" تب گرم ہو جائے گا "

" نہیں، اگر ہم اسے بہت گرم کریں اور دیر تک گرم کرتے رہیں پھر ؟ "

روفی کچھ دیر تک سوچتے رہے یکا یک اُچھل کر بولے " پھر بھاپ بن جائے گی " اور انسپکٹر صاحب نے ایک عظیم الشان قہقہہ لگایا، ماسٹر صاحبان نے کوشش کی کہ اُنھیں کہیں اِدھر اُدھر لے جائیں لیکن وہ وہیں کھڑے رہے اور روفی سے بولے " بلّی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں "

" تقریباً چار "

" اور آنکھیں "

" کم از کم دو "

" اور دُمیں ؟ "

" زیادہ سے زیادہ ایک !"

" اور کان ؟ " انھوں نے پوچھا۔

" تو کیا سچ مچ آپ نے اب تک بلّی نہیں دیکھی " روفی منہ بنا کر بولے اور انسپکٹر صاحب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے "

محمّد خان

اُردو کے پہلے مزاحیہ ناول " چاکیواڑہ میں وصال " کے مصنف محمد خالد اختر لکھتے ہیں " اس فوجی کے طرزِ بیان میں ایک ایسی قدرتی کیفیت ہے، جس پر ہمارے بہترین لکھنے والے رشک کر سکتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر دل ودماغ کو مسخر کر لیتی ہے "

محمد خان تیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ بجنگ آمد، بسلامت روی اور بزم آرائیاں، ذیل کا اقتباس بزم آرائیاں کے مضمون " خیالاتِ پریشاں " سے نقل کیا گیا ہے۔

"آئیے ذرا قوّالی سُنتے چلیں، قوّالی شروع ہے اور آپ یک لخت میدانِ جنگ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ذرا دیکھئے یہ بکھرا ہوا قوالوں کا پورا کنبہ، یہ بپھرا ہوا پدر قوال، وہ لہلہاتے ہوئے دھڑ، وہ دندناتے ہوئے گلے، وہ دھاڑتا ہوا ہارمونیم، وہ چنگھاڑتا ہوا طبلہ، وہ ہنگامہ دار و گیر، وہ شورِ یوم نشور ۔۔۔ اور تمام مار دھاڑ کا صید زبوں، اقبال کی غزل کا بے یار و مددگار مصرعہ "پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن" اور آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے کوہ و دمن کو نہایت تیزی سے دس بارہ چکّر دیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آخری مرحلوں میں کوہ و دمن، دمن کو، دمن کو ہو۔بن کر رہ جاتا ہے۔ خدا جانے روحِ اقبال پر کیا گزرتی ہے، اس ضمن میں مجھ سے کہیں بہتر نقشہ میرے دوست سیّد ضمیر جعفری نے کھینچا ہے انھوں نے قوالی پر ایک مسدس لکھی ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

" تال دے کر جب کلامِ حضرتِ اقبال دیں — شعر کیا ہر لفظ کی چوکھٹ پہ چوکی ڈال دیں
شعر دیں پھر پرچہ ترکیبِ استعمال دیں — قافیوں کو دُور تک کھینچیں، ردیفیں ٹال دیں
فلسفہ تھا سرنگوں مفہوم خستہ حال تھا
شعر بچ نکلا تو یہ اقبال کا اقبال تھا"

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی عہدِ حاضر میں اردو مزاح نگاروں کے قبیلے کے سردار ہیں۔ ان کی دو کتابیں "چراغ تلے" اور "زرگزشت" ماہرینِ فن سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ایک نقّاد نے ان کی تحریروں کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے: "اس کے مزاح کی کاٹ، تری طنازی، لفظی اُلٹ پھیر اور خوش وقتی سے بالاتر ہے، ماورائے تبسم، وہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی، بصیرت اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہنے والے ادب کی پہچان ہے"۔

ذیل کا پیراگراف اُن کی کتاب "زرگزشت" کے باب "علم دریاؤ" سے لیا گیا ہے۔

"تھوڑی مسافت طے کرنے کے بعد ہمیں کیریئر پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ ذرا دیر بعد ہانپتے ہوئے کہنے لگے: "اب آپ پیچھے بیٹھے بیٹھے آرام سے پیڈل ماریے۔ میں ہینڈل چلاتا ہوں۔ ذرا احتیاط سے پیڈل ماریے گا کراچی کا ٹریفک باؤلا ہے۔" حسب الحکم ہم ان کی کمر پکڑ کے پیڈل سے زور آزمائی

کرنے لگے۔ سائیکل چلانے کے اس طریقے کا ایک نہایت باریک قانونی نکتہ انھوں نے یہ بتایا کہ پولیس ڈبل سواری کے جُرم میں دونوں میں سے کسی کا چالان نہیں کر سکتی۔ جو ہینڈل پکڑے ہوئے ہے، وہ پیڈل مارنے کا مرتکب نہیں اور جو پیڈل مار رہا ہے، اس کا بقیہ سائیکل سے کوئی قانونی تعلق نہیں اگر آپ کو مجسٹریٹ نے ایک مہینے کی بھی سزا کی تو اس کے پاؤں کے ناخن کھینچ لوں گا۔ اور پیدل علاقہ غیر میں لے جا کر پُراسرار قتل کر دوں گا۔

سائیکل کے وہ تمام فاضل پُرزے اور آرائشی تکلّفات جن کا شمار میکانکی عیّاشی میں ہو سکتا تھا، خود کو سپُردِ خاک کر چکے تھے اور دیکھنے میں اب یہ ڈھانچہ سائیکل کا ایکسرے معلوم ہوتا تھا۔ ہینڈل پر نہ جانے کیسے ایک آئینہ لگا رہ گیا تھا۔ جس کا مصرف بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ سوار کو پتہ چلتا رہے کہ پچھلا پہیہ ابھی تک سائیکل میں لگا ہوا ہے یا نہیں۔ پوچھا: "اس میں تیل کیوں نہیں دیتے؟"
بولے: "تیل دینے میں جھنجھٹ یہ ہے کہ پھر گھنٹی لگانی پڑے گی۔"

اسی باب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس میں ایک خان صاحب یوسفی صاحب کو صوبہ سرحد اور دوسرے علاقوں کی روایات کا فرق سمجھا رہے ہیں۔

"آپ لوگ خوش ہوتے ہیں تو تقریبات اور مشاعرے منعقد کرواتے ہیں، آتشبازی چھوڑتے ہیں، لیکن ہم ہر جذبے کی ترجمانی بندوق سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں فلم کا کوئی گانا یا مکالمہ پسند آئے تو ناظرین ہاتمکین اس کی داد پستول سے دیتے ہیں۔ ڈش، ڈش، ڈشاؤں! ہال میں جتنے زیادہ پستول چلیں اُتنا ہی مالک خوش ہوتا ہے کہ فلم ہٹ ہو گئی۔"

"گولی چھت سے ٹکرا کر اُلٹی تماشائیوں کو نہیں لگتی؟"

"چھت ایسی بناتے ہیں کہ بارش اور گولی کو گزرنے میں تکلیف نہ ہو۔"

سیّد ضمیر جعفری

معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ ضمیریات، اُڑتے ہوئے خاکے، اور گوالے کالے سپاہی کے علاوہ اُن کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مشاعروں میں ترنم سے کلام سناتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔

سیّد ضمیر جعفری بھی ادیبوں کے اس خاندان کے ایک ممتاز فرد ہیں جن کا تعلق پاکستان

کی بہادر افواج سے ہے۔ ضمیر جعفری مسلح افواج کے رسالے ہلال کے ایڈیٹر رہنے کے علاوہ متعدد ادبی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ رہے۔ روزنامہ مشرق میں نظر غبارے کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا جو چل نہ سکا چنانچہ اب ضمیریات کے عنوان سے مزاحیہ نظمیں لکھتے ہیں۔

ذیل میں ان کی کتاب اُڑتے ہوئے خاکے کے مضمون "سنگاپور کا میجر حسرت" سے ایک اقتباس دیا جارہا ہے۔

"ایک مرتبہ مجھے بھی کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا، پہلے روز مرشد کو کالم دکھایا۔ کالم پر نگاہ جماتے ہی ایک مبہم سی ہونہہ کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکائے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آبیٹھا دوسرے روز پوچھتے ہیں "مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا آج کے اخبار میں تو نہیں ہے" میں نے عرض کیا۔ "پھاڑ کر پھینک دیا تھا"

فرمایا "دے دیتے کیا حرج تھا" اور لغویات (فضول باتیں) بھی تو چھپتی رہتی ہیں"۔

خامہ بگوش (مشفق خواجہ)

مشفق خواجہ بہت سینئر دانشور اور ادیب ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں چند سال پہلے روزنامہ جسارت میں خامہ بگوش اور غریبِ شہر کے قلمی نام سے دو کالم لکھنے شروع کیے۔ ان کے کالموں کا مستقل عنوان "سخن در سخن" اور "اندیشۂ شہر" تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد "اندیشہ شہر" لکھنا تو بند کر دیا۔ مگر سخن در سخن آج بھی لکھ رہے ہیں۔ یہ کالم آج کل ہفت روزہ تکبیر میں شائع ہو رہا ہے
ذیل میں ان کے ایک کالم سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔

"رشوت سے انکار کر کے عاقبت تو سنواری جا سکتی ہے، لیکن دُنیا خراب ہو جاتی ہے۔ موصوف نے جس طرح دس بارہ ہزار روپے خرچ کر کے موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ اسی طرح کچھ روپے پولیس والوں پر بھی خرچ کر دیتے تو وہ حوالات میں جانے سے بچ سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بسمل صاحب کو عزت سے زیادہ روپیہ۔۔۔ عزیز ہے۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ آئندہ جب بھی موٹر سائیکل پر سوار ہوں تو جیب میں اتنی رقم ضرور رکھیں جس سے "راستے کی مشکلات" پر قابو پایا جا سکے۔ بسمل صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے ملک میں رشوت کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہاں تک کہ موٹر سائیکل بھی نہیں چل سکتی"

اظہر نیاز

نیا سلسلے وار ناول

قسط نمبر ۱

دھماکہ

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ اِردگرد کی عمارتیں زمین بوس ہوگئیں ۔ چیخ و پکار کا یہ عالم تھا کہ بچے، بوڑھے عورتیں، جوان ملبے کے نیچے دبے آخری ہچکیاں لے رہے تھے، سسک رہے تھے، چاروں طرف انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں ۔ ان کے جلنے کی بُو ہر طرف پھیل گئی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قیامت آگئی ہے کافی دیر کے بعد اِردگرد کے لوگوں کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ دھماکے کی جگہ کی طرف بھاگے اور انھوں نے گری ہوئی عمارتوں کے ملبے سے لوگوں کو نکالنا شروع کیا ۔ کہیں سے ہاتھ پاؤں نکل رہے تھے اور کہیں سے صرف ایسے جسم نکل رہے تھے جن کے سر نہیں تھے ۔ کسی جگہ سے صرف سر نکلا باقی جسم کا کوئی پتا نہ تھا لوگ زار و قطار رو رہے تھے اور ملبے سے انسانوں کو نکال رہے تھے ۔ پولیس اور فوج بھی پہنچ چکی تھی اور دیگر امدادی ادارے بھی اپنے لوگوں اور مددگاروں کو لے کر جائے حادثہ پر پہنچ گئے اور امدادی پارٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا ۔ زخمیوں کو ایمبولینس میں ڈال کر

اسپتال روانہ کر دیا جاتا۔ جب معلوم ہوا کہ نزدیک ترین اسپتال میں جگہ نہیں رہی تو شہر کے دوسرے اسپتالوں میں زخمیوں کو بھیجا جانے لگا۔ لگتا تھا کہ آج شہر کے سارے اسپتال بھر جائیں گے۔

کئی لاشیں اونچی عمارتوں کی چھتوں سے ملیں، دھماکہ اتنا شدید تھا کہ انسانی جسم اُڑ کر دوسری چھتوں پر جا کر گرے تھے۔ ان کا پتہ نہ چلتا لیکن دوسرے دن دیکھا گیا کہ گدھ اونچی عمارتوں کی چھتوں پر کچھ کھا رہے ہیں۔ لوگوں نے جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ انسانی لاشیں ہیں فوراً پولیس کو آگاہ کیا گیا اور اس طرح قریب قریب کی تمام چھتوں کو جا کر دیکھا گیا اور کئی عمارتوں کی چھتوں سے انسانی اعضا اُٹھا کر لائے گئے۔ اس حادثے میں دو سو سے زائد انسان مارے گئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن خون آلود سُرخیوں اور تباہ شدہ مکانات اور ملبے کے ڈھیر کے دردناک منظر پیش کر رہے تھے۔ سیاست دان، حکّام، اعلیٰ سرکاری افسران بھیگی ہوئی آنکھوں سے صبر و سکون کی تلقین کر رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ جلد ملک دشمن تخریب کاروں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔

ذیشان کئی دنوں سے سخت پریشان تھا۔ پورا ملک دھماکوں کی زد میں تھا۔ کبھی پشاور، کبھی راولپنڈی اور کبھی کوئٹہ، بڑے بڑے شہروں میں سے شاید ہی کوئی شہر بچا ہو۔ جہاں دھماکہ نہ ہُوا ہو۔ پشاور میں تو آئے دن دھماکے ہوتے رہتے تھے وہ رات نو بجے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور دُعا کرتا رہتا یا اللہ! آج دھماکے کی کوئی خبر نہ ہو اور پھر اپنے ابو کے ساتھ بحث میں اُلجھ جاتا کہ یہ دھماکے کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تخریب کار کیوں نہیں پکڑے جاتے؟

ذیشان کے ابّو پولیس کے اعلیٰ افسر تھے۔ انھوں نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کرنے میں نہایت جاں فشانی سے کام لیا تھا اور ان کی بہادری کی شہرت پورے مُلک میں تھی۔ سندھ کے جنگلوں میں جو ڈاکو چھُپے ہوئے تھے آئے دن لوگوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے اور پھر ان کے عوض بھاری رقمیں وصول کرتے تھے۔ ان ڈاکوؤں کا صفایا ذیشان کے ابّو کا کارنامہ تھا۔ ذیشان کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دن اس کے ابّو نے آکر ذیشان سے کہا تھا "بیٹے میں چاہتا ہوں کہ ڈاکو تمھیں اغوا کر لیں" اور پھر وہی ہُوا کہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ذیشان کی ٹریننگ کی گئی اور ڈاکوؤں نے اُسے اغوا کر لیا۔ اور ذیشان کی مدد سے پولیس ڈاکوؤں کے اڈّے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔

ذیشان کے ابّو کا نام تو عمران تھا لیکن وہ مسٹر آغا کے نام سے زیادہ مشہور تھے اور وہ حال ہی میں کراچی سے ٹرانسفر ہو کر راولپنڈی پہنچے تھے اور یہاں وہ پولیس اکیڈمی میں سینئر انسٹرکٹر کے طور پر تعینات ہوئے تھے چونکہ وہ نہایت تجربہ کار پولیس آفیسر تھے۔ اس لیے حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں، تاکہ وہ نئے پولیس افسروں کو تربیت دے سکیں۔

ایک دن پولیس کے چند اعلیٰ افسران آغا صاحب کے گھر آئے تو ذیشان کو پتہ چلا کہ وہ تخریب کاروں کی وجہ سے پریشان ہیں لیکن ڈور کچھ اس طرح اُلجھ گئی ہے کہ انھیں سمجھ میں نہیں آرہا اور وہ آغا صاحب سے مشورے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے چند تخریب کاروں کو پکڑ رکھا تھا لیکن اِدھر اُدھر سے سفارشیں آ رہی تھیں کہ یہ تخریب کار نہیں ہیں۔ معزّزین و عمائدین ہیں اور انھیں چھوڑ دیا جائے۔

"آپ کا کیا خیال ہے ؟" آغا صاحب نے پولیس افسروں سے پوچھا۔ "وہ لوگ جو آپ نے گرفتار کیے ہیں، بے گناہ ہیں یا تخریب کار ؟"

"سر ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ابھی تک ہم نے تفتیش شروع نہیں کی لیکن ہم نے انھیں مشکوک سرگرمیوں میں ملوّث پا کر ہی پکڑا ہے۔"

"بات یہی ہے۔" آغا صاحب بولے۔ "ہم کسی بھی گرفتاری کے بعد سفارشوں اور ٹیلی فونوں کا انتظار کرنے لگتے ہیں اور جوں جوں دیر ہوتی جاتی ہے انصاف میں بھی تاخیر ہوتی جاتی ہے۔ گرفتاری کے بعد پہلا کام تفتیش ہونا چاہیے تاکہ فوری طور پر پتہ لگ سکے کہ ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی اور اگر خدانخواستہ غلطی ہو گئی ہو تو اس بے گناہ کو فوری طور پر چھوٹنا چاہیے۔ اُسے زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں رہنا چاہیئے اور پھر دیر ہونے سے سفارشیں، پرچیاں، ٹیلیفون ہماری راہ میں ایک رکاوٹ بنتے ہیں اور پھر کسی کو بھی گرفتار کرنے سے پہلے ہمیں تمام ثبوت اپنے ہاتھ میں رکھنے چاہئیں تاکہ ہم کسی سفارش کے آگے کچھ دیر تو ٹھہر سکیں۔"

ذیشان چھُپ کر ساری باتیں سُن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر تخریب کار پکڑے گئے۔ اب میرے ابّو انھیں کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔

● صبح جب وہ سو کر اُٹھا تو ناشتے کی میز پر اپنے ابّو سے کہنے لگا:

"ابّو رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ اخبار میں بہت بڑی خبر لگی ہے کہ تخریب کار پکڑے گئے اور ساتھ ہی آپ کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔" اتنا کہہ کر اُس نے ابّو کی طرف دیکھا جو سر جُھکائے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔

"ابّو! خواب سچّے بھی ہوتے ہیں ناں ؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے خواب سچّے بھی ہوتے ہیں۔"

"ابّو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس خواب کو سچ کر دکھائیں۔" ابّو نے پہلی بار غور سے ذیشان کی طرف دیکھا۔ وہ کئی روز سے ذہنی طور پر پریشان تھے لیکن بیٹے کے اس جُملے نے انھیں بڑا سہارا دیا۔

"ابّو! رات انکل انسپکٹر شعیب کہہ رہے تھے کہ انھوں نے تخریب کار پکڑے ہیں۔" مسلسل باتیں کرتے دیکھ کر

ذیشان کی امی بولیں ۔
"بیٹے ! ابّو کو ناشتہ کرنے دو اور خود بھی خاموشی سے ناشتہ کرو یہ کیا تم صبح و شام تخریب کاروں کے پیچھے پڑے رہتے ہو"
آغا صاحب نے مُسکرا کر کہا "آخر پولیس آفیسر کا بیٹا ہے" ذیشان کو یہ سُن کر حوصلہ ہوا فوراً بولا "تو پھر ابّو میں بھی آپ کے ساتھ تخریب کاروں کو دیکھنے تھانے چلوں گا"
آغا صاحب کو تھانے جانا تو تھا ہی کہ لاک اپ میں اُن مشکوک لوگوں کو دیکھ سکیں ذیشان کو بھی ساتھ لے لیا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ ذیشان تخریب کاروں کے سلسلے میں بہت جذباتی ہے اور وہ کسی صورت گھر پر رُکنے کے لیے تیار نہ ہو گا۔
جب ذیشان اور آغا صاحب تھانے پہنچے تو تھانہ انچارج انسپکٹر احمد نے تخریب کاروں کو لاک اپ سے نکال کر غالباً پوچھ گچھ کے لیے اپنے سامنے بٹھایا ہوا تھا ۔
ذیشان نے ڈرتے ڈرتے ان دونوں کو غور سے دیکھا ۔ ایک آدمی کی بلّی آنکھیں چہرے کے لحاظ سے چھوٹی تھیں ۔ بھویں نمایاں، مونچھیں تھوہر کے کانٹوں کی طرح اور سر کے بال سنہرے تھے ۔ دوسرے آدمی کے حلیے میں کوئی خاص بات ایسی نہ تھی جسے نوٹ کیا جا سکے ۔ وہ عام آدمیوں کی طرح کا ایک آدمی تھا ۔ آغا صاحب نے انسپکٹر احمد سے پوچھا ۔
"آپ نے ان کا بیان لے لیا ہے ۔ کوئی خاص بات معلوم ہوئی ؟"
"نو سر !"
"آپ کے خیال میں یہ دونوں بے گناہ ہیں ؟" آغا صاحب نے پوچھا ۔
"یس سر !"
"تو پھر یہ اب تک تھانے میں کیوں بیٹھے ہوئے ہیں ۔"
"سر ان کی گاڑی آ رہی ہے ۔ انتظار میں بیٹھے ہیں"
"رائٹ !" آغا صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا اور ذیشان کو ساتھ لیے تھانے سے باہر نکل آئے ۔
ذیشان پہلے بھی کئی مرتبہ چوروں اور ڈاکوؤں کو دیکھنے کے لیے تھانے آ چکا تھا اس نے تعجّب سے پوچھا :
"ابّو ! آپ نے انسپکٹر صاحب سے یہ نہیں پوچھا کہ اُنھوں نے دونوں کے ہاتھوں کے پرنٹ اُتار لیے ہیں یا نہیں؟"
"ذیشان بیٹے ! یہ اس کی ڈیوٹی ہے ۔ آخر وہ ایک ذمّہ دار افسر ہے ۔ اسے اپنے کام کا علم ہونا چاہیئے" آغا صاحب

نے نرم لہجے میں کہا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد ذیشان اس طرح سر ہلانے لگا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہو۔

"ابو مجھے لگ رہا ہے کہ ان میں سے ایک آدمی ضرور مشکوک ہے۔ اس کی بلّی آنکھیں اور سنہرے بال کتنے خوفناک تھے اور وہ کیسے دیکھ رہا تھا۔" آغا صاحب نے ذیشان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ کسی گہری سوچ میں گُم تھے۔ انھوں نے ذیشان کو گھر اُتارا اور اکیڈمی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ذیشان کمرے میں داخل ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار بلّی آنکھوں والے آدمی کا چہرہ ناچ رہا تھا۔ انسپکٹر نے اُسے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اُسے انسپکٹر سے بات کرنی چاہیے۔ امّی شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی تھیں۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ گھر کی ڈائریکٹری سے تھانے کا نمبر تلاش کیا اور ڈائل گھمانے لگا۔

"انسپکٹر احمد۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"میں ذیشان بول رہا ہوں انکل!"

"ہاں کہو بیٹے۔ کیا بات ہے؟"

"انکل! آپ نے اس بلّی جیسی آنکھوں والے آدمی کو کیوں چھوڑ دیا؟" دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی جیسے انسپکٹر احمد یہ سوال سُن کے ایک لمحے کے لیے چکرا گیا ہو۔

"اس لیے بیٹے کہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔" انسپکٹر احمد نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"انکل! مجھے تو وہ کوئی غیر مُلکی لگتا تھا۔" ذیشان نے اعتماد سے کہا۔

"بیٹے اس کے پاس شناختی کارڈ تھا اور جس کے پاس شناختی کارڈ ہو اُسے غیر مُلکی کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سفارش بھی ایک اہم شخصیت نے کی تھی۔ اور پھر ذیشان بیٹے! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ پڑھا کرو۔ بڑوں کے معاملے میں دخل دینا اچھی بات نہیں۔" ذیشان نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

● ذیشان اپنی فری اسٹائل سائیکل پر شام کی سیر کو نکلا تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تخریب کار کون ہیں اور کیا یہ پکڑے نہیں جا سکتے اور جب تک میں بڑا ہوں گا، پولیس کا افسر بنوں گا یہ لوگ ایسے ہی دندناتے پھریں گے۔ میں چھوٹا ہوں، کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اس قسم کی باتیں سوچتے ہوئے اپنے گھر کے قریب ہی شاپنگ سنٹر کی ایک دُکان پر رُک گیا اور آئس کریم لے کر کھانے لگا۔ اتنے میں ذیشان نے دیکھا کہ وہ بلّی آنکھوں والا ایک کار میں آ رہا ہے۔ ذیشان نے فوری طور پر اپنی سائیکل سنبھالی اور کار کے پیچھے ہو لیا۔ کار آہستہ آہستہ پارکنگ کے لیے جگہ ڈھونڈھ رہی تھی اور آخر کار ایک جگہ رُک گئی۔ ذیشان نے جیب سے پنسل اور ڈائری نکال کر کار کا نمبر نوٹ کر لیا۔ اور پھر سائیکل ایک سمت کھڑی کر کے

اس آدمی کے پیچھے چلنے لگا کہ دیکھیں وہ کہاں جاتا ہے۔ اس آدمی نے ایک سپر اسٹور سے پرفیوم خریدا اور دوبارہ کار میں بیٹھ کر چلا گیا اور ذیشان سوچنے لگا کہ اچھا وہ خوشبو جو اُسے تھانے میں اُس آدمی کے پاس سے آ رہی تھی وہ یہی پرفیوم ہوگا "بلیک مین"۔ ذیشان سوچ کر ہنسا کہ آدمی تو گورا ہے لیکن خوشبو "بلیک مین" استعمال کرتا ہے۔

ذیشان نے سائیکل سنبھالی اور گھر کا رستہ لیا۔ ابھی وہ شاپنگ سنٹر سے مین روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ اس کی سائیکل سے ایک موٹر سائیکل والا آکر لگا۔ ٹکر کوئی خاص نہ تھی لیکن وہ دونوں گر پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ ذیشان اُٹھتا موٹر سائیکل والے نے اپنی موٹر سائیکل چھوڑ کر ذیشان کو اُٹھایا اور بڑے معذرت کے سے انداز میں معافی مانگنے لگا۔ "غلطی میری ہی تھی۔ میں نے تمھیں دیکھا نہیں"۔ ذیشان کے کپڑے درست کرنے کے بعد اور یہ پوچھنے کے بعد کہ اُسے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ اُس شخص نے اپنی موٹر سائیکل سنبھالی اور مُسکراتے ہوئے چلا گیا۔ ذیشان کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن وہ گھر پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ اُس کی جیب سے اُس کی ڈائری غائب ہے اور ذیشان سوچنے لگا کہ اس کی ڈائری موٹر سائیکل والے نے نکال لی ہے یا وہ اُس جگہ گر گئی جہاں ٹکر ہوئی تھی۔ یکدم ذیشان ایک بات سوچ کر حیران رہ گیا۔ موٹر سائیکل والا آدمی وہی تھا جو تھانے میں بلی آنکھوں والے آدمی کے ساتھ تھا۔ ایک عام آدمی۔

باقی آئندہ

حق اسکواڈ

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلہ تحریر اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

قیمت صرف ۱۰ روپے

- [illegible]ن سے برسرِ پیکار ۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے۔
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات۔
- خوبصورت اسکیچز — بہترین کتابت — اعلیٰ طباعت
- حسین سرورق اور ۱۰۰ سے زائد صفحات۔
- حق اسکواڈ کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا دیں۔
- دوکاندار/ ایجنٹ حضرات آرڈر سے مطلع کریں۔

پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

لطف - لذّت - ذائقہ
ہوئیسٹ®
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش - ہوئیسٹ کی تلاش
اور سب ٹھنڈا ٹھنڈا
450 GRAMS
HOEST DROPS
delicious
cool
refreshing
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"
بالکل ایسے ہی
گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احساس
کا
ایک حسین نام
نورس
قومی مشروب
اب عوامی پیک میں بھی دستیاب ہے
Naurus
نورس
Naurus (Pvt) Limited

کارٹون کہانی

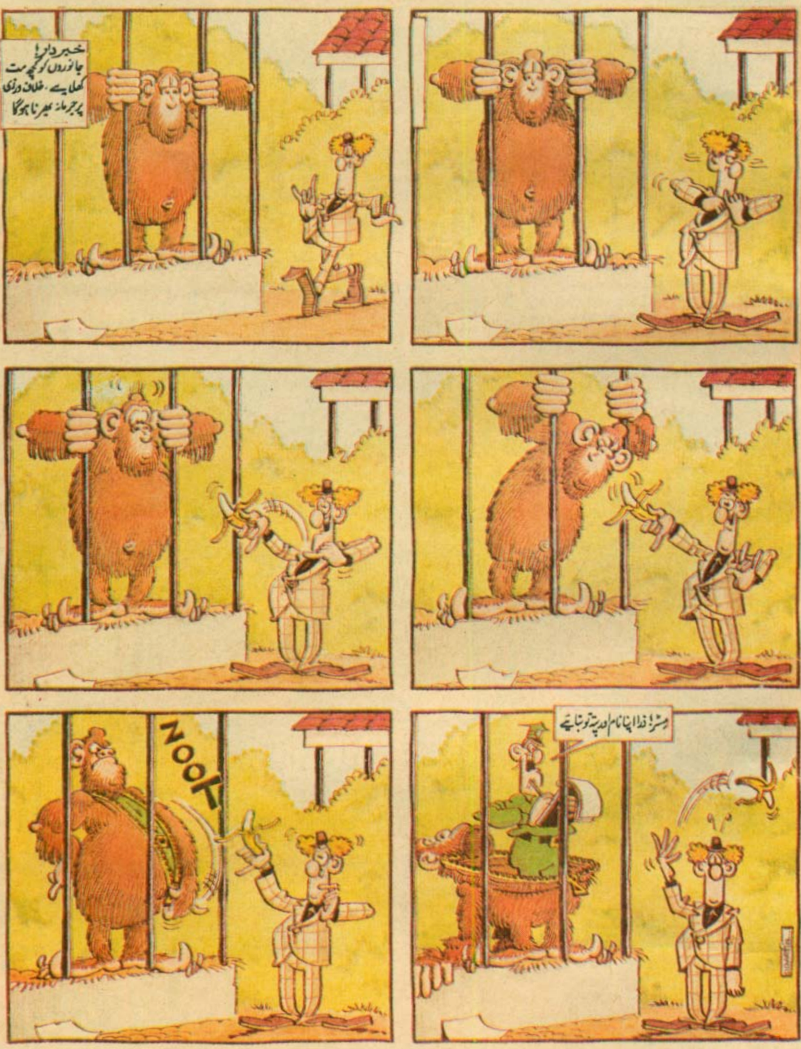

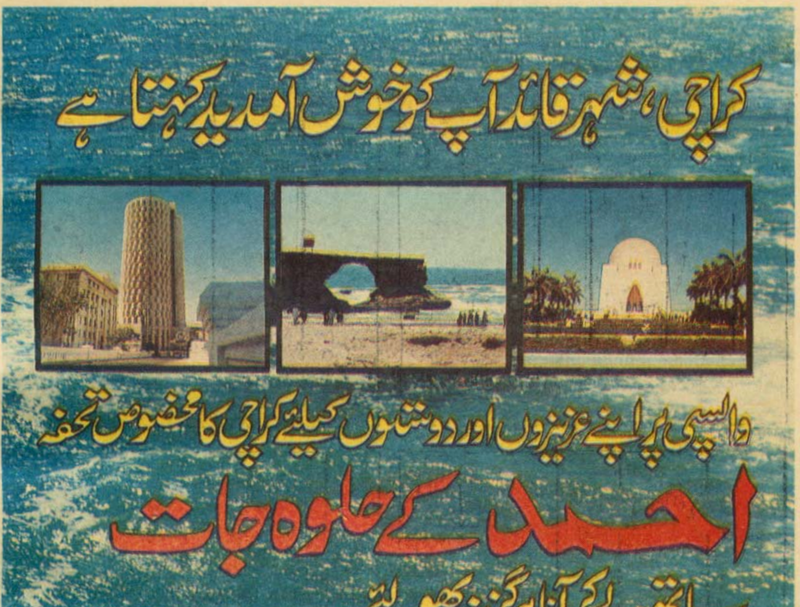
کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
فریش ویل
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA
MASS

قالین کی صفائی میں سب سے اعلیٰ

ٹپ ٹاپ

ڈرائی کلینرز

فون : ۴۱۴۴۶۴
۴۳۷۱۴۳
علامہ اقبال روڈ
پی ای سی ایچ ایس

حسن اپارٹمنٹس
۴۴۰۰۷۴

ڈیفنس سوسائٹی
۵۴۲۱۶۳

کلفٹن
۵۳۰۳۶۹

ناظم آباد
۶۱۳۸۱۶

ایف، عادل

اِدھر اُدھر سے

ففٹی ففٹی

منّے کے ابّا سرکاری دورے پر سکرنڈ جانے والے تھے۔ دورہ چونکہ کافی دنوں کے لئے تھا اس لیے تیاریاں زوروں پر تھیں اور گھر کے تقریباً تمام لوگ ہی ان میں مصروف تھے اچانک امّی کو یاد آیا کہ پُرانے سلیپر ٹوٹنے والے ہیں اس لیے نئے منگوا لینے چاہئیں۔ سب لوگوں کی مصروفیت کے سبب نظرِ انتخاب مُنّے میاں پر پڑی۔ امّی نے اُنھیں پچاس روپے دے کر کہا جلدی سے جا کر ۱۰ نمبر کا سلیپر لے آؤ۔ مُنّے میاں کافی دکانوں میں گھومے۔ مگر ۱۰ نمبر کے سلیپر نہ ملے۔ معاملہ چونکہ جلدی کا تھا، اس لیے مُنّے میاں نے ذرا دماغ کو زحمت دی، جس نے فوراً ہی ایک حل پیش کر دیا۔

گھر واپسی پر مُنّے میاں کے ہاتھ میں ۵، ۵، نمبر کے دو جوڑی سلیپر تھے۔

مگر پنسلیں کہاں گئیں؟

مس نے بچوں سے کہا "میرے پاس پنسل نہیں ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو" سب نے ترجمہ کر کے مس کو دکھا دیا۔ مگر علی نے ترجمہ نہیں کیا۔ وہ منہ پھلا کر بیٹھے رہے۔ مس نے ذرا ناراضگی سے دوبارہ کہا "فوراً ترجمہ کرو"

علی نے ترجمہ کیا "I ain 't got a no PENCIL"

مس مزید ناراض ہوئیں اور فوراً تصحیح کی "I HAVEN'T A PENCIL" (آئی ہیونا ٹ اے پینسل)

"بات سمجھ میں آئی؟" مس نے پوچھا۔

علی نے انکار میں گردن ہلادی۔

مس پھر سمجھانے لگیں "یہ اسی طرح ہے، آئی ہیوناٹ اے پینسل۔ اسی طرح یو ہیوناٹ اے پینسل

وی ہیوناٹ اے پینسل، دے ہیوناٹ اے پینسل۔ کیا بات سمجھ میں آئی؟"

علی نے اب بھی انکار کیا اور کہا "مس میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہم سب کی پنسلیں آخر گئیں کہاں؟"

خطرہ اور پھرتی

ہارون اور قیوم میٹھے باتیں بنا رہے تھے کہ اچانک ہارون نے دعویٰ کیا "جب خطرے کی کوئی بات ہوتی ہے، میں فوراً محتاط ہو جاتا ہوں۔ بس مجھے اپنے آپ ہی پتا چل جاتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے"۔

"اچھا!" قیوم نے حیرت سے کہا "لیکن اس معاملے میں تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔

"وہ کیسے؟" ہارون نے سوال کیا

"وہ ایسے کہ میں نہ صرف خطرے کی بُو سونگھ لیتا ہوں، بلکہ میری پھرتی اور چابکدستی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ دس سیکنڈ میں سوگز کی ریس کر لیتا ہوں اور کبھی پکڑ میں نہیں آتا"۔

علاج

مُنّے کی آپا گزشتہ کئی روز سے منہ میں تکلیف کے باعث پریشان تھیں۔ بہت علاج کرایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آج کلینک جانے کے لیے مُنّے کی منت سماجت کرنے لگیں کہ وہ ان کے ساتھ چلیں منّے نے اُکتا کر پوچھا "آپا! آخر آپ کو تکلیف کیا ہے۔ آپ کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آتی"۔

"مُنّے! تم نہیں سمجھو گے" آپا نے مُنّے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"آخر کچھ پتا بھی تو چلے" مُنّے نے پھر سوال کیا۔

"مُنّے جی! بس باتیں کرتے کرتے منہ میں درد ہونے لگتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر بھی اس کا علاج نہیں کر پایا! اس نئے کلینک کے ڈاکٹر کی تعریف سُنی ہے۔ چلو بھیا، دیر ہو رہی ہے" آپا نے پچکار کر کہا۔

منّے نے بے ساختہ جواب دیا "اس کا علاج کیا مشکل ہے۔ ہفتہ بھر منہ کو آرام دیجیے۔ برسوں سے مسلسل حرکت میں ہے"۔

پہچان

کلری جھیل کے کنارے اسکول کے بچّے پکنک منا رہے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد باتوں کا دور چلا۔ ایک کلاس کے مانیٹر نے رُعب جھاڑتے ہوئے دوسرے بچوں سے پوچھا "بہت سارے اُلوؤں کے درمیان ایک نوجوان اُلو کی شناخت کس طرح کی جا سکے گی؟"

بچّے سوچنے لگے۔ پیچھے سے کوئی زور سے بولا "دانتوں کے ذریعے سے"

مانیٹر نے فوراً جواب دیا "وہ کیسے احمق؟ اُلوؤں کے تو دانت ہی نہیں ہوتے"

"مگر تمھارے تو ہیں نا!" وہ آواز دوبارہ آئی!

رانگ نمبر

داؤد کو اسکول میں دیر ہو گئی تھی، اس لیے دادی جان بہت پریشان تھیں اور بار بار اسکول فون کر رہی تھیں مگر نمبر تھا کہ لگ کے نہیں دے رہا تھا۔ پندرھویں بار جب کسی نے فون اُٹھایا تو دادی جان تڑاخ سے بولیں "مجھے یقین ہے کہ یہ بھی رانگ نمبر ہوگا"

نامعلوم آدمی نے بڑے سکون سے پوچھا "مگر محترمہ! آپ کو کیسے یقین ہے کہ یہ رانگ نمبر ہوگا"

"میں نے تم سے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے" دادی جان نے سادگی سے جواب دیا۔

آرام

ڈاکٹر اچانک مریض کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت مریض کے چھ سات بچّے کمرے میں اُودھم مچا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا حال ہے؟"

مریض نے کمزور سی آواز میں بتایا کہ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے مریض سے کہا "دراصل اِس مرض میں مریض کو دوا سے زیادہ آرام و سکون اور خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے آپ براہِ کرم اپنی چھٹی منسوخ کرا کے دوبارہ دفتر چلے جائیں"

میں نہیں جاتا

کچھوؤں کا ایک خاندان ویک اینڈ ڈنر کے لیے کسی ریستوران میں پہنچا تمام لوگ جب کھانا کھا چکے اور آئس کریم کا دور شروع ہوا تو سب سے بڑے کچھوے کو خیال آیا کہ وہ آتے ہوئے جلدی میں گھر کو تالا لگانا بھول گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا "جاؤ بیٹا! جلدی سے تالا لگا کر آجاؤ"

بچے نے انکار کیا اور کہا "اگر میں چلا گیا تو آپ لوگ آئس کریم ختم کر دیں گے اس لیے میں نہیں جاتا"

سب لوگوں نے وعدہ کیا کہ آئس کریم تمھاری واپسی کے بعد شروع کی جائے گی اس شرط پر بچّہ جانے کو تیار ہو گیا۔ بچّہ چلا گیا تو سب لوگ اس کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ایک دن، دو دن، تین دن بالآخر ہفتہ گزر گیا۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب بہت دن گزر گئے ہیں

بچہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس لیے آئس کریم کھالی جائے۔ ابھی ان لوگوں نے اپنے ہاتھ آئس کریم کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ بچے نے روتے ہوئے ریستوران کے دروازے کے پیچھے سے اندر جھانکا۔ سب لوگ اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

"میں بھی نہیں جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ لوگ میرے بعد آئس کریم کھانا شروع کر دیں گے۔" بچے نے روتے ہوئے کہا۔

وجۂ فروخت

ایک ادارے میں لڑکوں کو سیلز مین شپ کی تربیت دی جاتی تھی۔ انسٹرکٹر نے تمام لڑکوں کو بیس بیس میگزین دے کر انھیں دوروز میں فروخت کرنے کی ہدایت کی۔ ایک لڑکے نے دوسرے روز آکر فخر سے بتایا کہ اُس نے پہلے ہی روز تمام کے تمام میگزین فروخت کر ڈالے۔

انسٹرکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لڑکے کو شاباش دی۔ لڑکے نے پھولے نہ سماتے ہوئے انکشاف کیا کہ اس نے سارے میگزین ایک ہی گھر میں فروخت کیے ہیں۔

"وہ کیسے؟" انسٹرکٹر اور ساتھیوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ان کے کتے نے مجھے کاٹ لیا تھا۔" لڑکے نے جواب دیا۔

بستر

امتیاز اسکاؤٹ کیمپ میں شرکت کے بعد گھر لوٹا تو امی نے پیار سے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور کہا: "دیکھو تو میرا بچہ ہفتہ بھر میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں نگوڑوں نے بچوں کو آرام کرنے کا موقع بھی دیا یا نہیں۔" پھر امتیاز سے پوچھنے لگیں: "بیٹا تمھارا بستر کیسا تھا، جہاں تم سوئے تھے؟"

"بستر؟" امتیاز نے سوچتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے، مجھے یاد نہیں۔ اس لیے کہ میں تو اس پر زیادہ تر سویا ہی رہا۔ میں نے خیال ہی نہیں کیا کہ وہ کیسا تھا۔"

مُردے

دلدلی علاقے میں فوجی مشقیں ہو رہی تھیں۔ نشانہ بازی کے سلسلے میں چند جوانوں کو فرضی طور پر مُردہ قرار دیا گیا۔ اتنے میں مُردہ جوانوں والی پارٹی کی ایک گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی۔ جس سے آپریشن متاثر ہونے لگا۔ اس پر افسر نے مُردہ قرار دیے گئے جوانوں سے کہا: "تم لوگ گاڑی نکالنے میں مدد کرو۔"

ان میں سے ایک نے جواب دیا: "سر! ہمیں مُردہ قرار دے دیا گیا ہے جب تک ہماری ڈیوٹی

تبدیل نہیں کی جاتی، ہم کچھ نہیں کر سکتے"۔
افسر سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر کے بعد دوسرے جوانوں سے کہنے لگا "دو لاشوں کو گھسیٹ کر پہیوں کے نیچے ڈال کر گاڑی نکالنے کی کوشش کرو"۔

وجہ

مُنّا روتے روتے ڈرائنگ روم سے باہر نکلا تو امّی نے پچکارتے ہوئے منّے سے رونے کی وجہ پوچھی، منّے نے بتایا کہ ابو تصویر ٹانگنے کے لیے کیل ٹھونک رہے تھے کہ ہتھوڑی ان کے ہاتھ پر لگ گئی۔
"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے"! امّی نے کہا۔ "تمہارے ابو جتنے بڑے آدمی کے لیے یہ چوٹ ایسی نہیں کہ تم رونے لگو اس بات پر تو ہنسنا چاہیئے"۔
"امّی! میں ہنسا ہی تو تھا"۔ منّے نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

کتابیں

نینا امّی کے ساتھ پہلی مرتبہ انکل کے گھر گئیں۔ انکل کی بیٹی ندا نینا کو اپنا کمرہ دکھانے لگی۔ نینا کو ندا کے شیلف میں بہت سی کتابیں دیکھ کر، بڑی حیرت ہوئی وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ "ہمیں بھی اپنے اسکول کی لائبریری سے کتابیں تو ملتی ہیں مگر ہم انھیں واپس کر دیتے ہیں"۔

باقی کا رونا

امّی اور دادی جان میں لڑائی ختم ہوئے پندرہ منٹ گزر گئے تھے اور امّی اس وقت بیٹھی رو رہی تھیں۔ منّی انتظار کر رہی تھی، امّی رونا بند کریں اور وہ کمرے میں جا کر سوئیں۔ جب امّی کا رونا کسی طرح بند نہ ہوا تو منّی کہنے لگی۔
"امّی! باقی رونا کمرے میں جا کر پورا کریں۔ مجھے نیند آ رہی ہے"۔

!! یہ بچی کتنی پیاری ہے
اُف !!
تمہیں نظر نہیں آتا! میں لڑکی نہیں ہوں ۔
BAM
آج کل لڑکے اور لڑکیاں سبھی لمبے بال رکھتے ہیں بھلا میں کیسے پہچانوں کون لڑکا اور کون لڑکی ہے ؟
پہلے میں بھی لڑکے اور لڑکی میں فرق نہیں کر سکتا تھا مگر اب یہ فرق بتا سکتا ہوں ۔
لڑکے پیٹ میں گھونسا مارتے ہیں اور لڑکیاں بال نوچتی ہیں ۔

طلحہ سلیم

بندر جی نے ڈرائنگ سیکھی

بندر جی نے ڈرائنگ سیکھی
بیٹھے گدھا بنانے
آرٹ کے ناقد اُلّو بھائی
لگے مذاق اُڑانے

بولے مسٹر نقش بنانا
سیکھو کسی گُرو سے
تم نے جو خاکہ کھینچا ہے
ہے وہ غلط شروع سے

کان ذرا چھوٹے چھوٹے ہیں
گردن بہت بڑی ہے
آنکھیں رس گُلّا لگتی ہیں
ناک سپاٹ پڑی ہے

صحیح کہوں تو ہاتھ تمہارا
اب تک نہیں سدھا ہے
کلاکار کی دُم بنتے ہو
بنتا نہیں گدھا ہے

(ہندی سے ماخوذ)

نازیہ رمضان

ڈاکٹر لاغر اور وڈیو بُجار

ساتھیو! آج ہم نے "آنکھ مچولی کلینک" میں دو ڈاکٹر صاحبان کو مدعو کیا ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں ہر شخص کسی نہ کسی بیماری اور پریشانی میں مُبتلا ہے لہٰذا ہم نے چند مشہور اور عام بیماریوں کے علاج اور ان سے بچاؤ کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحبان کو زحمت دی ہے جو صحت مند زندگی گزارنے کے مفید گُر بتائیں گے۔

ہمارے پہلے مہمان ہیں ڈاکٹر بیمار الدین لاغر صاحب، ایم ڈی بی ایف، آئی ایس بی ایف، ایم ڈی این ایم۔

ہم:۔ "ہاں! تو ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے فالتو وقت میں سے کچھ وقت ہمارے لیے نکالا اور یہاں انٹرویو دینے تشریف لائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب! پہلے تو آپ اپنی ڈگریوں کا تعارف کرا دیں۔ اس لیے کہ یہ ہمیں مرعوب کر دینے کے لیے بہت کافی ہیں"۔

ڈاکٹر: "جی میں عرض کرتا ہوں، لیکن اس سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے انٹرویو کے لیے بُلایا۔ مجھے اس دن کا بہت عرصے سے انتظار تھا۔ بہرکیف، ہاں تو جناب ایم ڈی بی ایف کا مطلب ہے میٹرک دو بار فیل۔ آئی ایس بی ایف یعنی انٹر سو بار فیل، ایم ڈی این ایم، یعنی میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملا۔ لہٰذا ان حالات میں ہم خود ہی ڈاکٹر بن گئے"۔

ہم:۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب، بھئی ماشاءاللہ۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے باقاعدہ سوالات کا آغاز کروں۔

آپ سے ایک، ذاتی سا سوال کرنا چاہوں گی اگر اجازت ہو تو!"

ڈاکٹر:۔ "جی ہاں ضرور، بصد شوق"۔

ہم:۔ "میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ اس قدر کمزور اور لاغر ہو گئے ہیں کہیں خدانخواستہ کوئی بیماری تو نہیں لاحق ہو گئی؟"

ڈاکٹر:۔ "ارے نہیں! میں تو بالکل ہٹا کٹا ہوں بس دیکھنے میں ذرا تنکا نظر آتا ہوں ۔۔۔ بس پچھلے ماہ تبدیلیٔ قلب کا معمولی سا آپریشن کرایا تھا اور شاید چند دنوں میں ٹانسلز بھی نکلوانے پڑیں"۔

ہم:۔ (حیرت سے) "جی ۔۔۔! آپ کا دل تبدیل ہوا ہے مگر اس صورت میں تو آپ کو بستر پر آرام کرنا چاہیئے"۔

ڈاکٹر:۔ "ارے بھئی! ایسی معمولی باتوں پر آرام کرنے لگتا تو ابھی تک سرطان، السر، آنکھوں وغیرہ کے آپریشن بھی کھٹائی میں پڑ چکے ہوتے ۔۔۔ اور تو اور گُردے تک نہ نکالے جا سکتے!"

ہم:۔ "کیا مطلب! تو کیا آپ کے گُردے نکالے جا چکے ہیں"۔

ڈاکٹر:۔ "ایک کو تو میں نے نکال کر پھینک دیا۔ دیکھئے نا! جب ایک گُردے سے کام چل سکتا ہے تو بلاوجہ فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے۔۔ خواہ مخواہ دو دو کو سنبھالنے کی فکر کرنی پڑتی ہے ۔۔۔ ان کی وجہ سے تو میں ابھی تک ٹی بی کا علاج نہیں کرا سکا"۔

ہم:۔ "تو کیا آپ ٹی بی کا بھی تجربہ رکھتے ہیں؟"

ڈاکٹر:۔ "ایسا ویسا! بی بی' یہ تو ہمیں وراثت میں ملی ہوئی بیماری ہے سات پُشتوں سے چلی آ رہی ہے ۔۔۔ ارے ہاں! ابھی پچھلے دنوں مجھے ایک باؤلے کُتّے نے کاٹ کھایا"۔

ہم:۔ (جلدی سے) "کیا یہ بھی کوئی خاندانی روایت ہے؟"

ڈاکٹر:۔ (سوچتے ہوئے) "خاندانی روایت تو نہیں' البتّہ ان سے خاندانی دشمنی ضرور ہے ۔۔۔ لیکن جناب ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں ہم نے بھی کُتّے کو کاٹ کھایا ۔۔۔ حساب برابر!"

ہم:۔ (گھبرا کر) "ڈاکٹر صاحب! آپ ہمارے قارئین کو یہ بتا دیجئے کہ آپ کون سی بیماری سے اب تک محفوظ ہیں"۔

ڈاکٹر:۔ "بی بی! آپ نے کافی مشکل سوال کر دیا۔ لیکن خیر میں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں' دیکھئے جہاں تک میرا تعلق ہے ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں نے کبھی بیماریوں سے منہ نہیں موڑا' ان کی حد درجے دیکھ بھال کیا کرتا ہوں"

ہم:۔ "تو گویا یہ آپ کی پالتو بیماریاں ہیں"۔

ڈاکٹر:۔ (مُسکراتے ہوئے) "یہی سمجھ لیجئے' ویسے مجھے چند ڈھیٹ قسم کی بیماریوں پر بہت غصہ ہے مثلاً فالج اور

پولیو وغیرہ جنھوں نے مجھے اپنے دیدار سے محروم رکھا ہوا ہے۔"

ہم :۔ "جی ہاں واقعی یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے"۔

ڈاکٹر :۔ "معاف کیجئے گا۔ یہ انٹرویو کتنی دیر میں ختم ہو جائے گا؟"

ہم :۔ "بس ابھی ہوا چاہتا ہے۔ کیوں آپ بور ہو گئے کیا؟"

ڈاکٹر :۔ "نہیں ... دراصل میں نے دماغی امراض کے اسپیشلسٹ سے وقت دے رکھا ہے۔"

ہم :۔ (بیزاری سے) "اُف! تو آپ دماغی امراض میں بھی مبتلا ہیں؟"

ڈاکٹر :۔ (انکساری سے) "بس جی یونہی کبھی کبھی!"

ہم :۔ (چڑ کر) "بہت اچھا شوق ہے۔"

ڈاکٹر :۔ "شکریہ۔ ویسے آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔"

ہم :۔ "مشورہ! ... ہم سے ... جی فرمائیے!"

ڈاکٹر :۔ "میں نے سوچا ہے کہ اپنا دماغ نکلوا دوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہم :۔ (گھبرا کر) "مگر ڈاکٹر صاحب! نکلواتے تو اسی چیز کو ہیں نا جو پہلے سے موجود ہو۔"

ڈاکٹر :۔ (سنی ان سنی کرتے ہوئے) "دیکھئے! پچھلے بیس برس سے میرا وزن ایک سا چلا آ رہا ہے۔ ابھی کل جو میں وزن کرنے والی مشین پر کھڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا ایک پونڈ وزن بڑھ گیا ہے۔"

ہم :۔ "خیر جب ایسی بات ہے تو ضرور نکلوا دیجئے! ویسے بھی اس دماغ نے بلا وجہ آپ کے سر میں رقبہ گھیر رکھا ہے اس کا کوئی مصرف تو ہے نہیں!"

ڈاکٹر :۔ (خوش ہو کر) "شکریہ ... پہلی مرتبہ مجھے کسی نے مخلصانہ مشورے سے نوازا ہے۔ میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔ (چونک کر) ارے بی بی! آپ نے تو مجھے بیماریوں سے بچاؤ اور علاج کے سلسلے میں گفتگو کے لیے بلایا تھا۔"

ہم :۔ (جلدی سے) "ہاں تو ڈاکٹر صاحب! آپ نے بڑی مفید گفتگو کی۔ آپ کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ویسے بھی عقلمند بے وقوفوں سے ہی تو عقلمندی سیکھتا ہے۔ ہمارے قارئین ابھی کچھ عرصہ مزید زندہ رہنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کی زندگی سے بیزار ہونے کی صورت میں ہم ڈاکٹر لاغر صاحب کو دوبارہ مدعو کریں گے۔

قارئین! ہمارے دوسرے شریک گفتگو بھی ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔

ہم :۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیں کافی صحت منداور ہشاش بشاش نظر آرہے ہیں اس لیے اُمید ہے کہ اپنا دُکھڑا انہیں سُنائیں گے بلکہ ہمیں بعض بیماریوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کریں گے“۔

ڈاکٹر :۔ ”جی ضرور ضرور، یہی تو ہمارا فرض ہے“۔

ہم :۔ ”ڈاکٹر صاحب! ایک اہم بیماری ہمارے ملک میں وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے اور اگر اس سے بچاؤ کے انتظامات نہ کیے گئے تو جلد ہی ہماری قوم ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ ہماری مراد ”وڈیو بخار“ سے ہے اس بیماری نے ہر طبقے کے لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! پہلے تو آپ ہمیں اس بیماری کے متعلق تفصیلاً بتائیے۔۔۔“!

ڈاکٹر :۔ یہ ایک مہلک بخار ہے جو دیگر کئی بیماریوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ کئی بیماریاں جراثیم یا وائرس سے پھیلتی ہیں لیکن ”وڈیو بخار“ ایک بھوت کے ذریعے پھیلتا ہے جو وڈیو کیسٹ اور وڈیو گیمز سے مریض پر سوار ہوتا ہے اور پھر یہ بھوت یعنی یہ خطرناک بیماری آسانی سے اور بہت جلد ایک فرد سے دوسرے میں منتقل ہو سکتی ہے“۔

ہم :۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ یہ بتائیے کہ اس مرض سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے؟“

ڈاکٹر :۔ ”دیکھئے یہ مرض نہایت موذی ہے اور تیزی سے پھیلتا پھولتا ہے۔ لہٰذا اگر ابتداً ہی میں چند احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں تو اس مرض سے بچاؤ کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں“۔

ہم :۔ ”جی ڈاکٹر صاحب! مثلاً کیا تدابیر؟“

ڈاکٹر :۔ ”سب سے پہلے تو حتی الامکان ٹی وی سے دُور رہا جائے، مطلب ٹی وی دیکھنے سے پرہیز کیا جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہر صورت میں وی سی آر سے کم از کم چار مربع فٹ پرے رہنا از حد ضروری ہے، نادانستہ نظر پڑ جائے تو خیر کوئی حرج نہیں مگر جان بوجھ کر دوبارہ دیکھنے سے مرض میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ خدانخواستہ اگر وڈیو کیسٹ کو ہاتھ لگ جائے تو صابن سے ہاتھ دھو کر اچھی طرح پاک وصاف کر لیں۔ اس کے علاوہ اسکول کالج سے سیدھے گھر واپس آیا کریں۔ درمیانی فاصلے میں وڈیو سینٹر نظر آنے کی صورت میں دوبارہ نظریں نیچی کر لیں“۔

ہم :۔ ”ڈاکٹر صاحب :۔ اگر اس کے باوجود کسی طرح بداحتیاطی کے باعث یہ مرض لاحق ہو جائے تو اس کی تشخیص کیسے ہوگی؟ اور اس مرض کی علامات کیا ہیں“؟

ڈاکٹر :۔ ”دیکھئے اس کی تشخیص کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بیماری خود چلا چلا کر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ مریض کی ابتر حالت دُور سے ہی بتا دیتی ہے کہ وہ ”وڈیو بخار“ میں مبتلا ہے۔ اس کی ابتدائی علامات یہ ہیں کہ مریض کی صورت و ہیئت آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتی ہے۔ شانوں پر

جھولتے اُلجھے ہوئے بال، سُرخ انگارہ آنکھیں، ڈھیلی فقیروں جیسی قمیص اور چُست پینٹ پہنے، منہ میں سگریٹ دبائے لڑکھڑاتے چلے آرہے ہیں۔ اس قسم کے مریضوں کا اگر ابتدا ہی میں پٹائی کے ذریعے علاج نہ کیا جائے تو مرض ساری زندگی کے لیے چپک کر رہ جاتا ہے۔ مریض اسکول کے بہانے گھر سے نکلتا ہے اور وڈیو سینٹر میں جا اٹکتا ہے۔ رات دن وڈیو فلمیں دیکھتا ہے۔ نہ پڑھائی کا ہوش نہ امتحان کی فکر۔"

ہم:"ڈاکٹر صاحب! اگر خدانخواستہ بیماری سنگین صورت اختیار کر جائے تو اس کا کیا علاج کرنا چاہیئے؟"

ڈاکٹر:"اگر ایک بار یہ بیماری کمبل ہو جائے تو اس کا اُتار پھینکنا بے حد مُشکل ہے لیکن غیر ناممکن بھی نہیں، سب سے پہلے تو مریض کے کمرے سے ٹی وی، وی سی آر اور وڈیو کیسٹ وغیرہ ہٹا لیں۔ اگر وہ احتجاج کرے تو بطور نُسخہ ایک زور دار طمانچہ رسید کر دیں۔ ساتھ ہی موسیقی کے آلات، ٹیپ ریکارڈر، کیسٹ بھی ہٹانا مت بھولیے گا۔ اس کے بعد باہر سے دروازہ لاک کر دیں اور پھر کھولنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہی بھُوت کو اُتارنے کا بہترین طریقہ ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت بھُوت شور مچائے گا اور مریض کے ذریعے دروازہ پٹوائے گا مگر آپ اس پر کان نہ دھریں۔ خود ہی تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ ایک دو دن بھُوت اور مریض کو بھُوکا رہنے دیں تاکہ بھُوت اُتر کر بھاگ جائے اور مریض صحتیاب ہو کر توبہ کر لے۔

اس مشن میں کامیابی کے بعد وڈیو کیسٹ ریکارڈ کو ردّی والے کے ہاتھوں اونے پونے داموں فروخت کر کے اس کے چنے کھالیں۔ اپنے بچّے کو بلاضرورت باہر نہ نکلنے دیں اور اگر نکلے تو رقم نہ دیں تاکہ اُسے مقناطیس کی طرح اس کی کشش دوبارہ نہ کھینچ لے۔ ایسا ہونے کی صورت میں بے شک آپ بھی اس کے کان کھینچ لیں۔ اگر چند دنوں تک یہ علاج اور پرہیز جاری رکھا جائے تو یقیناً بچّہ جلد مکمل طور پر صحتیاب ہو جائے گا۔"

ہم:" بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہمیں واقعی بہت مفید باتیں بتائیں۔ ہمارا تو جی خوش ہو گیا بلکہ ہمیں فخر ہے کہ ہم قارئین کے لیے اتنا بامقصد اور معلوماتی انٹرویو پیش کر سکے۔"

(اچانک ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔)

لڑکا:" ابّو! آپ یہاں بیٹھے ہیں --- جلدی چلئے نا آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

ہم:" ارے ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا بیٹا ہے، بڑا پیارا بچّہ ہے ماشاءاللہ ماشاءاللہ"۔

لڑکا:" میں تو ابّو کو لینے آیا ہوں۔ چلئے نا ابّو! میں بہت اچھی فلم لے کر آیا ہوں۔ امّی کہہ رہی ہیں کہ تمھارے ابّو آجائیں تو کیسٹ لگائیں گے۔

بس اب اٹھیئے، پانچ بجے وڈیو سینٹر بھی جانا ہے وہاں ایک نئی گیم آئی ہے۔"

جہاں قالین وہیں صفائی

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :

عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

- بہادر آباد فون : ۴۱۳۶۹۵
- جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- کھارادر " ۲۲۵۸۰۳
- گارڈن روڈ " ۷۲۲۴۴۳
- برنس روڈ " ۲۰۲۳۳۶
- ڈیفنس فیز V فون : ۵۲۶۵۳۹
- امیر خسرو روڈ " ۴۱۳۶۹۵
- راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ، کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹

زونل آفس : صدر بازار ۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

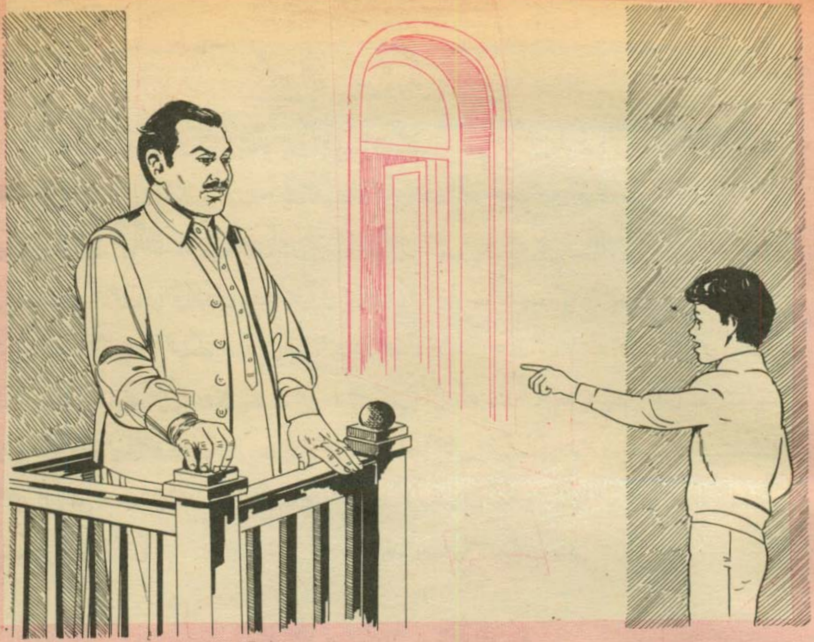

مجھے ابّو سے شکایت ہے

اس کالم کو شروع کرنے کا ایک اہم مقصد ہے!

بعض گھرانوں میں بچّوں کو اپنے والدین سے کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی ہے۔ لیکن بچّے کچھ احترام اور کچھ خوف کی وجہ سے اپنی شکایت کا اظہار نہیں کر پاتے۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیت اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس کالم میں بچّوں کی صرف اُن شکایات کو جگہ دی جا رہی ہے جو معقول ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اسی طرح والدین کو اپنے بچّوں کے حقیقی احساسات و جذبات کا علم ہوتا رہے گا اور وہ اپنے ... بچّوں کی ان شکایتوں کو دُور کریں گے تاکہ بچّوں کے دلوں میں ان کے لیے حقیقی عزّت و احترام پیدا ہو۔ (ادارہ)

مجھے ابّو سے ڈر لگتا ہے

مجھے اپنے ابّو سے کوئی شکایت تو نہیں مگر ایک بات مجھے ابّو کے پاس نہیں جانے دیتی اور وہ ان کا غصّہ ہے۔ اور میں ہمیشہ سے ان سے ڈرتا رہا ہوں۔ ویسے میرے ابّو ہیں بہت اچھے۔ جب میری امّی گاؤں جاتی ہیں تو ابّو بالکل بدل جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے انھیں کبھی غصّہ آیا ہی نہیں۔ ہمیں اچھی اچھی چیزیں لا کر دیتے ہیں اور بہت زیادہ پیار کرتے ہیں مگر جوں ہی امّی گاؤں سے واپس آتی ہیں تو ان کا غصّہ لوٹ آتا ہے۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جس کمرے میں وہ ہوتے ہیں اس کمرے میں جاتے ہوئے بھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہمیں مارتے ہیں۔ ویسے ہی پتا نہیں کیوں ڈر لگتا ہے۔ ویسے وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ آپ کوئی ایسا مشورہ دیں کہ میرے ابّو کو غصّہ نہ آئے اور انھیں غصّہ آنے کی وجہ ضرور بتائیے گا۔ ویسے میں تعلیم میں بھی بہت اچھا ہوں۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں ان کے کمرے میں اس لیے نہیں جاتا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھ نہ لیں۔

سلطان بشیر، اسلام آباد

ابّو سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟

مجھے اپنے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتے ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ سگریٹ پینا نہیں چھوڑتے۔

سیّد جاوید حیدر شاہ، سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

ابّو! ایک بلّا دلا دیجئے!

مجھے ابّو سے شکایت ہے کیونکہ وہ مجھے بلّا خرید کر نہیں دیتے۔

اورنگ زیب عالمگیر، سدّھانڈی۔ ضلع چکوال

ابّو کرکٹ اور رسائل کے خلاف ہیں!

مجھے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ وہ مجھے اگر کھیلتا دیکھ لیں تو فوراً منع کرتے ہیں اور ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں۔ جبکہ مجھے کرکٹ کھیلنے کا بے حد شوق ہے اور میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں ایک فاسٹ بولر ہوں اور کرکٹ نہ چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہے۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ جب بھی مجھے رسالہ پڑھتے دیکھ لیتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں پتا نہیں کیوں وہ رسالے وغیرہ کے مخالف ہیں جبکہ میں اپنے اسکول کا کام بھی باقاعدگی سے کرتا ہوں اور ذہین بھی ہوں۔ میرے ابّو کو کوئی رسالہ "آنکھ مچولی" کے فوائد سے آگاہ کر سکتا ہے ؟

محمّد ایوّب مخدوم ۔ چمن

جیب خرچ نہیں دیتے

مجھے اپنے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ وہ مجھے چاہتے نہیں ہیں اور مجھے جیب خرچ نہیں دیتے اس لیے مجھے اپنے ابّو سے محبت کم ہے اور ابّو مجھے اچھے نہیں لگتے ہیں۔

پرویز سجّاد، کھائی، حیدرآباد

ابّو اور آنکھ مچولی

مجھے شکایت ہے اپنے ابّو سے کہ وہ مجھے رسالہ "آنکھ مچولی" میں خط لکھنے سے منع کیوں کرتے ہیں۔

شازیہ گل، ریلوے روڈ، سرگودھا

کرکٹ سے دشمنی

ابّو مجھے کھیلتا دیکھ کر ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں۔ کیونکہ میں کرکٹ کھیلتا ہوں اور انھیں کرکٹ بالکل پسند نہیں

پشیم گل، جامشورو

کوئی شکایت نہیں

مجھے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ مجھے ابّو سے کوئی شکایت نہیں۔

اویس عزیز شیخ، فیصل آباد

کھیلنا منع ہے

میرے ڈیڈی کبھی کھیلنے نہیں دیتے۔ ہر وقت پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ٹیلی وژن تک دیکھنے نہیں دیتے۔ جس کی وجہ سے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا ہوں۔

نام نہیں لکھا ۔ شجاع آباد ۔ ملتان

ابّو اپنا کام خود نہیں کرتے

ابّو اپنا کام خود نہیں کرتے بلکہ ہر کام مجھ سے کرواتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے کام کے لیے ہمیں سوتے سے بھی جگادیتے ہیں۔

لُبنیٰ زیدی، انچولی، کراچی

ڈھیروں شکایتیں

● ابّو مجھے جیب خرچ تو بہت دیتے ہیں لیکن خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتے ● وہ مجھے کھیلتا ہوا تو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن صرف لوڈو ● وہ مجھے اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جاتے۔ ● بڑی مشکل سے آنکھ مچولی خریدنے کی اجازت دیتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب آنکھ مچولی کے ساتھ کوئی تحفہ آئے۔

● اگر کوئی دوست آجائے تو وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ٹرخادو۔

سید حبیب علی زیدی، شیر شاہ، کراچی

بے جا لاڈ و پیار

مجھے ابّو سے شکایت ہے کہ انھوں نے مجھے بہت ڈھیل دے رکھی ہے اور بے جا لاڈ و پیار کرتے ہیں۔

منصور اشرف بخاری

رسالہ کیسے خریدوں؟

مجھے ابّو سے شکایت ہے کہ وہ مجھے جیب خرچ نہیں دیتے۔ اس لیے میں آنکھ مچولی نہیں خرید سکتا۔ مجبوراً میں اپنے دوست سے لے کر پڑھتا ہوں۔ وہ بھی سال میں تین چار دفعہ ہی پڑھنے کو دیتا ہے۔

محمّد وسیم وڈسکو، سکھر

کہانیاں پڑھنے سے منع کیوں؟

مجھے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ میرا صرف ایک ہی مشغلہ ہے وہ ہے مطالعہ یعنی کہانیاں پڑھنا لیکن فارغ اوقات میں۔ پھر بھی ابّو مجھے کہانیاں پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔

کاشف آزاد۔ موہن پورہ۔ راولپنڈی

ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان ہوں

وہ مجھے بات بات پر ڈانٹتے ہیں۔ جب دیکھو کسی نہ کسی بات پر ڈانٹتے ہیں۔ جب دیکھو کسی نہ کسی بہانے ڈانٹتے ہیں۔

شاھد واجد علی، وحید آباد گلبہار، کراچی

وہ مجھے نظر انداز کرتے ہیں !

ابّو میرے سامنے میرے کزن سے بہت پیار سے پیش آتے ہیں اور مجھے پیار تک نہیں کرتے ڈانٹتے ہی رہتے ہیں ۔ پھر یہ کہ وہ اپنے لائق بیٹے کو زیادہ پیار کرتے ہیں اور اُسے چیزیں وغیرہ دیتے ہیں جبکہ وہ مجھے نسبتًا کم چاہتے ہیں ۔ جس سے میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں ۔

تجمّل الیاس ۔ سمن آباد ۔ لاھور

اتنا زیادہ پیار اچھا نہیں لگتا

مجھے اپنے ابّو سے صرف اتنی شکایت ہے کہ وہ مجھے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں ۔

محمّد ندیم لطیف ، سیالکوٹ

کھیلنے نہیں دیتے

میرے ابّو مجھے کھیلوں میں حصہ نہیں لینے دیتے ۔ جب بھی میں انھیں کسی کھیل کے متعلق کہتا ہوں تو وہ مجھے ڈانٹتے ہیں ۔

جمیل احمد تبسّم ، میاں چنّوں

باہر نہ نکلو

میرے ابّو ہمیشہ مجھے باہر گھومنے پھرنے سے منع کرتے ہیں ۔

سعید خان ۔ میاں چنّوں

سب سے بڑی گپ

تین مصوّر بیٹھے اپنی مصوّری اور تصویر سازی کے واقعات ایک دوسرے کو سنا رہے تھے ۔ ایک مصوّر بولا "میں نے آگ کی تصویر بنانا چاہی اور کینوس پر ابھی رنگ لگائے تھے کہ کینوس جل کر خاکستر ہو گیا ۔" دوسرے مصوّر نے اس پر حیران ہونے کے بجائے اپنا تجربہ بیان کرنا شروع کر دیا ۔ "میں نے قطبِ شمالی کے ایک منظر کو کینوس کی گرفت میں لینا چاہا کہ وہ کپکپی طاری ہوئی کہ برش پر برف جم گئی ۔"

تیسرا مصوّر یہ سب سنتا رہا اور جواباً کچھ کہنے کے بجائے جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا ۔ پہلے دو مصوّروں نے شور مچایا کہ یہ کیا ، کوئی اپنا تجربہ بھی تو سناؤ ۔ مگر وہ بڑے تشویشناک انداز میں یہ کہتا ہوا کہتا رخصت ہو گیا "میں اس وقت رُک نہیں سکتا ۔ دراصل میں نے ایک بچّے کی تصویر بنائی تھی ، جب میں گھر پر نہیں ہوتا تو وہ خود کو اکیلا پا کر رونے لگتا ہے ۔"

زرینہ بانو ـــــ ملیر ہالٹ ، کراچی

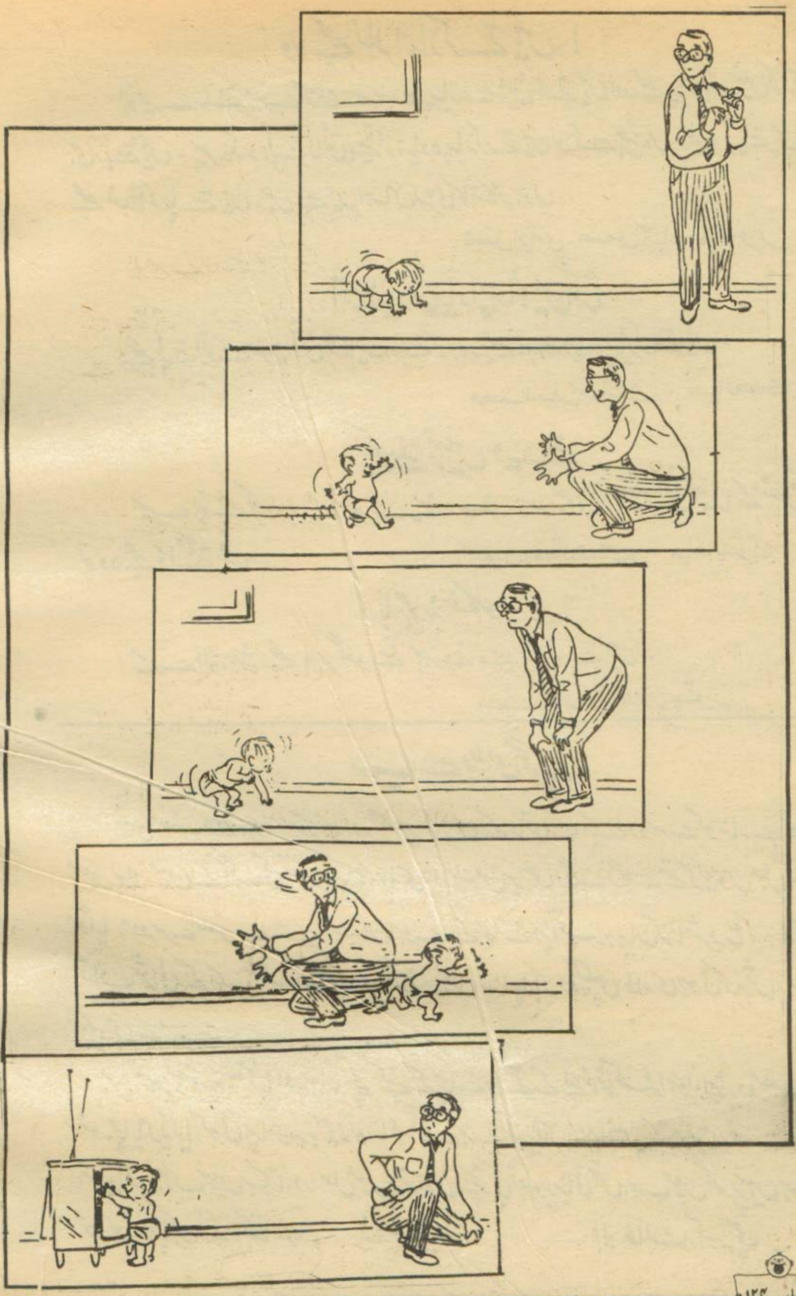

شبنم عقیل

جب ہم بیمار ہوئے

پچھلے دنوں ہمیں اسپتال جانے کا اتفاق ہُوا۔ یہ اتفاق پورے ایک سال تین مہینے اور دس دن بعد ہوا تھا۔ پچھلی دفعہ تو ہم اسپتال اس وقت گئے تھے، جب ہماری اُنگلی کٹ گئی تھی۔ بڑی تکلیف ہوئی جناب! اور خون بھی بہت بہا۔ اور جب ڈاکٹر کے پاس گئے تو انھوں نے اُنگلی کو سُن کرنے کی تکلیف بھی گوارہ نہ کی اور یونہی ٹانکا لگا دیا۔ رونا نہیں چاہ رہے تھے مگر آنسوؤں کی قطاریں نکل پڑیں تڑپنا بھی نہیں چاہتے تھے، مگر تڑپ اُٹھے۔ اور ان کو خیال کب آیا---؟ جب ہم بے ہوشی کی کیفیت میں پہنچ گئے! بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے سُن کرنے والا انجکشن لگایا تھا... مگر فائدہ؟ ہم تو پہلے ہی بے ہوش تھے۔ انھوں نے اور سُن کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اپنی مہارت آزما رہے تھے۔ یا ہماری قوتِ برداشت!

خیر، یہ تذکرہ تو یونہی آگیا۔ ہم یہ بتا رہے تھے کہ پچھلے دنوں موسم نے جو سختی کی، وہ ہم پر براہِ راست اثر انداز ہوئی۔ مگر ہم چونکہ اپنے متعلق گھر والوں کی یہ رائے جانتے تھے کہ یہ تو ٹارزن ہے۔ اسے سردی کہاں لگتی ہے۔ سوئیٹر پہن کر گرمی لگے گی۔ اس لیے موسم کی سختی کو ذرا لفٹ نہیں کرائی۔ اب چاہے لاکھ سردی

لگ رہی ہو، چلنے میں ٹانگیں کپکپا رہی ہوں، دانت بجنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہوں۔ مگر مجال ہے، جو ہم اِن باتوں کو کسی پر ظاہر کر دیں۔ حالت یہ ہے کہ دانتوں کو مضبوطی سے بھینچے بیٹھے ہیں۔ ایک ہی جگہ۔ اب ہم اُٹھیں گے اور نہ بات کریں گے۔ تاکہ کسی کو ٹانگوں کی لرزش کا اندازہ نہ ہو۔ بات اس لیے نہیں کریں گے کہ زبان سے جو آدھے آدھے لفظ نکلیں گے، انھیں کہاں جوڑیں گے؟ بس اسی ضد میں مارے گئے اور نزلہ زکام، کھانسی اور بخار سب نے مل کر حملہ کر دیا۔

ایک دن گزر گیا، کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ نزلہ زکام تو سب ہی کو ہوتا ہے۔ کھانسی آئی تو لوگوں سے دُور جا کر کھانس لیے۔ اور پانی پی لیا کہ نہ گلے میں خراش ہو گی، نہ کھانسی آئے گی اور رہا بخار ... ؟ تو بھئی! اس کا اندازہ تو اُسی وقت ہو گا جب کوئی ماتھا چھوئے یا ہاتھ پکڑے۔ ب ہم اتنے چھوٹے تو ہیں نہیں کہ کوئی شرارت، شیطانی کر کے بھاگنے کی کوشش کریں اور کوئی ہمیں پکڑ لے۔ ہا ماتھا چھونے کا سوال تو آج کل ماتھا چومنے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے البتہ مشرقی روایات کے علمبردار گھرانوں میں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے کسی اور کے نہیں! ہم بھی یہی کرتے ہیں۔ کیونکہ آج تک، کوئی ایسا شخص کم از کم ہم نے نہیں دیکھا، جو دوسرے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرے۔ کیسا آپ نے، باتوں باتوں میں ہم کہاں پہنچ گئے۔ بس یہی ایک خرابی ہے ہم میں، ورنہ ہم بھی آدمی ہیں، ام کے ...!

ہم کہاں تک پہنچتے۔ دوسرے دن سو کر اُٹھے تو پتہ چلا، ٹانگوں نے ہلنے جُلنے سے جواب دے دیا ہے۔ آنکھیں بھی بمشکل کھُل رہی تھیں۔ اب تو سب کو پتا چل گیا اور ہمارے ٹارزن ہونے کی پول کھُل گئی۔ سب نے وہ مذاق اُڑایا کہ اگر ہم سچ مچ ٹارزن ہوتے تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرتے۔

قصّہ مختصر ہم اسپتال گئے۔ یہ اسپتال ایک چھوٹے سے بنگلے میں بنا ہوا ہے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئے کوئی چوکیدار نہیں، بڑی حیرت ہوئی۔ خیر، ہم سیدھے ویٹنگ روم میں پہنچ گئے۔ وہیں ایک کونے میں نرس کی میز تھی، جو پرچیاں بنا رہی تھی۔ ہم اس کے پاس گئے۔ اس نے نام وغیرہ پوچھ کر ایک کارڈ پر لکھا اور ہمارے حوالے کر دیا۔ پرچی بنانے کے اُس نے دو روپے لیے۔ ہم بھی دیگر لوگوں کے ساتھ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بے شمار مریض تھے۔ ان میں علاقے کے ایسے ایسے لوگ بھی نظر آئے جو چند قدم کا فاصلہ بھی گاڑی میں طے کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بیمار ہیں اس طرح وہ اپنی امارت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ مگر گیٹ کے پاس تو کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے، نظر چوک گئی ہو۔ ہم نے حیران دلِ نادان کو

تسلّی دی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک ویلفیئر اسپتال ہے، جو غریبوں کے لیے بنا ہے، لیکن وہاں امیروں کا کیا کام؟

باری آنے پر ہم ڈاکٹر کے پاس گئے۔

"جی۔۔۔؟" ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم بیٹھ جائیں۔ کھڑے ہو کر تو ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔" ہم کمزور سے لہجے میں بولے۔ وہ ہلکے سے مُسکرائے اور بولے "بیٹھ جائیے۔" ہم ان کے قریب رکھّے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ "ہاں تو ڈاکٹر صاحب! ہمیں بخار ہے۔ نزلہ ہے، کھانسی ہے۔ دوسری بیماریاں تو خیر نارمل ہیں مگر اس کھانسی۔۔۔"

"جی، کیا ہُوا کھانسی کو؟" ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"کھانسی کو تو کچھ نہیں ہُوا، البتّہ کھانسی سے ہمیں پیٹ میں، جگر میں، کلیجے میں، ہر جگہ درد ہی درد ہوتا ہے۔ جب کھانسی ہوتی ہے نا۔ تو جسم کے اندر کا ہر پُرزہ ہلتا ہے۔ آپ کے اس اسٹول کی طرح!" ہم نے بیٹھے بیٹھے اسٹول کو گول گھما کے جھونٹا لیا۔

"اچھّا اچھا۔" وہ پھر مُسکرائے۔ بڑے ہنس مُکھ آدمی تھے۔ اسٹیتھو اسکوپ سے ہماری گردن کا ابتدائی حصّہ چیک کیا اور زور زور سے سانس لینے کو کہا۔ ٹارچ سے زبان دیکھی۔ تھرما میٹر منہ میں لگایا اور رُخ پھیر کر بیٹھ گئے۔ پتا نہیں کیا کر رہے تھے۔ خیر، پھر انھوں نے تھرما میٹر نکال کر دوائیں لکھیں اور کہا "کمپاؤنڈر کے پاس چلی جائیے۔"

کارڈ لے کر ہم کمپاؤنڈر کے پاس چلے آئے۔ اُس نے خاموشی سے کارڈ لیا اور اس پر لکھی دوائیں ہمیں دیتے ہوئے بولے "یہ لال گولیاں اس صبح کھانی ہیں۔ سفید والی کل شام کھانی ہیں۔ اور مکسچر ہر کھانے کے بعد ایک چمچ پینا ہے۔" ہم اس بات کے بڑے شوقین ہیں کہ دواؤں کے ساتھ ساتھ ہمیں پرہیز بھی بتایا جائے۔ مگر ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا۔ ہم چُپ کر کے اس لیے چلے آئے کہ شاید کمپاؤنڈر بتائے۔ مگر جناب، عجیب بے نیازی۔ وہ بھی متوجّہ نہ ہوئے۔ آخر، ہم ہی کھنکارے۔

"جی؟" انھوں نے نگاہ اُٹھا کر پوچھا۔

"آپ نے پرہیز تو بتایا نہیں۔"

"اُفوہ بابا! یہ آپ کو ڈاکٹر سے پوچھنا چاہئیے تھا۔ میں کمپاؤنڈر ہوں، ڈاکٹر نہیں۔"

ان کی ڈانٹ سُن کر ہم جلدی سے باہر نکل آئے لیکن اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی واپس گئے۔ "جی پیسے

کتنے ؟" ہم نے پوچھا۔
"یہاں دوا کے پیسے نہیں لیے جاتے۔" اب کی دفعہ وہ کچھ نرمی سے بولے۔
"اوہو ہو۔" ہمیں ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔ "دوائیں تو اصلی ہیں، نا؟"
"جی ہاں" وہ کچھ حیرت سے بولے۔
"اور یہ لال پانی ؟"
"کون سا لال پانی ؟" انھوں نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
"یہی بوتل والا"!
"اصلی ہے بھئی، اصلی! دماغ نہ کھاؤ میرا۔" وہ بالکل ہی بھنّا گئے۔
لوگوں کے جمِ غفیر کی حقیقت ہم پر اب آشکار ہوئی۔ کمپاؤنڈر کے کمرے سے باہر آنے کے بعد ہم کھڑے ہو گئے۔ ہماری بہن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، چلنا نہیں ہے؟"
"ڈاکٹر نے پرہیز تو بتایا نہیں۔" ہم پریشانی سے بولے۔
"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ جاؤ ڈاکٹر سے پوچھ لو۔" انھوں نے چھوٹی ہونے کے باوجود ہم سے بزرگانہ انداز میں کہا۔ یہ مشورہ ہمیں پسند آیا۔ لہٰذا جونہی مریض ڈاکٹر کے کمرے سے نکلا، ہم نے لمبی جست لگائی اور اندر پہنچ گئے۔ پیچھے رہ جانے والوں کے شور کو نظر انداز کر کے!

"آئیے آئیے، بیٹھیے۔ کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر ہمارے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئے۔ "آپ پھر آ گئیں؟"
"جی ڈاکٹر صاحب!" ہم مسکینی سے بولے۔
"اب کیا پریشانی ہے؟" ان کے انداز میں بیزاری تھی۔
"ہم یہ پوچھنے آئے تھے کہ آپ نے پرہیز تو بتایا نہیں؟"
"اُفوہ" ان کا بس نہ چلا کہ سر نوچ لیں ... اپنا! "جب نہیں بتایا تو اس کا مطلب ہے، کسی چیز سے پرہیز نہیں۔"
"نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم مریض ہیں۔ دوا کھائیں گے تو کسی چیز سے پرہیز بھی تو کریں گے ورنہ پھر ہمیں مریض کون کہے گا۔"
"میں کہوں گا۔" وہ بے اختیار بولے۔ غور سے ہمیں دیکھا، مسکرائے اور بولے۔ "آپ کھٹّے سے پرہیز

کیجیے گا۔ کینو، مالٹے، اچار، چٹنی وغیرہ بالکل مت استعمال کیجیے۔"

"نہیں ڈاکٹر! کچھ اور بتائیے۔ ان میں تو ہماری جان ہے۔" ہم جلدی سے بولے۔

"یہی چیزیں تو آپ کی بیماری کا باعث ہیں، جن سے آپ کو پرہیز کرنا چاہیئے۔" وہ بولے۔

"نہیں، کچھ اور بتائیے۔"

"اچھا آپ چاول سے پرہیز کیجیے۔ اور مونگ پھلیوں سے بھی۔" انھوں نے گویا ہماری خاطر پرہیز بتلایا۔

"چاول ڈاکٹر صاحب! پتہ ہے آپ کو، ہم جس دن کھانے میں چاول نہ کھائیں تو لگتا ہے، کھانا ہی نہیں کھایا۔ اس دن ہم کئی دفعہ کھانا کھاتے ہیں اور مونگ پھلیوں کا کیا نام لیا ہے آپ نے! سردیوں کا یہی ایک تحفہ تو ہوتا ہے جو سستا بھی ہے اور اچھا بھی! ورنہ چلغوزے بھلا کون کھائے، اتنے مہنگے!"

"سردیوں کا ایک تحفہ تو آپ لیے بیٹھی ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"جی یہ تو عام ہے۔" ہم نے جواب دیا پھر اصرار کیا۔ "آپ نے کچھ بتایا نہیں۔"

"آپ روٹیوں سے پرہیز کیجیے اور...!"

"بالکل ٹھیک۔" ہم نے خوش ہو کر بات کاٹ دی۔

"گوشت سے بھی۔"

"بالکل کریں گے۔" ہم بڑے جوش سے بولے۔

"دال سے!"

"دال سے! تھوڑا مشکل ہے، مگر ہم کرلیں گے۔"

"پانی سے!" وہ شاید مذاق پر اُتر آئے۔

"جی، پانی سے۔" ہم حیرت اور تشویش سے بولے۔

"ہاں ہاں، پانی سے۔"

"ڈاکٹر صاحب! بھلا پانی سے بھی کوئی پرہیز کرسکتا ہے۔" ہمیں ہنسی آگئی۔

"بالکل کرسکتا ہے۔" وہ پُرزور لہجے میں بولے۔

"اچھا!... تو پھر ہم پیئں گے کیا؟"

"کوک پیجیے گا۔" وہ اطمینان سے بولے۔

"کوک"، ہماری سانس رُک ہی تو گئی۔ "آپ کو پتا ہے، ڈاکٹر! کتنے کی آتی ہے۔"

"ہاں ہاں! تین ساڑھے تین کی ملتی ہے، ایک بوتل۔"
"جی اور اگر ہم دن میں دس دفعہ پانی کی جگہ کوک پئیں گے تو ہمارا تو دیوالیہ نکل جائے گا۔"
"نکلنے دیجئے آپ کا پرہیز تو ہوگا۔" ڈاکٹر صاحب تو ہمارے بھی اُستاد تھے۔
"چھوڑیے ڈاکٹر صاحب! ہم ایسے ہی خوش ہیں۔ کوک سے پرہیز کریں گے۔ پانی سے نہیں --- اچھا شکریہ آپ کا۔"
"ارے، آپ جا کہاں رہی ہیں ابھی پورا پرہیز تو بتایا نہیں۔" ڈاکٹر صاحب ہمیں اُٹھتا دیکھ کر فوراً بولے ...
"بس ڈاکٹر صاحب! اتنا ہی پرہیز کافی ہے۔ ہم تو سوچ رہے ہیں، اب آپ سے بھی ہمیں پرہیز کرنا چاہئیے۔ کہیں آپ ہوا سے پرہیز نہ بتادیں۔"

بچّے ہمارے عہد کے ...

بچّے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ گیند ایک مکان کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر آگئی۔ خاتونِ خانہ نے جھلّا کر دروازہ کھولا۔ لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ انہوں نے گیند اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ خاتونِ خانہ نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک بچہ موجود تھا۔
"معاف کیجئے گا .... ہماری غلطی سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ وہ اُدھر دیکھئے...... میرے والد نیا شیشہ لگانے کے لئے آرہے ہیں"۔ اس نے گلی کی طرف اشارہ کیا "اب آپ جلدی سے مجھے گیند دے دیں۔"
خاتونِ خانہ نے دیکھا کہ ایک شخص ایک ہاتھ میں تھیلا اور دوسرے ہاتھ میں کھڑکی کا شیشہ پکڑے ان کے مکان کی طرف چلا آرہا ہے۔ "کوئی بات نہیں بیٹا! گیند لے لو۔" خاتون نے بچّے کو گیند دیتے ہوئے خلیق لہجے میں کہا۔ اتنی دیر میں وہ شخص دروازے پر آگیا۔ بچّے نے گیند لی اور رفو چکّر ہوگیا۔
اس شخص نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ نیا شیشہ لگا دیا اور خاتون سے بولا "پچاس روپے عنایت کردیں"۔
"کیا؟..... کیسے پچاس روپے"؟ خاتون نے گڑبڑا کر حیرت سے پوچھا "کیا تم اس بچّے کے باپ نہیں ہو؟ جو ابھی گیند لے کر گیا ہے۔"
"ہرگز نہیں" اس شخص نے جواب دیا۔ پھر چونک کر پوچھا "کیا آپ اس بچّے کی ماں نہیں ہیں؟"
عاطف حنیف ____ نشتر روڈ۔

Goldfish
Deluxe Pencil
حقیر
سی
لکیر
حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی
گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل
SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PH_NE: 293451
جہاں چلے، رواں چلے
Goldfish
BOND

عقیل عباس جعفری

گنی چنی معلومات

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ

_____ اللہ ایک¹ ہے

_____ ہماری زمین کے ہمیشہ دو² قطب ہیں، قطب شمالی اور قطب جنوبی،

_____ جغرافیہ میں سمتیں چار⁴ ہیں، مشرق، مغرب، شمال، جنوب۔

_____ انسانی ہاتھ میں پانچ⁵ انگلیاں ہوتی ہیں

_____ اسی طرح سات سمندر، سات آسمانوں کا ذکر بھی آپ نے سنا یا پڑھا ہوگا۔

آگے گنتی گنتے جائیے۔۔۔ ایک کی بجائے صفر سے شروع کیجئے اس لیے کہ صفر اگرچہ کوئی عددی قیمت نہیں رکھتا مگر اس کے بغیر کوئی گنتی، پہاڑہ یا حساب مکمل نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں تو اسی طرح سے آٹھ، نو⁹، دس¹⁰، گیارہ¹¹ ------ ------ اٹھانوے، ننانوے، سو۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

اپنے معلومات کے خزانے پر نظر ڈالیے، چھان بین کیجئے، تو آپ کے سامنے حیرت انگیز اور انوکھی معلومات آئیں گی۔ بہت سی ایسی باتیں اور معلومات ملیں گی جو کسی نہ کسی ہندسے یا عدد کے ساتھ ہی مکمل ہوں گی۔ ان میں سے اگر عدد کا تعلق نکال دیا جائے تو پھر وہ بیکار ہو جائیں گی۔۔۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ پرانی دنیا کے سات عجوبے تھے، پھر ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔۔۔ اس میں اگر سات کا عدد نہ ہو تو بھلا بتائیے اس کے کیا معنیٰ ہوں گے؟ کچھ بھی نہیں!۔۔۔ اسی طرح تلاش کرنے سے بے شمار ایسی معلومات ملتی ہیں جن میں اعداد کا ذکر بالکل لازمی ہے۔۔۔

اب تک اردو میں معلوماتِ عامہ، ذہنی آزمائش اور کوئز کی اچھی بُری بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر غلط سلط اور نقل در نقل ہیں۔ چند ہی قابلِ اعتبار کتابیں ہیں، جن میں سے ایک عقیل عباس جعفری کی "جہانِ معلومات" ہے۔ عقیل عباس سنجیدہ، پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ معلوماتِ عامہ کے قابلِ ذکر پروگراموں میں بڑے انعامات جیت چکے ہیں۔ پاکستان ٹیلی وژن کے کئی پروگراموں مثلاً "سات دن" "نیلام گھر، میزان" وغیرہ کی تحقیقی ٹیم میں شامل رہے ہیں۔

یہ سلسلہ "گنی چنی معلومات" کے عنوان سے ایک سب سے الگ اور قابلِ تعریف کوشش ہے۔ اپنے طرز اور معلومات کے لحاظ سے اردو میں پہلا سلسلہ ہے۔ جو عقیل عباس جعفری نے بڑی محنت، ذہانت اور خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے۔ مدبر رضوی۔ اسکرپٹس ایڈیٹر پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن، کراچی

گنی چنی معلومات

صفر

- صفر عربی زبان کا لفظ ہے ۔
- صفر کا ہندسہ الخوارزمی نے ایجاد کیا ۔
- کرکٹ میں اگر کوئی کھلاڑی صفر پر آؤٹ ہو جائے تو اُسے ڈک اور اگر میچ کی پہلی ہی گیند پر صفر پر آؤٹ ہو جائے تو اُسے گولڈن ڈک کہتے ہیں ۔
- ایک سے سو تک کی گنتی میں صفر کا ہندسہ گیارہ مرتبہ آتا ہے ۔
- صفر درجہ سینٹی گریڈ ۳۲ درجے فارن ہائیٹ کے اور صفر درجہ فارن ہائیٹ ۱۷٫۶۸- درجے سینٹی گریڈ کے مساوی ہوتا ہے۔
- خلاء میں تمام اشیاء کا وزن صفر ہو جاتا ہے ۔
- اگر کوئی کھلاڑی دونوں اننگز میں صفر پر آؤٹ ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کھلاڑی نے پیئر (PAIR) بنایا ہے۔ اور اگر کوئی کھلاڑی دونوں اننگز میں پہلی ہی گیند پر صفر پر آؤٹ ہو جائے تو اُسے کنگز پیئر (KING'S PAIR) کہا جاتا ہے ۔
- سائنس میں مطلق صفر درجہ حرارت ۲۷۳٫۱۵- درجہ سینٹی گریڈ یا ۴۵۹٫۶۷- درجہ فارن ہائیٹ کو کہا جاتا ہے۔ اس درجہ حرارت پر تمام اشیاء اپنے خواص کھو دیتی ہیں ۔
- ٹیسٹ کرکٹ کا سب سے زیادہ انفرادی اسکور ۳۶۵ رنز بنانے والے کھلاڑی گیری سوبرز نے صرف ایک ایک روزہ بین الاقوامی میچ میں حصّہ لیا۔ اس میچ میں وہ صفر پر آؤٹ ہوئے تھے ۔

۱

- خُدا ایک ہے ۔
- حضورِ اکرمؐ کا اسمِ مبارک احمد قرآن پاک میں صرف ایک مقام پر استعمال ہوا ہے اور وہ مقام ہے سورۂ صف آیت ۶ ۔
- قائدِ اعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل صرف ایک روپیہ تنخواہ لیتے تھے ۔
- پاکستان کے قومی ترانے میں اُردو زبان کا صرف ایک لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اور وہ لفظ ہے "کا"۔
- سعادت حسن منٹو نے صرف ایک ناول تحریر کیا تھا۔ اس ناول کا عنوان تھا "بغیر عنوان کے"۔

گنی چنی معلومات

● پاکستان میں صرف ایک مغل بادشاہ کی قبر ہے ۔ وہ بادشاہ ہے جہانگیر۔

● قدیم رومن تہذیب میں مہینے کے پہلے دن کو کیلنڈرس کہا جاتا تھا۔ یہیں سے لفظ کیلنڈر کا آغاز ہُوا۔

● پاکستان میں اب تک صرف ایک شخصیت نائب صدر کے عہدے پر فائز ہوئی ہے ۔اس شخصیت کا نام ہے جناب نورالامین ۔

● قرآنِ پاک میں صرف ایک صحابیٔ رسولؐ حضرت زید بن حارثؓ کا تذکرہ اُن کے نام کے ساتھ آیا ہے ۔ وہ مقام ہے سورۂ احزاب آیت ۳۷ ۔

● دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے صرف ایک عجوبہ آج بھی باقی ہے ۔ وہ عجوبہ ہے اہرامِ مصر۔

۲

● قرآنِ پاک میں صرف دو فرشتوں کا تذکرہ ان کے نام کے ساتھ آیا ہے ۔ وہ فرشتے ہیں جبرائیلؑ اور میکائیلؑ۔

● دنیا کے تمام سمندروں کی اوسط گہرائی دو میل ہے ۔

● دو مغل بادشاہ اپنی وفات کے وقت شاہِ ہندوستان نہیں تھے ۔ شاہ جہان اور بہادر شاہ ظفر۔

● دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے دو سمندر کے کنارے ایستادہ تھے ۔ وہ عجائبات تھے رہوڈوز کا مجسمہ اور اسکندریہ کا روشنی کا مینار ۔

● مسجدِ قبا میں دو رکعت نماز پڑھنے کا ثواب عمرے کے ثواب کے برابر ہے ۔

● بائیسکل کے لغوی معنے ہیں "دو پہیے" ۔

● اونٹ اور سؤر دو ایسے ممالیہ جانور ہیں جو تیرنا نہیں جانتے ۔

● دنیا کی آبادی میں فی سیکنڈ ۲.۶۵ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے ۔

● صرف دو سیّارے ایسے ہیں جن کا کوئی چاند نہیں ہے ۔ وہ سیّارے ہیں زہرہ اور عطارد ۔

● اسٹیٹ بینک آف پاکستان جو نوٹ جاری کرتا ہے ان میں سب سے چھوٹا نوٹ دو روپے کا ہے ۔ واضح رہے کہ ایک روپے کا نوٹ حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مال جاری کرتی ہے ۔

گنی چُنی معلُومات

۳

- کٹل فش واحد جانور ہے۔ جس کے تین دل ہوتے ہیں۔
- THREE RIVERS کینیڈا کی بندرگاہ ہے۔
- موسیقی میں تھری بیز (3 B'S) بیتھوون، براہمس اور باخ کو کہا جاتا ہے۔
- مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے ہوتا ہے۔
- صرف تین اعداد ایسے ہیں جنھیں اگر آپس میں جمع کیا جائے یا ضرب دیا جائے، حاصل یکساں رہتا ہے۔ وہ اعداد ہیں ۱، ۲، ۳، (۱ + ۲ + ۳ = ۶ اور ۱ × ۲ × ۳ = ۶)
- ٹریپولی نامی شہر تین براعظموں میں ہیں۔ ایک لیبیا (افریقہ) میں، دوسرا لبنان (ایشیا) میں، اور تیسرا یونان (یورپ) میں۔
- مرد کے کفن میں تین کپڑے ہوتے ہیں۔
- اب تک تین مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ عالمی جنگوں کے انعقاد کے باعث اولمپک کھیلوں کا انعقاد نہیں ہو سکا۔ یہ اولمپکس ۱۹۱۶ء، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۴ء میں ہونے والے تھے۔
- جاپانی شاعری کی مشہور صنفِ ہائیکو میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں۔
- سورۂ کوثر قرآنِ پاک کی سب سے چھوٹی سورۃ ہے۔ اس صورت میں صرف تین آیات ہیں۔

۴

- حضورِ اکرمؐ کا اسمِ مبارک محمدؐ قرآنِ پاک میں چار مقامات پر استعمال ہوا ہے۔
- بنیادی طور پر خون کے گروپس کی تعداد چار ہے۔ اے، بی، اے بی اور او۔
- قرآنِ پاک میں چار مساجد کا تذکرہ اُن کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ مسجدُالحرام، مسجدِ اقصیٰ، مسجدِ قبا اور مسجدِ ضرار۔
- جرمنی کے بادشاہ چارلس پنجم نے چار شادیاں کیں۔ اس کے چار بچے ہوئے، ہر بچہ چار سال کے وقفے سے مرا، اس کی فوج کے چار حصے تھے، مرتے وقت چار ڈاکٹر اس کے پاس تھے اور وہ چار بج کر چار منٹ پر فوت ہوا۔
- امریکہ رقبے کے لحاظ سے بھی دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے اور آبادی کے لحاظ سے بھی۔

گنی چنی معلومات

● پولو کی ایک ٹیم میں چار کھلاڑی ہوتے ہیں۔

● زمانۂ قدیم میں خیال کیا جاتا تھا کہ تمام اشیاء چار عناصر آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے مل کر بنی ہیں۔ زمانۂ جدید کی تحقیق کے مطابق ان چار عناصر میں سے کوئی بھی تنہا عنصر نہیں ہے۔ یہ تمام کے تمام مرکبات ہیں۔

● سورج کے بعد زمین سے قریب ترین ستارہ الفا سینچوری ہے۔ جو زمین سے ۴۶ء۴ نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔

● پاکستان میں چار شخصیات گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ، خواجہ ناظم الدین، غلام محمد اور اسکندر مرزا۔

● چوکور کے چاروں زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجے ہوتا ہے۔

۵

● باسکٹ بال کی ایک ٹیم میں پانچ کھلاڑی ہوتے ہیں۔

● قائدِ اعظمؒ کے مزار کے احاطے میں پانچ شخصیات مدفون ہیں نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، محترمہ فاطمہ جناح، جناب نور الامین اور خود قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ۔

● "ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا میں فقط پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کے اور ایک انگلستان کا" یہ بات شاہ فاروق نے کہی تھی۔

● دنیا میں سب سے بڑی آفس بلڈنگ امریکی ریاست ورجینیا میں واقع پینٹاگون کی عمارت ہے۔ پانچ کونوں والی اس عمارت میں امریکی وزارت دفاع کے دفاتر ہیں۔

● شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خان کو اردو ادب کے عناصرِ خمسہ کہا جاتا ہے۔ انھیں یہ خطاب مشہور ادیب مہدی الافادی نے دیا تھا۔

● ہر سکھ اپنے ہمراہ پانچ اشیاء ضرور رکھتا ہے جو پانچ کاف کہلاتی ہیں۔ یہ پانچ کاف ہیں کنگھا، کیس، کڑا، کچھا، کرپان۔

باقی صفحہ ۱۸۹ پر

ستیہ جیت رے   ترجمہ : آصف فرخی

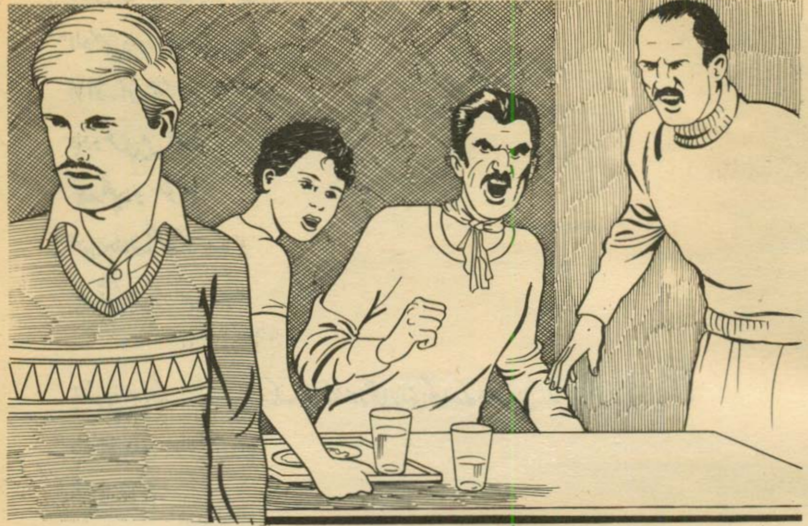

تلاش

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس پر انکشاف ہُوا کہ اُسے کچھ یاد نہیں۔ وہ اُس وقت سڑک کے کنارے ایک جنگل میں پڑا تھا اور اُس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ وہ اُٹھا اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھا تو اُسے ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی نظر آئی، جس کی اگلی اور عقبی سیٹ پر دو آدمی ساکت پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ آگے چلا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کچھ یاد کیوں نہیں آرہا ہے؟ راستے میں پیڑوں پر بنے ہوئے سیاہ اور سفید حلقوں کو سمجھنے کی کوشش سے اُس کا سر شدت سے درد کرنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُسے دُودھ پیش کر رہا ہے۔ اُس آدمی نے اُس کا نام پوچھا تو وہ نہ بتا سکا۔ ایک اور آدمی کے مشورے پر اُسے پولیس اسٹیشن لے جایا جانے لگا۔ راستے بھر وہ لوگ اُس سے مختلف سوال کرتے رہے، مگر وہ ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا۔ وہ لوگ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹّی کے لیے لے گئے۔ جہاں سے وہ غسل خانے کے راستے فرار ہوگیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ریل کی پٹڑی پر جا نکلا اور وہاں سے ایک اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل گاڑی آئی تو وہ اس میں سوار ہونے لگا۔ مگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے سوار نہ ہو سکا اور ریل چل پڑی۔ وہ ریل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا اور ایک کھلے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ اُسی وقت اندر سے ایک بازو نکلا اور کسی نے اُسے اندر گھسیٹ لیا۔ اندر گھسیٹنے والے شخص نے بھی اس سے بہت سے سوال کیے، مگر وہ اسے بھی کچھ نہ بتا سکا۔ ہاں البتہ اس نے اپنا ایک فرضی نام ارمان احمد جمال بتایا۔ اس شخص کا نام ہارون الرشید تھا اور وہ ایک بازی گر تھا اور کرتب دکھاتا تھا۔ ہارون نے اُس سے کہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسری طرف ملک کے مشہور وکیل احمد علی دانیال اپنے بیٹے ببلو کی گمشدگی کے سلسلے میں انسپکٹر سے بات کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا کہ چار آدمیوں نے ببلو کو اغوا کیا، راستے میں ان کی گاڑی کی ٹرک سے ٹکر ہوگئی۔ دو آدمی وہیں مر گئے اور دو آدمی سیمسن اور رگھوناتھ بھاگ گئے۔ ببلو گاڑی سے دُور جا گرا تھا۔ دانیال صاحب نے اِس بات پر یقین نہیں کیا اور یہ کہہ کر انسپکٹر کے کمرے سے نکل آئے کہ اگر بدمعاشوں نے تاوان طلب کیا تو وہ رقم انھیں دے دیں گے۔ پھر پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے یا نہیں، یہ اُس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہاں سیمسن اور رگھوناتھ نے شمالی کلکتہ پہنچ کر حُلیہ تبدیل کیا اور اُس بوڑھے نجومی کے پاس پہنچے، جس کے پاس وہ اغوا کی واردات کے متعلق زائچہ معلوم کرنے گئے تھے۔ انھوں نے اسے غلط پیش گوئی کرنے پر لتاڑا اور ڈرا دھمکا کر فیس میں دیے گئے دس روپوں کے بدلے اُس کی ساری جمع پونجی سمیٹ لے گئے۔ اِدھر ہارون نے ارمان کو ابراہیم بابو کے ہوٹل میں ملازم رکھوا دیا۔ ارمان کچھ ہی دن میں اپنے کام میں مشاق ہوگیا۔ اب وہ تیزی سے گاہکوں کو چائے اور کھانا لا کر دیتا۔ وہ ابراہیم بابو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اتوار کو اُس کی چھٹّی ہوتی تھی۔ اس اتوار کو ہارون اُسے شہید مینار لے گیا، جہاں میلہ لگا تھا اور لوگ قسم قسم کے تماشے دکھا رہے تھے۔ ہارون نے بھی اپنے تھیلے سے ایک عجیب و غریب بانسری نکالی اور اُس میں پھونک ماری تو بانسری کی آواز دُور دور تک جانے لگی۔ اب آپ آگے پڑھیے!

ہارون نے اس کے بعد اتنے زور کا نعرہ مارا کہ ارمان چونک پڑا۔

"واہ بھئی واہ ۔ واہ بھئی واہ
آؤ آؤ ۔ آؤ ۔ آؤ
جادو نگری میں آجاؤ
گیند اُچھالو، لٹو نچاؤ
من بہلالو دُکھ کو بھگالو
سوتے کیوں ہو اب تو جاگو
آؤ آؤ آؤ آؤ"

بانسری میں ایک مرتبہ اور پھونک مار کے اور قلابازی کھا کے، ہارون نے اپنا گیت جاری رکھا۔

" واہ بھئی واہ ۔ واہ بھئی واہ
آؤ آؤ ۔ آؤ ۔ آؤ
من بہلائے موج اُڑائے
جادو خلیفہ ہارون کے
کرتب سارے نئے نرالے
پہلے کبھی نہ دیکھے بھالے
آؤ آؤ آؤ آؤ
واہ بھئی واہ ۔ واہ بھئی واہ
آؤ آؤ ۔ آؤ ۔ آؤ
ہارون کی یہ جادو نگری
جو بھی دیکھے بھوگے مستی
ہارون کا یہ کھیل تماشا
جس نے دیکھا من کو بھایا
آؤ ۔ آؤ ۔ آؤ آؤ
واہ بھئی واہ ۔ واہ بھئی واہ

آؤ آؤ آؤ آؤ

آجا بالک آجا چھوری

موٹی دُبلی، کالی گوری

پرمی، بیری سب کا سواگت

سب کی دعوت سب کی دعوت

آؤ آؤ آؤ آؤ

واہ بھئی واہ "

"ارے میرے خدا! کیا آواز ہے!" ارمان نے سوچا۔ کتنی زوردار ہے! لوگوں کو جمع کرنے کا کیا عمدہ طریقہ ہے!" لوگ ہارون کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ اس نے دھاری دار رومال اپنے تھیلے سے نکالا اور گھاس پر بچھا دیا۔ وہ بیٹھ گیا اور دونوں طرف تھیلے میں سے چیزیں نکال نکال کر جمانے لگا۔

ارمان نے دھات کی چار چمک دار گیندیں دیکھیں جن پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے، دیو قامت لٹّو جن کے ساتھ اُسی حساب سے ڈور بھی تھی، چار پتلے بانس جن پر نیلے اور لال پر لگے ہوئے تھے، اور پانچ مختلف طرح کی ٹوپیاں، ہارون نے ان میں سے ایک ٹوپی پہن لی۔ ہارون مڑا اور ارمان سے، جو چیزوں کو ترتیب سے رکھنے میں اس کی مدد کر رہا تھا، کہنے لگا۔ "جاؤ جاکر ہجوم میں کھڑے ہو جاؤ اور ہر کرتب کے بعد تالی بجانا"

شروع کے دو تماشوں کے بعد ارمان پہلا شخص تھا جو تالی بجاتا۔ دوسرے اس کے ساتھ شامل ہو جاتے تیسرے کرتب کے بعد سے اسے پہل کرنی نہیں پڑی۔ لوگ خود بخود تالیاں بجانے لگتے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ ارمان، ہارون کے کمالات میں ایسا کھو گیا کہ تالی بجانا ہی بھول گیا۔ ہارون کے صرف ہاتھوں ہی میں جادو نہیں تھا، بلکہ اس کا سارا بدن سراپا جادو معلوم ہوتا تھا۔ ارمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ سب کیسے کرتا ہے۔ ہارون نماز کے انداز میں جھکا دیو قامت لٹّو کے گرد دھاگا لپیٹا، اُسے ہوا میں خوب اُونچا اُچھال دیا اور ڈور کے پورا لپیٹ جانے کے بعد لٹّو کو ذرا سا کھینچا۔ گھومتا ہوا لٹّو چکّر کھا کر اس کی ہتھیلی میں آجاتا، ہر بار اور ہمیشہ، کسی غلطی کے بغیر اور صرف یہی نہیں، ہارون اس گھومتے ہوئے لٹّو کو پَر لگے ہوئے بانسوں میں سے ایک کے اوپر منتقل کر دیتا اور لٹّو اس کے اُوپر گھومے جاتا۔ کیا یہی سب سے بڑا کمال تھا؟ جی نہیں! اس بانس کو اب ہارون کی اُوپر اُٹھی ہوئی ٹھوڑی پر ٹکا دیا جاتا اور بانس بھی گھومنے لگتا، اس کے لال اور نیلے پَر گھومتے ہوئے لٹّو کے نیچے چکّر کھاتے رہے! ارمان نے دیکھا کہ بانس ذرا ذرا دیر کے بعد، ہارون کی مرضی کے مطابق، تھم جاتا ہے، مگر لٹّو گھومے چلا جاتا ہے۔

گیندیں اُچھالنے کے کرتب سے ہارون کو اور بھی زیادہ داد ملی۔ اس نے دو گیندوں سے شروع کیا، تیسری بھی شامل کر لی اور ختم کیا تو چاروں گیندوں کو اُچھال کر۔ دوپہر کے سورج میں گیندیں چمکیں اور ان کے عکس سے ہارون کا چہرہ بھی دمکتا ہوا معلوم ہوا۔

یہ تماشا دن ڈھلے تک جاری رہا۔ آخر میں لوگ، اور سب تماشوں کو چھوڑ کر ہارون کو دیکھنے کے لیے آنے لگے ارمان نے حیران ہو کر دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچّے بھی ہارون کی طرف سِکّے اچھال رہے تھے حالانکہ ہارون ان کی طرف توجہ دیے بغیر اپنے کرتب پر دھیان دے رہا تھا۔ جب تماشا ختم ہو گیا تو وہ ارمان کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

"پیسے جمع کر لو۔"

جب تک ہارون نے اپنی ساری چیزیں جمع کر کے تھیلے میں رکھیں، ارمان نے سارے سکّے بٹور لیے۔ اُس نے گن کر دیکھا۔ یہ اٹھارہ روپے اور پچیس پیسے تھے۔

"چلو چلیں۔" ہارون نے اپنا تھیلا کندھے پر لادتے ہوئے کہا۔ "آج تمہاری دعوت۔ پنجابی رومالی روٹی اور تڑکا۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم نے اتنا لذیذ کھانا کبھی پہلے نہیں کھایا ہو گا۔ پھر بعد میں فیصلہ کریں گے کہ اس دعوت کے ساتھ مٹھاس میں کیا کھائیں۔"

ارمان نے کاتیایانی اسٹورز کا ایک کیلنڈر دیوار پر اپنے پلنگ کے قریب ٹانگ رکھا تھا۔ ہر شام کو وہ کام کے بعد پنسل لے کر اس پر سے ایک دن کاٹ دیتا۔ اس طرح اسے معلوم تھا کہ وہ ابراہیم بابو کے پاس سات دن سے کام کرتا رہا ہے۔ آٹھواں دن جمعرات کا تھا کہ ایک آدمی جو شکل سے خوفناک بدمعاش معلوم ہوتا تھا، چائے خانے میں داخل ہوا۔ وہ دروازے کے اُلٹی طرف والی بنچ پر، جو اس چائے خانے کی کُل آٹھ بنچوں میں سے ایک تھی، دھر کے بیٹھ گیا۔ یہ بنچ ابراہیم بابو سے سب سے زیادہ دُور تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو بالکل معمولی سا تھا۔

"اوئے" بدمعاشوں جیسی شکل والا آدمی بیٹھتے ہی چیخا۔ ارمان سمجھ گیا کہ یہ پکار اس کے لیے ہے۔ ٹھوڑی پر سفید نشان والے وہ صاحب جو روز آتے تھے اور ایک پیالی چائے اور اخبار کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھے رہتے تھے اسی وقت اُٹھ کر گئے تھے اور ارمان میز صاف کرنے کے بعد پیالی اندر باورچی خانے لے کر جا رہا تھا۔ بدمعاشوں جیسی شکل والے آدمی نے دوبارہ زور سے آواز دی۔

"دو آملیٹ اور دو پیالی چائے ادھر لاؤ، جلدی۔"

"آیا جناب۔"

ارمان حیران ہوا کہ اس کے ہاتھ آپ ہی آپ کانپنے اور اس کی آواز جواب دینے میں لڑکھڑانے لگی۔ اُس

نے یہ آرڈر باورچی خانے میں کیستو تک پہنچا دیا' پیالی نیچے ٹِکائی' جو پیسے ٹھوڑی پر سفید نشان والے صاحب نے اُسے دے دیے تھے' ابراہیم بابو کے حوالے کیے۔ اور کن انکھیوں سے دوبارہ اس بدمعاشوں جیسے آدمی کو دیکھا۔ نہیں' اُسے یاد نہیں آیا کہ اس آدمی کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ پھر اس آدمی کی آواز سُن کر اس کے ہاتھ پاؤں کیوں پھولنے لگے؟ وہ دونوں آدمی باتیں کر رہے تھے۔ معمولی شکل والے آدمی نے ماچس جلا کر دوسرے آدمی کے لیے سگریٹ سُلگایا۔

ارمان نے نگاہیں جُھکالیں اور جھاڑن ہلاتا ہوا پنّا بابو کی میز صاف کرنے چلا گیا۔ پنّا بابو ہمیشہ چائے خانے کے دوسرے گاہکوں سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے رہتے تھے۔ ابراہیم بابو انھیں آتا ہوا دیکھ کر کھڑے ہوجاتے اور جُھک کر سلام کرتے۔ پنّا بابو نے دو مرتبہ وہ کیا تھا جو چائے خانے کے کسی اور گاہک نے نہیں کیا تھا۔ انھوں نے ارمان کو دس پیسے انعام دیے۔ ارمان کو ابھی ابھی یہ سکّہ ملا تھا۔ وہ منصوبہ بنا رہا تھا کہ یہ پیسے بچا کر ہارون کا قرضہ اتارے گا۔

آملیٹ تیّار ہو رہے تھے۔ چائے خانے کے گاہک انھیں 'ماملیٹ' کہتے تھے۔ صرف ہارون انھیں "آملیٹ" کہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہارون ٹھیک کہتا تھا۔ اس لیے ارمان دِل ہی دِل میں ہمیشہ 'آملیٹ' کا لفظ ادا کرتا۔ کیستو نے چائے کی دو پیالیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ ارمان نے پُھرتی سے دونوں اُٹھائیں اور ان دونوں آدمیوں کے سامنے ایک بوند بھی چھلکائے بغیر لے جا کر رکھ دیں۔ دو دِن سے اس نے عادت بنالی تھی کہ جو چیز لا کر رکھتا اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیتا کہ کیا آنے والا ہے۔ اس نے کہا: "ماملیٹ تیّار ہے"۔

ارمان نے یہ کہتے ہوئے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ اس آدمی کا منھ ذرا سا کُھلا ہوا تھا۔ اس میں سے دھوئیں کی پتلی لکیر اُمڈ رہی تھی۔ ارمان دھوئیں کو دیکھنے کے لیے لمحے بھر کو ٹھٹھکا۔ جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑا' وہ آدمی بول اُٹھا

"اے لڑکے!"

ارمان رُک گیا۔

"کب سے کام کر رہے ہو' یہاں؟"

پولیس!

یہ پولیس ہی ہو سکتی تھی اور بھلا کون اس سے یہ سوال کرتا؟ ارمان نے سوچا کہ اُسے دِل سے کچھ گھڑ کر اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی کہ ابراہیم بابو نہ سُن سکیں۔ اس نے ابراہیم بابو کی طرف نظر دوڑائی وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے۔ اچھّا ہوا!

"بہت دِن سے جناب"۔ ارمان نے جواب دیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"ارمان"

اپنا نام ارمان بتانے میں تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ یہ نام بھی تو اُس نے دِل سے گھڑ لیا تھا۔

"تم نے بال کٹوائے تھے؟"

"بہت دن ہو گئے جناب"۔

"ادھر آؤ"۔

کیستو نے باورچی خانے سے آواز دی۔ آملیٹ تیار تھے۔

"میں جا کر مالیٹ لاتا ہوں صاحب"۔

ارمان گیا، کیستو سے دو پلیٹیں لیں اور لا کر اِن دونوں آدمیوں کے سامنے رکھ دیں۔ وہ میز نمبر ۲، سے نمک اور مرچ لے آیا۔ دونوں آدمی باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ میز نمبر ۴ کی طرف چلا گیا۔ ایک نیا گاہک اندر آیا۔

دونوں آدمیوں نے کھانا ختم کیا۔ بدمعاشوں جیسی شکل والے آدمی نے ارمان کو پیسے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"تمھاری کُہنی پر چوٹ کیسے لگی؟"

"دیوار سے کھرپنچ لگ گئی"۔

"دن بھر میں کتنے جھوٹ بول لیتے ہو، دوست؟"

ارمان کو اس آدمی کے بات کرنے کا یہ طریقہ اچھا نہیں لگا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس نے اس آدمی کو پہلے نہیں دیکھا اس نے فیصلہ کیا کہ ہارون کو بتا دے گا۔

"جواب کیوں نہیں دیتے؟"

وہ آدمی اسے گھور رہا تھا۔ ابراہیم بابو گلی میں سے داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے اندر آتے ہی پوچھا۔ اُن کے ذہن میں ارمان کو اس طرح کھڑے دیکھ کر شُبہ پیدا ہو گیا۔

"یہ صاحب پوچھ رہے تھے..."

"کیا؟"

"کہ میں یہاں کتنے دن سے کام کر رہا ہوں؟"

ابراہیم بابو نے ان دونوں میں سے لمبے آدمی کی طرف دیکھا' اور بہت دھیمے لہجے میں کہا!
"کیوں جناب؟ آپ کا اس سے کیا کام ہے؟"
اس آدمی نے پیسے میز پر دے مارے اور ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا آدمی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
ارمان دن بھر اتنا مصروف رہا کہ دوپہر تک وہ اس واقعے کے بارے میں سب بھول چکا تھا۔

ہارون چار بجے کے قریب وہاں آیا۔ اس نے ارمان سے وعدہ کیا تھا کہ اُسے اپنے رہنے کی جگہ دکھائے گا ابراہیم بابو اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ ارمان کو جلدی چھٹی دے دیں گے۔ کیستو کا لڑکا سوتو' دکان بند ہونے کے وقت تک تین گھنٹے کے لیے کام سنبھال لے گا۔ سوتو کو سارا کام معلوم تھا' لیکن اسے ہفتے میں تین مرتبہ بُخار چڑھ جاتا تھا۔
"میں آج تمھیں ایسی چیز دکھاؤں گا کہ تمھاری آنکھیں کُھل جائیں گی" وہ چائے خانے سے باہر آنے لگے تو ہارون نے کہا۔ ارمان اس قدر خوش تھا کہ اس نے ان دونوں آدمیوں کو سڑک کے دوسری طرف پان کی دکان پر کھڑے ہوئے نہیں دیکھا۔
ہارون بسوں سے کتراتا تھا۔ ڈنڈوں کو پکڑ کر چڑھنے اور کھڑے رہنے سے اس کے ہاتھوں کو چوٹ لگ سکتی تھی' اس نے بتایا۔ "میرے ہاتھ تو میری دال روٹی ہیں" اس نے کہا۔ "اس لیے اپنی ٹانگوں کا استعمال کریں۔"
ہارون اور ارمان تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اور سڑکوں کو پار کرتے ہوئے ایک پُل تک آن پہنچے' جس کے نیچے سے اندرون شہر چلنے والی ریلیں گزرتی تھیں۔ اس پُل سے سیڑھیاں اس محلے میں جاتی تھیں جس میں ہارون رہتا تھا۔ ارمان نے دیکھا کہ یہ گنجان آباد محلّہ کافی بڑا تھا' اور بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ کارخانوں کی چمنیاں ناریل کے پیڑوں پر دور سے چھائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دھویں کا گھنا بادل سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا ہارون نے بتایا کہ یہ دھواں کوئلے کے اسٹور سے آتا ہے جو شام ڈھلے ہر گھر میں جل اُٹھتے ہیں۔
"یہاں ہر مذہب کے لوگ رہتے ہیں" ہارون بتانے لگا "ہندو' مسلمان' عیسائی۔ ان میں سے بعض بہت ہنرمند کاریگر ہیں' جن کی مہارت پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بڑھئی ہے' جس کا نام جمیل ہے' وہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آتا ہے اور گانا سُناتا ہے۔ میں اپنے لکڑی کے اسٹول پر اس کے لیے طبلہ بجاتا ہوں۔ وہ اتنا اچھا گاتا ہے کہ سُننے والے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔"

باقی آئندہ

"پ" سے پاکستانی قوم

" ایران میں کون رہتا ہے "؟

" ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے"۔

" انگلستان میں کون رہتا ہے؟ "

" انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے"۔

" فرانس میں کون رہتا ہے؟

" فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے"۔

" یہ کون سا ملک ہے "؟

" یہ پاکستان ہے"۔

"اس میں پاکستانی قوم رہتی ہے؟"

"نہیں اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی"۔

" اس میں سندھی قوم رہتی ہے"۔

" اس میں پنجابی قوم رہتی ہے"۔

"اس میں یہ قوم رہتی ہے"۔

"اس میں وہ قوم رہتی ہے"

" لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔! سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں! .....
بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔!... پھر یہ الگ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟"

" غلطی ہوئی، معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔!" (ابنِ انشاء)

عبدالوہاب، نارتھ کراچی

نیّر ابدالی

سمندر کی ملکہ

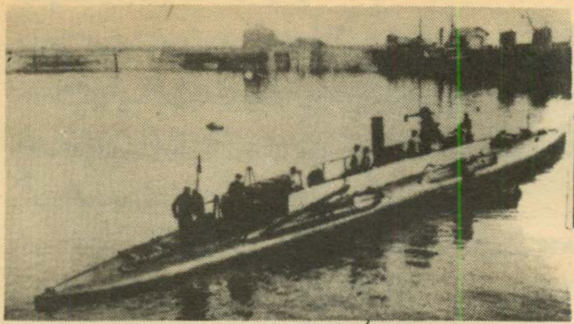

۱۹۰۵ء کی ایک فرانسیسی آبدوز

جس طرح پرندوں کو ہَوا میں اُڑتا دیکھ کر انسان نے ہَوائی جہاز بنایا، اسی طرح پانی میں تیرتی مچھلیوں کو دیکھ کر آبدوز بنانے کا خیال بھی یقیناً کسی کو آیا ہوگا۔ پہلے یہ خیال ناممکن تھا مگر انسان کے عزم نے اُسے ممکن کر دکھایا۔ پانی کی سطح کے نیچے سفر کرنے والی کشتی پر پہلا تفصیلی مضمون سترہویں صدی میں ایک برطانوی ریاضی دان اور بحری علوم کے ماہر ولیم بورن نے شائع کیا۔ اس میں جس آبدوز کا نقشہ بنایا گیا تھا وہ لکڑی کے ڈھانچے کا بنا ہوا تھا اور اس پر چمڑے کی جلد چڑھی ہوئی تھی۔ مگر بورن محدود وسائل کی بنا پر ایسی آبدوز نہ بنا سکا۔

دنیا کی پہلی آبدوز بنانے کا قابلِ فخر کارنامہ جس شخص نے انجام دیا وہ ہالینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا نام کارنیلئس وان ڈریبل CARNELIUS VAN DREBBEL تھا اُس نے ۱۶۲۰ء اور ۱۶۲۴ء کے درمیان ایک آبدوز تیار کی اور اُسے دریائے ٹیمز میں بارہ تا پندرہ فٹ کی گہرائی میں اُتارنے میں کامیاب ہوا۔ پھر اس شعبے میں تحقیق اور مسابقت کا سفر جاری رہا اور ۱۷۷۵ء کے بعد ڈیوڈ بشنیل نامی ایک طالب علم نے "جنگی فاختہ" نامی ایک آبدوز بنائی جو اخروٹ کی شکل سے مشابہ تھی۔ اس میں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ پھر ۱۸۰۱ء میں رابرٹ فلٹن نامی امریکی نے فرانس میں ایک آبدوز بنائی یہ اس دور کی جدید آبدوز تھی جو لوہے اور پیتل کی شیٹ سے بنائی گئی تھی اس میں چار افراد دو جلتی ہوئی موم بتیوں سمیت تین گھنٹے زیرِ آب رہ سکتے تھے۔ اس آبدوز کو مرضی کے مطابق گہرائی میں اُتارا یا اُوپر کیا جا سکتا تھا۔ حکومتِ فرانس نے جب فلٹن کی اس ایجاد کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تو وہ برطانیہ چلا آیا اور یہاں اُس نے اپنی آبدوز کے ذریعے "ڈورو تھی" نامی دو مستول کے جہاز کو تجربے کے طور پر غرق کیا۔

اس کے بعد فلٹن امریکہ چلا گیا اور وہاں کانگریس کی حمایت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس کا ارادہ اسٹیم انجن

سے چلنے والی آبدوز بنانے کا تھا جس میں سو افراد کی گنجائش ہو۔ مگر موت نے فلٹن کو اس کام کی تکمیل کا موقع نہ دیا اور "میوٹ" نامی یہ آبدوز مکمل ہوئے بغیر پانی میں گلنے لگی اور بالآخر لنگر گاہ میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں ایک انگریز پادری نے بھاپ سے چلنے والی آبدوز بنائی جو زیرِ آب کئی میل کا سفر کر سکتی تھی۔ اُنہی دنوں سویڈن کے ایک ڈیزائنر نے بھی بھاپ سے چلنے والی آبدوز بنائی جو پانی میں پچاس فٹ کی گہرائی میں جا سکتی تھی۔ اس آبدوز میں پہلی مرتبہ تارپیڈو ٹیوب لگائی گئی تھی۔

خوب سے خوب تر کی تلاش میں فرانسیسی بحریہ کے دو افسروں نے ۱۸۶۴ء میں ایک سو چھیالیس فٹ طویل آبدوز بنائی جو اسّی ہارس پاور کے انجن سے چلتی تھی۔

پھر برقی ایجادات نے انسانی ترقی کے نئے باب کھولے۔ ۱۸۸۶ء میں دو انگریزوں نے پچاس ہارس پاور کے برقی انجن سے چلنے والی آبدوز بنائی۔ اس برقی انجن میں سو بیٹری سیل لگے تھے جو آبدوز کو اسّی میل تک سفر کرا کے ختم ہو جاتے تھے۔ سطحِ آب پر آبدوز کی رفتار چھ ناٹ فی گھنٹہ تھی۔ (ایک ناٹ تقریباً ایک میل کے برابر ہوتا ہے) حقیقت میں انیسویں صدی کا یہ دور آبدوزوں کی ترقی کا زمانہ تھا۔ ایک فرانسیسی میرین انجینئر میکسم لائے بوف نے ۱۸۹۹ء میں ایک سو گیارہ فٹ طویل آبدوز بنائی جو پانی کی سطح پر اسٹیم انجن سے اور پانی کے نیچے برقی موٹر سے چلتی تھی۔ اس نے اپنی اس ایجاد کا نام "ناروَل" رکھا۔ اس آبدوز نے رُودبارِ انگلستان میں اڑتالیس گھنٹوں کا بحری گشت نہایت کامیابی سے مکمل کیا۔ اس سے قبل سائمن لیک نامی ایک شخص نے "پروٹیکٹر" کے نام سے آبدوز بنا کر زارِ روس کو فروخت کی تھی۔

بیسویں صدی کے شروع ہونے کے بعد تقریباً تمام یورپی ممالک کے بحری بیڑے میں آبدوزیں شامل ہو چکی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں شروع ہونے والی پہلی جنگِ عظیم میں یہ آبدوزیں بحری جنگ کا بڑا کامیاب ہتھیار ثابت ہوئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران اِن آبدوزوں کی اہمیت بڑھ چکی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران استعمال ہونے والی آبدوز کی رفتار ۱۷/۲۱ ناٹ فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ جس میں ساڑھے تین انچ قطر کی ڈیک گن، مختلف اینٹی ایئر کرافٹ گنیں اور کئی تارپیڈو ٹیوب لگی ہوتی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم جب ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی تو اپنے بحری بیڑے کو مضبوط کرنے کے لیے امریکہ نے ڈیزل انجن سے چلنے والے اکیس آبدوز تیار کیے۔ جن میں خطرناک گائیڈڈ میزائل اور راڈار پکٹ لگے ہوتے تھے۔

چونکہ دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اس لیے ایٹم کی قوت سے چلنے والی آبدوز کی

۱۹۵۸ء کی ایک امریکی ایٹمی آبدوز

تیاری کا کام مختلف ممالک نے شروع کیا۔ مگر امریکہ سب سے سبقت لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ دنیا کی پہلی ایٹمی آبدوز ۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کو سمندر میں اتاری گئی۔ یہ آبدوز تین سو بیس فٹ طویل تھی۔ اس کا وزن تین ہزار پانچ سو تیس ٹن تھا۔ اس ایٹمی آبدوز میں چھ تارپیڈو ٹیوب نصب تھیں اور اس کی رفتار بیس ناٹ فی گھنٹہ تھی۔ پھر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصے میں ایسی آبدوزیں بنائی گئیں جو انتہائی جدید ہتھیاروں سے لیس ہوتی تھیں اور جو چار سو فٹ سے زیادہ طویل تھیں اور ان کا وزن ساڑھے چھ ہزار ٹن سے زائد تھا۔

بحری جنگ میں مؤثر دفاع کے علاوہ اب آبدوزوں سے سمندری تحقیق اور سمندر میں مختلف معدنیات کی تلاش کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔ ایٹمی قوت سے چلنے والی آبدوزیں زیرِ آب مہینوں رہ سکتی ہیں اور جنگ کی صورت میں پانی کی سطح پر آئے بغیر یہ مختلف نیوکلیئر میزائل بھی فائر کر سکتی ہیں۔ آج کی جدید آبدوز مکمل ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہے۔ کھانے پکانے کے لیے الیکٹرک کچن اور مکمل سامان، ڈائننگ روم، چھوٹا سا سینما ہال اور عملے کے آرام کے لیے نہایت آرام دہ بستر ہوتے ہیں۔ آبدوز کا سب سے اہم مرکز اس کا کنٹرول روم ہوتا ہے جہاں سے پائلٹ راستے کا تعین کرتا ہے۔ وہ اپنے سامنے لگے ہوئے ٹیلی وژن اسکرین کے ذریعے اپنے روٹ پر آبدوز چلاتا ہے۔ آج کل جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی آبدوزوں میں جدید ترین راڈار لگے ہوتے ہیں جو دشمن کی آبدوزوں یا بحری جہازوں کی بروقت نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۱ر انچ قطر کی ۲۱ر فٹ لمبی تارپیڈو ٹیوب لگی ہوتی ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اب بحری فوج کا اپنے عزم اور حوصلے کے بعد سب سے بڑا ہتھیار آبدوز ہی ہے۔

قالین اور سیاہی

محمد امان خان دِل

ابّو نے دیکھ لی ہے قالین پر سیاہی
یارب ہو خیر میری لگنی ہے اَب پٹائی

مجھ پر ہی شک کریں گے میں یہ بھی جانتا ہوں
بچہ ہوں پھر بھی گھر میں سب سے بڑا ہوں بھائی

پوچھیں گے جب وہ مجھ سے میں کیا جواب دُوں گا؟
سوچا تو ذہن میں اِک ترکیب میرے آئی

کہہ دُوں گا بے دھڑک میں چھوٹے کی ہے یہ حرکت
قالین پر گرائی اُس نے ہی روشنائی

چھوٹی بہن نے لیکن بیڑا مِرا ڈبویا
تھی بات جو حقیقت اُن کو بتا کے آئی

ابّو دوات بالکل ٹیبل کے درمیاں تھی
کرکٹ کی گیند سے یہ بھائی نے ہے گرائی

سُن کر یہ بات اُس کی میں نے کہا کہ جھوٹی
ابّو قسم خُدا کی میں نے نہیں گرائی

پھر دوستو! نہ پوچھو، بعد اِس کے حال میرا
تلقین بھی ہوئی تھی، اور ساتھ ہی پٹائی

کمرہ ہے بیٹھنے کا میدان تو نہیں ہے
اتنی سی بات بھی کیا تم کو سمجھ نہ آئی

بیٹے! یہ جانتے ہو کتنی بُری ہے عادت
غلطی بھی کی ہے تم نے جھوٹی قسم بھی کھائی

غصّے میں اُن کو اکثر کہتے ہوئے سُنا ہے
کرکٹ عروج پر ہے اور طاق پر پڑھائی

گزرا جو ورلڈ کپ ہے اُس سے سبق تو سیکھو
کیسی ہوئی ہے توبہ! کرکٹ میں جگ ہنسائی

کرکٹ میں کیا رکھا ہے کیا کھیل کر کرو گے
کاغذ قلم سے کھیلو ہے جس میں ہر بھلائی

سیّد خورشید عالم

دو افسانے دو کِردار

آپ نے سُنا ہوگا کہ ادیب کے تخیّل اور اس کے قلم میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے جس کی مثال یہ ہے کہ وہ بعض ایسے کرداروں کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتا ہے جو امر ہو جاتے ہیں۔ پڑھنے والے ان کرداروں کو جیتا جاگتا کردار سمجھ کر پڑھتے ہیں اور ان سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ کہانی میں جب وہ کردار کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو پڑھنے والے پریشان ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی مہم کو سَر کرتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ادیبوں نے ایسے بے شمار کردار تخلیق کئے لیکن آج جن کرداروں سے ہم آپ کو متعارف کرائیں گے وہ ایسے کردار ہیں جن کے نام سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ اور ممکن ہے ان کی آپ نے فلمیں بھی دیکھ رکھی ہوں۔

شرلاک ہومز SHERLOCK HOLMES : اس مشہورِ زمانہ کردار کو پہلی مرتبہ ۱۸۸۷ء میں مشہور انگریز ادیب سر آرتھر کانن ڈائل SIR ARTHUR CONAN DOYLE نے اپنی ایک کہانی میں متعارف کرایا۔ ڈائل ۲۲ مئی ۱۸۵۹ء کو اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈن برگ میں پیدا ہوئے۔ جب ڈائل ایڈن برگ میں میڈیکل اسکول میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک استاد ڈاکٹر جوزف بیل DR. JOSEPH BELL کی پرکشش شخصیت سے بے انتہا متاثر تھے۔ اسی لئے...... اٹھائیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنا یہ مشہورِ زمانہ

کردار تخلیق کیا۔ شرلاک ہومز کو بلاشک وشبہ آج کے جدید دور کے سراغرسانوں کا پہلا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کردار نے جاسوسی ادب میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ شرلاک ہومز ایک خوبصورت اور سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باعمل انسان ہے اور عمل کے فوائد پر یقین رکھتا ہے۔ اکثر وہ کیمسٹری، ادب فنونِ لطیفہ اور مختلف علوم وفنون پر سیر حاصل بحث کرتا نظر آئے گا۔ اسے مختلف اقسام کے سگار پینے کا شوق ہے۔ وہ بہت اچھا وائلن بجا سکتا ہے۔ اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ ہومز ایک انتہائی نڈر اور بے باک طبیعت کا مالک ہے۔ وہ ایک بہت اچھے اخلاق کا مالک ہے۔ اسی لئے اس سے ہر کوئی محبّت کرتا ہے۔ شرلاک ہومز کے تمام کارناموں میں اس کا ایک باہمّت دوست بھی شریک رہتا ہے جس کا نام ڈاکٹر جان ایچ واٹسن .... DR. JOHN H. WATSON ہے یہ شرلاک ہومز کے انتہائی مخلص دوستوں میں سے ہے۔ چونکہ آرتھر کانن ڈائل خود کثیر المطالعہ شخص تھے اسی لئے انہوں نے شرلاک ہومز کو انتہائی ذہین اور فطین سراغرساں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ہومز پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کا بھی نہایت باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے۔ پھر ان کا تجزیہ کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ اکثر وہ ان معاملات پر اپنے دوست ڈاکٹر واٹسن سے

تبادلۂ خیال اور بحث کرتا نظر آتا ہے اور یہی بحث ہومز کی ذہانت کے نئے گوشے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ جاسوسی ادب میں یوں تو ہومز کے کردار سے بہت پہلے مشہور ادیب ایڈگر ایلن پو EDGAR ALLAN POE کی ایک تخلیق سامنے آئی تھی۔ اور یہ کردار آگسٹ ڈیوپن AUGUST DUPIN تھا مگر انگریزی جاسوسی ادب میں جو مقام شرلاک ہومز کو حاصل ہوا، ڈیوپن اس سے محروم رہا۔ شرلاک ہومز کے کارناموں پر لکھے گئے ناول دنیا کی ہر زبان میں منتقل ہو کر ہر دور اور ہر عمر کے لوگوں میں بہت زیادہ پڑھے گئے۔ اس لافانی کردار پر ہالی ووڈ میں بے شمار فلمیں بن چکی ہیں جو دنیا کے ہر حصّے میں بہت شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کردار کے خالق ڈائل خود بھی اس کردار سے بے انتہا متاثر تھے۔

جیمز بونڈ 007 JAMES BOND : جاسوسی ادب کا ایک اور ناقابلِ فراموش کردار جیمز بونڈ بھی ہے۔ یہ برطانیہ کی سیکرٹ سروس کا انتہائی ذہین اور ہوشیار ایجنٹ ہے۔ بونڈ کے خالق آئن فلیمنگ IAN FLEMING تھے بلاشبہ جیمز بونڈ بیسویں صدی کا ایسا ہیرو ہے جو سب کا آئیڈیل بن گیا ہے۔ بونڈ دراز قد اور پُرکشش شخصیت کا مالک ایک تعلیمیافتہ اور انتہائی بہادر انسان ہے۔ جو قابلیت ایک اچھے جاسوس اور سیکرٹ ایجنٹ میں ہونی چاہیئے، وہ سب اس میں موجود ہے۔ بونڈ کے کارناموں پر مشتمل پہلا ناول کیسینو رائل CASINO ROYALE تھا جو ۱۹۵۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ برطانوی سیکرٹ ایجنٹ جس کا نمبر .. ہے، جہاں جاتا ہے موت اور ہنگامے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ قدم قدم پر انتہائی خطرناک مجرم اس کا راستہ روکتے ہیں مگر جیمز بونڈ ان سب سے پیچھا چھڑا کر اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے کیونکہ یہی اس کا اصل فریضہ ہے۔ جیمز بونڈ کے ناولوں اور فلموں میں انتہائی خطرناک مناظر، بین الاقوامی جاسوسی کا جال اور انتہائی جدید سائنسی آلاتِ حرب نظر آتے ہیں۔ یہ کردار دست بدست لڑائی کا ماہر، بہترین نشانہ باز، بہترین کار ڈرائیور اور بہت سارے فنون کا ماہر ہے۔ اسی لئے بعض اوقات دشمنوں کے نرغے میں گھر جانے کے باوجود وہ صحیح سلامت لوٹ آتا ہے۔ جیمز بونڈ پر لکھے گئے ناول دنیا کی گیارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کردار پر لکھے گئے ناول ایک کروڑ اسّی لاکھ سے زائد کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ خطرناک سے خطرناک مہم جس پر دوسرے سیکرٹ ایجنٹ جاتے ہوئے گھبراتے ہوں اس پر جب جیمز بونڈ کا باس اسے بھیجتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بونڈ اس مہم سے سرخرو لوٹے گا۔ اس لئے کہ دشمن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اور راستے کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں وہ ان سب کا حل ڈھونڈ نکالے گا۔ جیمز بونڈ پر اب تک ایک درجن سے زائد فلمیں بن چکی ہیں۔ ان فلموں کے ذریعے اب بچّہ بچّہ بھی زیرو زیرو سیون جیمز بونڈ 007 JAMES BOND کو اچھی طرح جانتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ زیرو زیرو سیون کے اعداد بھی اب بہادری اور شجاعت کی علامت بن چکے ہیں کیونکہ یہی نمبر جیمز بونڈ کا بھی ہے۔

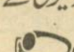

ملک جاوید اقبال

گاؤں میں جو کرکٹ کھیلی جاتی ہے، اس کا قصّہ مجھے ایک میرے دوست نے سُنایا۔

مقامی ٹیم نے ٹاس جیتا۔ اُس سکّے کی مدد سے، جس کے دونوں طرف چہرے تھے۔ پھر مقامی بیٹسمین نے ہٹ لگاکر گیند کو اُس چھوٹے مگر گہرے تالاب میں پہنچا دیا جو باؤنڈری لائن کے اندر تھا۔ فیلڈر ڈوبی ہوئی گیند کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور دونوں بیٹسمین رنز بنا رہے تھے، پہلے بھاگتے رہے پھر اطمینان سے پیدل چلنے لگے۔ مخالف ٹیم کے کپتان نے اعتراض کیا تو اُسے کرکٹ کے قوانین والی کتاب دکھائی گئی۔ جس میں لکھا تھا کہ جب تک گیند باؤنڈری لائن تک نہ پہنچے، کیچ نہ ہو جائے، وکٹ کیپر یا بولر کے ہاتھ میں نہ آ جائے بیٹسمین رنز بنا سکتے ہیں۔ ڈوبی ہوئی گیند نہ مل سکی اور مقامی ٹیم نے ۲۰۱ رنز پر اننگز ختم کرنے کا اعلان کیا۔ مخالف بیٹسمین کھیلنے آئے تو مقامی فاسٹ بولر نے لمبا اسٹارٹ لیا۔ بھاگتا ہوا آیا۔ ابھی وکٹ سے کچھ دُور تھا کہ بائیں طرف مُڑ گیا۔ اور میدان کے پانچ چھ چکّر لگاتے پھر وکٹوں کی طرف آیا لیکن اس مرتبہ دائیں طرف مُڑ کر میدان کے چکّر لگانے لگا۔ مخالف ٹیم کے کپتان کے اعتراض پر کرکٹ کے قوانین کی کتاب دوبارہ دیکھی گئی، جس میں لکھا تھا کہ بولر جتنا لمبا اسٹارٹ لینا چاہے، لے سکتا ہے۔

چنانچہ وہ بولر، جو لمبی دوڑوں میں انعام حاصل کر چُکا تھا اور درحقیقت کرکٹ کا کھلاڑی نہیں تھا تقریباً دو گھنٹے تک اسٹارٹ لینے میں مصروف رہا۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی اور کرکٹ کے قانون کے مطابق روشنی کم ہو جانے پر کھیل ختم کر دیا گیا۔

... لیکن گاؤں کے لوگ بہت خوش تھے کہ میچ ڈرا ہو گیا۔

انورِ کلیم بلوچ

کمرۂ عجائب

جُوں ہی موسمِ سرما کی چُھٹیاں ہوئیں، ایک دن صبح کے ناشتے پر ہم نے کھانا کھاتے ہوئے اعلان کیا۔۔۔ "آج سے ہم عجیب وغریب، مگر قیمتی اشیاء جمع کریں گے۔" ہم نے دیکھا کہ ابا جان ہمیں حیرت سے تک رہے ہیں جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ الفاظ ہم نے ہی کہے ہیں۔ باقی افراد کے ہاتھوں سے نوالے چھُوٹ کر گرے۔

"بھائی جان! کیا آپ کیلیے اس گھر میں کم ہیں؟" چھوٹے بھائی کاشف نے کچھ حیرت سے کہا۔ ہم نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا مگر خاموش رہے۔

"بیٹے۔۔۔ ذرا تفصیل سے بتانا"۔ ابا جان نے حیرت سے پوچھا۔

"ابا جان! ہمارے اِردگِرد، بظاہر بہت ہی بیکار چیزیں پڑی ہیں مگر اصل میں وہ بہت قیمتی ہوتی ہیں اور بعض سے ہمارے بزرگوں کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں، میں ایسی چیزیں جمع کروں گا۔ بلکہ وہ جو ہمارا ایک بڑا

ساکمرہ بیس سال سے بند پڑا ہے۔ اور جس میں کاٹھ کباڑ کھڑکی کے ذریعے اندر پھینکا جاتا ہے، اُسے صاف کر کے اچھی اور قیمتی چیزیں وہاں سجاؤں گا۔" ہم نے تفصیل بیان کرتے ہی جگ سے پانی کا گلاس بھرا اور غٹا غٹ پی گئے۔ بات ختم ہونے پر سوائے ابّاجان کے باقی لوگ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگے۔

"شاباش بیٹے... اکرکٹ کھیلنے سے بہتر ہے کہ تم یہ مشغلہ اپناؤ۔ میری طرف سے چھٹی جماعت کا وہ کورس عطیے کے طور پر رکھ لو، جسے تین سال مسلسل پڑھنے کے باوجود تم اب تک پاس نہیں ہو سکے ہو۔" ابّا جان نے جوشیلے لہجے میں کہا اور یہ بات سنتے ہی سب نے بڑے جوش سے نعرہ مارا: "ابّا جان... زندہ باد!"

"بھئی کیا یہاں الیکشن لڑا جا رہا ہے...؟" انکل فاران اندر آتے ہوئے بولے۔ جواب میں، ہم نے اُنھیں ساری بات تفصیل سے بتائی جسے وہ سُن کر خوش ہو کر بولے "بھئی واہ... انور میاں ہماری طرف سے ایک سائیکل تمھارے اس "عجائب گھر" کے لیے حاضر ہے یہ سائیکل ہمیں مرحوم ابّاجان نے ہماری بے حد فرمائش پر دلائی تھی۔ جسے ہم نے پہلی مرتبہ چلانے کی کوشش کی تو اپنے دو دانت تڑوا بیٹھے پھر ہم اُس سائیکل پر کبھی سوار نہیں ہوئے۔"

ہم نے اس ہمّت افزائی پر کہا "بہت بہت شکریہ انکل!"

"بھائی جان!" کاشف نے ہمیں پھر مخاطب کیا: "آپ اپنے رسالے "بچوں کا چمن" کے پہلے شمارے کی نو سو پچاس کاپیاں بھی رکھیں گے نا، جس کے بعد اس کا کوئی شمارہ نہ چھپ سکا... اور وہ کرسی بھی رکھئے گا جس پر بیٹھ کر آپ نے "ایڈیٹری" کی تھی۔"

"اں انور میاں... وہ کاپیاں تم پکوڑے والوں کے ہاتھوں بیچ دو۔" انکل فاران نے بھی ہمیں دل جلانے والا مشورہ دیا۔

"ہاں ہاں، پندرہ سو روپیہ شائع کرانے پر خرچہ آیا... پکوڑے والے پچاس روپے تو بخوشی دیں گے۔" کاشف نے پھیر کہا تو ہم نے وہاں سے نو دو گیارہ ہونے میں ہی عافیت جانی۔ وہ غصہ دلا کر شاید ہمیں ہمارے مقصد سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔

"انور میاں کہاں جا رہے ہو؟" اس آواز پر ہم نے چونک کر دیکھا تو محلّے کے عظیم شاعر اشرف اُداس صاحب اپنے دروازے پر کھڑے نظر آئے جل تو جلال تو کا وِرد کرتے ہوئے ہم نے اور تیز چلنا شروع کیا اور بغیر مُڑے جواب دیا: "ضروری کام ہے۔"

ہمارا جواب سُنے بغیر انھوں نے حُکم دینے والے انداز میں کہا "ذرا ادھر تو آنا" ناچار اُن کے پاس پہنچے،

کہ عمر کا لحاظ تو بہر حال کرنا ہی تھا انھوں نے ہم سے پھر پوچھا کہ کہاں کا قصد ہے تو ہم نے اپنے نئے منصوبے سے اُنھیں آگاہ کیا۔

"واہ وا۔۔۔ کیا ذوقِ قدر دانی ہے۔۔۔ بھئی میری طرف سے پانچ دیوانوں کا تحفہ بھی حاضر ہے، یہ تحفہ یقیناً تمام چیزوں سے منفرد لگے گا!" ان کا مطلب دیوانے، یعنی کئی عدد پاگل نہیں تھا، بلکہ شاعری کے پانچ دیوان۔ ہم نے انکساری سے شکریہ ادا کیا کہ محلے کے عظیم شاعر کا یہ تحفہ دیدۂ عبرت کے لیے یقیناً قیمتی ثابت ہوگا۔ اگلے دن دیوان وصول کرنے کا وعدہ کرکے اُن سے رخصت ہوئے۔ پھر وہ دن تمام دوستوں سے ملنے اور انھیں نئے منصوبے سے آگاہ کرنے میں صرف کیا۔ منصور نے وعدہ کیا کہ وہ اس عجائب خانے کے لیے اپنے ماموں ڈاکٹر کا وہ بل مہیا کرے گا جسے دیکھ کر تندرست ہونے والا مریض خدا کے ہاں فریاد کرنے اگلے جہاں چلا گیا تھا۔ طاہر نے وعدہ کیا کہ وہ اپنا "خاندانی ریڈیو" فراہم کرے گا۔ جسے دیکھ کر ایک ریڈیو میکینک نے کہا تھا کہ کسی جادوگر سے رابطہ قائم کیجیے جو اس ریڈیو کے تخلیق کار کو پھر زندہ کرکے اس کی مرمت کرا سکے۔ طاہر کا مشورہ یہ بھی تھا کہ اُس ریڈیو کو قومی عجائب گھر میں رکھوا دیا جائے تاکہ پتہ چل سکے کہ ایک اچھی بھلی ایجاد کو ہم کس طرح عجیب وغریب ایجاد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

بہر حال، دوسرے دن سویرے ہی ہم اپنے دونوں دوستوں منصور اور طاہر کی موجودگی میں بیس سال کا زنگ آلود تالا توڑ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے تالا ٹوٹا تو یقین ہُوا کہ تالا علی گڑھ کا ہوگا۔ دروازہ کھول کر چند لمحے انتظار کیا تاکہ گندی ہوا باہر نکل جائے۔ سب سے پہلے ہم ہی اس کمرے میں داخل ہوئے، ہمارے دماغ میں بھی ابھی ہم ٹارچ روشن بھی نہ کر پائے تھے کہ منصور نے چیخ ماری، ہم گھبرا گئے اور ٹارچ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری! ابھی ہم چیخنے کا سبب پوچھنے ہی والے تھے کہ ہمارے چہرے سے کوئی چیز آکر ٹکرائی یہ یقیناً کوئی چمگادڑ تھی ہم گھبرا کر پیچھے ہٹے تو طاہر سے ٹکرا کر گر پڑے۔ دوسرے ہی لمحے ہم چیخ اُٹھے۔ ہمارا سر کسی لوہے کے پائپ سے جا لگا تھا۔

"بھئی، کیا ہُوا؟" باہر سے ابا جان نے پوچھا تو ہم سنبھل گئے۔

"کچھ بھی نہیں، ابا جان" ہم نے تسلی دی مگر ہماری آواز کانپ رہی تھی اللہ اللہ کر کے ٹارچ ملی۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ منصور اور طاہر بھی کانپ رہے تھے۔ منصور کے چہرے پر خراش نما لکیریں تھیں۔ پھر ہم نے آپس میں طے کیا کہ لالٹین لا کر رکھ دی جائے۔ بجلی کا بورڈ تو تھا مگر بلب غائب تھا۔ بہر حال روشنی کا بندوبست کرکے ہم نے کاٹھ کباڑ باہر نکالنا شروع کیا۔ ہماری محنت سہ پہر تک جاری رہی۔ کباڑ خانے کی صفائی کرتے

ہوئے ہمیں کئی یادگار زخم لگے۔ کمرہ کباڑ سے صاف ہُوا مگر ابھی ایک بڑی سی پُرانی الماری باقی تھی۔ ہم تینوں اُس سے جونک کی طرح چمٹ گئے اور لگے اُسے باہر کی طرف کھینچنے۔ الماری اپنی جگہ سے کیا کھِسکتی، ہماری آنکھوں کے سامنے سے روشنی کھسک گئی۔ ہُوا یوں کہ پوری قوت کے ساتھ الماری کو کھینچنے کی وجہ سے الماری کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی جھٹکا لگا اور دوسرے ہی لمحے الماری ہمارے اور منصور کے اُوپر تھی مجھے جو آخری بات یاد ہے، وہ اپنی اور منصور کی چیخیں تھیں۔

جب ہوش آیا تو ہم اپنے بستر پہ لیٹے ہوئے تھے۔ جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا سر پر اور بازوؤں پر پٹّیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کاشف کُرسی پر بیٹھا "آنکھ مچولی" کا تازہ شمارہ پڑھ رہا تھا، ہمیں ہوش میں آتا دیکھ کر بولا "بھائی جان! آنکھ مچولی کا قہقہہ نمبر آرہا ہے، مگر افسوس کہ آپ زخمی ہونے کی وجہ سے کچُھ بھی نہ لکھ سکیں گے"۔ یہ سُن کر ہمارے دل سے آہ سی نکل گئی۔

کاشف ہماری کیفیت سمجھ کر بولا "مگر بھائی جان افسوس کی ضرورت نہیں آپ اپنی ایک عدد تصویر اسی حالت میں نکلوا کر بھیجدیں، قہقہہ نمبر کے ٹائیٹل کے لیے مناسب رہے گی"۔ عین اُسی وقت دروازہ کھُلا ابا جان اندر داخل ہوئے اُن کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، ہماری طرف دیکھ کر بولے "کیسی طبیعت ہے اب؟"

ہم نے مُسکراتے کارٹون کی نقل کرتے ہوئے کہا "جی ٹھیک ہوں۔۔۔ یہ خط؟"

"بیٹے۔ یہ خط تمھارے انکل واحد بخش کا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ پرسوں وہ بیوی بچّوں سمیت آرہے ہیں۔۔۔ تم کل جو کمرہ صاف کر رہے تھے، اُسے اچھی طرح صاف کر دینا کیونکہ وہ دو ماہ کے لیے آرہے ہیں"۔

انکل واحد بخش کا نام سُنتے ہی اُن کے دس عدد چیختے چلّاتے شور مچاتے بچّے بھی ہمارے تصوّر میں آگئے اور ساتھ ہی یہ شعر بھی یاد آیا ؏ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے۔

دوسرا مصرعہ پورا کرنے سے پہلے ہی ہم بے ہوش ہو چکے تھے۔

بکری کے بیج

میرے خالو سبزیاں اور پھلوں وغیرہ کے بیج فروخت کرتے ہیں۔ میرا بھائی، جس کی عمر ۱۴ سال ہے، خالو کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے۔ اور بیجوں کا بغور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ ایک دن ایک بکری نے دکان کے سامنے مینگنیاں کردیں۔ میرے بھائی کی نظر پڑی تو وہ کچھ دیر تک ان کو غور سے دیکھنے کے بعد زور سے بولا۔ "خالو جان! یہ دیکھیں، بکری کے بیج!" ولی محمّد ـــــ لانڈھی، کراچی

نور محمد خان

آٹوگراف پلیز!

لکھوں تو کیا لکھوں؟ لکھنے کے لیے کچھ نہیں بچا! لے دے کے صرف کہانیاں بچی ہیں، لکھنے کے لیے، جو میں لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ کہانیاں لکھ کر میں ادیب کہلاؤں گا جو کہ میں کہلانا نہیں چاہتا. ویسے لکھنے کے لیے تو کچھ نہیں بچا لیکن پھر بھی میں وکالت جیسا معزز پیشہ اپنانا چاہتا تھا، لیکن اس میں بھی ایک خامی ہے کہ وکیل بن کر بحث کرتے رہو جو کہ میں کرنا نہیں چاہتا۔ ویسے لکھنے کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا! لیکن مجھے ڈاکٹر بننے کا بھی شوق ہے لیکن ایسے ڈاکٹر دوسروں کا کیا علاج کریں گے جو خود بیمار رہتے ہوں، ویسے تو یہ صفحہ بھرنے کے لیے کچھ نہیں بچا لیکن! سچ پوچھو تو مجھے اسکول ٹیچر بننے کا بھی بہت شوق ہے لیکن اس میں بھی ایک اندیشہ ہے وہ یہ کہ اگر امتحان کے قریب پیپر آؤٹ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو!... ویسے تو اب لکھنے کے لیے واقعی کچھ نہیں بچا لیکن اس کے باوجود میں رکشہ ڈرائیور ضرور

بنتا لیکن رکشے کے پیچھے جو فقرے لکھے ہوتے ہیں اُن سے مجھے چڑ ہے اور بنا لکھے میں رکشہ ڈرائیور بننا نہیں چاہتا ۔ جیسے ، جی باجی کہاں چلی ، سڑکوں کا شہزادہ ، تو چل میں آیا ۔ رکشہ میں بیٹھنے والے تجھ کو سلام میرا ۔ موت کے منہ میں بیٹھ کر خوشیاں منانے والو ۔ خدا حافظ تمھارا رکشہ چلانے والو اور دیکھ مگر پیار سے وغیرہ ۔

" دیکھ مگر پیار سے " پر ایک واقعہ یاد آیا ۔ ہُوا یہ کہ ایک دن ہم چند دوست تفریح کی غرض سے گھروں سے نکلے دو دن پہلے ہی بڑے زوروں کی بارش ہوئی تھی لہٰذا موسم بڑا خوشگوار تھا لیکن اس شہر "عروس البلاد" کی سڑکوں پر دو دن بعد بھی کیچڑ اور گندے پانی کے تالاب کسی غلیظ جھیل کا نظارہ پیش کر رہے تھے ۔ ہم بھی اس وقت ایک ایسی ہی شاہراہ سے گزر رہے تھے ہم سے چند قدم آگے ایک صاحب اپنی ہی دُھن میں مست چلے جا رہے تھے ، جو شکل سے تو چلی کے نظر آ رہے تھے لیکن اُردو کا کوئی نغمہ دھیمی آواز میں گنگنا رہے تھے ۔ اچانک پیچھے سے ایک رکشہ تیز رفتاری کے تمام پچھلے ریکارڈ کانچ کے برتنوں کی طرح توڑتا ہوا آیا ہم تو رکشے کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایک جانب ہو گئے تاکہ اپنے قیمتی سوٹ (ٹی شرٹ ، دھوتی ، اور سر پر ترکی ٹوپی) کو کیچڑ کے حملے سے محفوظ رکھ سکیں ... لیکن مُلک چلی کے وہ شیخ چلی اُسی طرح اطمینان سے گنگناتے ہوئے چلنے میں مصروف رہے ۔ شاید وہ اپنی شامتِ اعمال کو دعوت دے رہے تھے ۔ نتیجے میں رکشہ جب ان کے نزدیک سے گزرا تو گندے پانی اور کیچڑ کی جیسے اُن پر یلغار ہو گئی ہو ، پہلے تو ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور جب آیا تو وہ بھاگے رکشے کے پیچھے ، مارے غصے کے ان کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے ۔ اگرچہ جبڑے کیچڑ میں چھپ چکے تھے اور پہچانے میں نہیں آ رہے تھے ۔ بھاگتے بھاگتے ایک دم اُنھیں بریک لگ گئی ۔ جیسے چابی ختم ہونے پر کھلونا رُک جاتا ہے ۔ ہماری سمجھ میں ان کا یکایک رُکنا نہیں آیا ، لیکن جب جاتے ہوئے رکشے کو دیکھا تو اس پر جلی حروف میں لکھا تھا " دیکھ مگر پیار سے "۔

بات کہاں سے کہاں جا نکلی حالانکہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ لکھنے کے لیے کچھ نہیں بچا ! لیکن اگر سچ بتاؤں تو مجھے بس کنڈکٹر بننے کا بھی بہت شوق ہے لیکن اس میں بھی ایک خامی ہے کہ کنڈکٹر صاحبان بس چلانے کے لیے جس انداز میں دہاڑ کر " ڈبل ہے " کہتے ہیں اس طرح کہنا میں پسند نہیں کرتا ۔ سچ سچ بتاؤں تو اب تو رونے کے لیے ملکے میں آنسو بھی نہیں بچے اور نہ ہی ناک پونچھنے کے لیے کوئی "ٹائی" ہے اب الفاظ کا ذخیرہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے لیکن معاف کیجئے گا اجازت مانگنے سے پہلے میں اپنی ایک

اور خواہش آپ کے گوش گزار کر دوں ۔ ممکن ہے، آپ کو میری اس خواہش کا علم ہو بلکہ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے اگر نہ سمجھے ہوں تو میں سمجھائے دیتا ہوں' لائیے کان، کسی کو بتائیے گا نہیں ۔ اچھا سمجھ گئے ناں میرا اشارہ ٹریفک پولیس کی طرف ہے' لیکن ٹریفک پولیس بننے میں بھی ایک قباحت ہے وہ یہ کہ وہ آٹوگراف دینا نہیں جانتے ۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اتنی بڑی شخصیت، جس کے ایک اشارے سے ہزاروں گاڑیاں رُک جاتی ہوں اور پرچی کاٹنے کی دھمکی پر بڑوں، بڑوں کے ہاتھ بے اختیار جیب میں رینگ جاتے ہوں ، وہ آٹوگراف سے نابلد ہو ۔ اس آٹوگراف کا قصّہ بھی خوب ہے ۔

پچھلے برس کا واقعہ ہے ہم چند دوست ایک مقامی رسالے کی تقریب سے واپس بس اسٹاپ کی جانب رواں دواں تھے، سارے دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک میری نظر ایک ٹریفک کانسٹیبل پر پڑی ۔ جو غالباً سستانے کی غرض سے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، جبکہ اس کا دوسرا ساتھی ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا ۔ میں نے جلدی سے جیب سے آٹوگراف بک اور قلم نکالا ۔ اس نے جب ہم سب کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو ایک دَم سیدھا ہوگیا وہ سمجھا کہ شاید ہم ان سے کسی بس وغیرہ کا معلوم کرنے آئے ہیں ۔ لیکن ہم نے اس کی طرف آٹوگراف بک اور قلم بڑھاتے ہوئے مخصوص انداز میں کہا "آٹوگراف پلیز!"

"خبردار وہیں کھڑے رہو' میرے قریب مت آنا" وہ جانے کیا سمجھ کر چلّایا ۔

" دیکھئے ہم تو آپ سے "آٹوگراف" لینے آئے ہیں"۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا' ٹریفک کانسٹیبل مزید گھبرا گیا اور کہنے لگا " خدا کی قسم! میرے پاس "آٹوگراف" نہیں ہے ۔ گھر جانے کے لیے موٹر سائیکل تو ہے نہیں، تو آٹوگراف کہاں سے رکھوں گا"۔ شاید وہ "آٹوگراف" کو آٹو رکشہ کے قبیل کی کوئی سواری سمجھ رہا تھا ۔ بہر کیف اتنے میں ہماری مطلوبہ بس آگئی اور ہم سب ہنستے ہوئے بس میں سوار ہو گئے ۔ لیکن جاتے جاتے ٹریفک کانسٹیبل کو آٹوگراف کا مطلب سمجھانا نہیں بھولے ، لکھنے کے لیے تو کچھ باقی نہیں بچا ۔۔۔ لکھیں تو کیا!

■

جُوتوں سے علاج

چین کے بعض علاقوں میں بخار کا علاج جوتوں سے کیا جاتا ہے مریض کو لٹا کر اس کے سر پر ۲۰ جوتے مارے جاتے ہیں ۔ اگر پھر بھی مریض کہتا رہے کہ بخار نہیں اترا تو مزید ۲۰ جوتے مارے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک مریض ہاتھ جوڑ کر نہیں کہتا کہ بخار اُتر گیا ہے ۔

محمّد نعیم شفیع ، ـــــ بہاولپور

بہانہ

نوید ظفر کیانی

ابّو !

آج تو اتنی بارش برسی ہے

پہلے کبھی نہ برسی تھی

کھڑکی کھول کے دیکھیں خود

چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ پھیلا ہے

ایسے گندے موسم میں

جو بھی باہر جاتا ہے

وہ تو پھسل کر گرتا ہے

آپ ہی سوچیں

جان بُوجھ کر کپڑے گندے کرنے کی

کیا کوئی تُک بنتی ہے ؟

کہیے تو میں آج مدرسے نہ جاؤں ؟

جا کر چھٹّی کی اِک عرضی دے آؤں ؟

م۔ پ۔ آرائیں

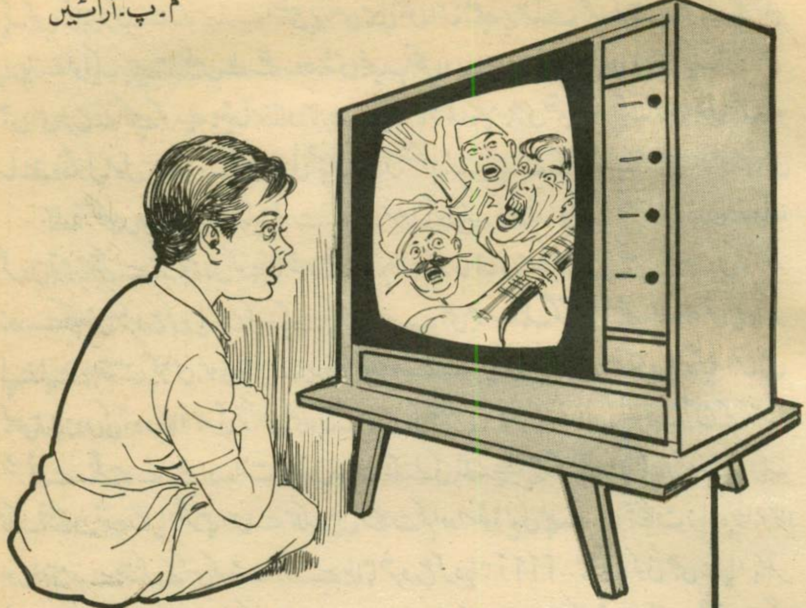

کلاسیکل شور شرابہ

ایک رات میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اناؤنسر نے بڑی شیریں آواز میں کہا "معزز ناظرین اب کلاسیکی موسیقی کا پروگرام "راگ رنگ" ملاحظہ فرمائیں"۔ میں بڑے خشوع وخضوع سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے کلاسیکی موسیقی کو کبھی گھاس نہیں ڈالی تھی۔ اور ظاہر ہے ڈال بھی کیسے سکتا تھا۔ کلاسیکی موسیقی کوئی گائے تو تھی نہیں۔

پروگرام شروع ہوا اور ایک کمرہ دکھایا گیا جس میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اُن کے چہرے سُتے ہوئے

تھے گویا کوئی اگلے جہاں کوچ کر گیا ہے اور یہ پُرسا دینے آئے ہیں۔ پھر میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے ایک کھمبا نُما چیز کندھے کے سہارے اسٹیج پر رکھی ہوئی تھی اس کھمبے پر مختلف حجم کے تار لگے ہوئے تھے شاید بے چارے کو ایک جیسے تار نہیں ملے تھے۔ وہ بڑی عجیب نظر وں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک اور شخص بھی اسی طرح کے کھمبے کو لیے بیٹھا تھا اور تاروں پر ایک ٹماٹر نما چیز پڑی تھی۔ پھر ایک آدمی نظر آیا جس کے سامنے دو گول مول سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جن کی شکل اوپر نیچے سے کٹے ہوئے تربوز سے ملتی جلتی تھی

میں آنکھیں پھاڑے ایبسٹریکٹ آرٹ کے ان نمونوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر تربوز خان نے ایک گردن توڑ جھٹکے سے تربوزوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر کھمبا نے کھمبے کے تاروں کو زور زور سے کھینچنا شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی جواب تک گم صُم بیٹھے تھے، جوش میں آکر اپنے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیزوں پر دو ہتھڑ مارنے لگے، اچانک ایک شور و غوغا برپا ہو گیا۔ اس میں کبھی تربوزوں کی آہ و بکا اُبھرتی تو کبھی کھمبوں کے تاروں کی چیخیں۔ پھر ایک صاحب نظر آئے اُن کے ہونٹ سُرخی سے رنگے ہوئے تھے اور دانت مہینوں صاف نہ کرنے کی بِنا پر پیلے پڑ گئے تھے۔ اچانک انھوں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا (اگرچہ اس سے فلک میں شگاف کم اور اسٹوڈیو کی چھت میں شگاف زیادہ پڑا ہوگا) اور ہاتھ سر سے بلند کر کے کسی کو بڑے زور سے بلانا شروع کر دیا "آآآآ۔۔" لیکن کوئی بھی نہ آیا، پھر انھوں نے عربی میں چلّانا شروع کر دیا " لا لا لا لا " یعنی نہ آ، کچھ دیر لا۔ ایسا کرنے سے شاید وہ شخص مان گیا۔ اور نہ آیا تو اُن کا منہ بند ہوا اور چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ یہ حضرت آرام سے بیٹھے تو دوسرے حضرات کے جوش میں کچھ کمی واقع ہوئی اور شور شرابا کم ہو گیا لیکن تربوزوں کی ٹھکائی کا عمل پورے زور و شور سے جاری تھا۔ شاید یہ صاحب بیگم سے مار کھانے کا غصہ ان بے زبانوں پر اُتار رہے تھے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ درمیان والے محترم کو شاید مرگی کا دورہ پڑ گیا۔ میں حیرانی سے اُن کا چہرۂ مبارک دیکھنے لگا۔ منہ سے کف جاری تھے۔ فرطِ جذبات سے رنگ لال بلکہ نیلا پیلا ہو رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں دورے کے دوران بھی وہ لاطینی میں فلسفے کا درس دیتے رہے جس میں کبھی "گاماسارے" اور کبھی "پادھانی" کی تکرار تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد دورے کا اثر ختم ہوا، ابھی ان کو ایک اور دورہ پھر پڑنے لگا تھا کہ۔۔۔ بجلی چلی گئی۔۔۔ اور زندگی میں پہلی بار بجلی کے یکایک چلے جانے پر، ہمیں خوشی ہوئی۔

ذیشان ہاشمی

وبالِ جان

فیض صاحب، سید و میاں کے لیے فیصل آباد سے بکری کیا لے آئے۔ سید و میاں کے تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ وہ سید و میاں، جو جانور پالنے کے کبھی حق میں نہ رہے تھے۔ جب دیکھو، بکری کی خاطر مدارات میں لگے رہتے۔ کبھی اُس کو چنے کھلانے میں مصروف ہیں تو کبھی چارہ۔ یہاں تک کہ کام سے باہر جاتے وقت بھی بکری ساتھ لے کر جاتے۔ اس لیے تمام اہلِ محلّہ اس بکری سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ سید و میاں جب کبھی اپنی بکری لے کر محلّے کی گلیوں میں نکلتے، بچّوں کا ہجوم بکری کے گرد گھیرا ڈال دیتا اور تمام بچّے بکری کو پیار کرنا شروع کر دیتے۔

ہر شام کی طرح آج بھی جب سید و میاں اپنی بکری کو ٹہلانے کے لیے باہر جانے لگے تو ان کی بیگم بولیں: "آج بکری کے لیے گھاس بھی کاٹ لائیے گا کیونکہ چارہ ختم ہو چکا ہے۔"

"چارہ ختم ہوچکا ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو" سیدو میاں نے حیرت سے پوچھا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہوں" بیگم سیدو نے جواب دیا۔
"لیکن میں کل ہی تو بازار سے لایا تھا، کہاں چلا گیا؟" سیدو میاں نے دریافت کیا۔
"مجھے کیا معلوم۔ ہوسکتا ہے، بکری کے ساتھ بیٹھے بیٹھے آپ نے بھی کھانا شروع کر دیا ہو" بیگم سیدو نے خیال ظاہر کیا۔
"کیا تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے؟ کبھی کسی انسان نے جانور کا چارہ بھی کھایا ہے" سیدو میاں بیگم کی بات سُن کر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولے۔
"یہ بات تو صحیح ہے کہ کوئی انسان بکری کا چارہ نہیں کھا سکتا۔ لیکن آپ کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ جو شخص پورے دن میں آدھے زیادہ وقت جانور کے ساتھ گزارے اُس سے تو ڈر ہی لگتا ہے کہ کب اُس کے سینگ نکل آئیں اور وہ حملہ کر بیٹھے" بیگم سیدو ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ گئیں۔
"دیکھو، دیکھو، تم میری اور میری بکری کی توہین کر رہی ہو" سیدو میاں باقاعدہ غصّے میں آنے لگے۔
"مجھے تمھاری اور تمھاری بکری کی توہین کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن جب تم دو پائے سے چار پائے والے ہو جاؤ تو مجھے مت کہنا۔ کیونکہ تم تو دن کے علاوہ اکثر راتوں کو بھی اُسے پانی پلانے کے لیے اُٹھتے ہو اور کبھی میں پانی مانگوں تو فوراً خرّاٹے لینے لگتے ہو" بیگم سیدو نے غصّے کے عالم میں کہا۔
"دیکھو بیگم، وہ بے زبان ہے اس لیے میں اکثر راتوں کو اُٹھ کر اُسے پانی وغیرہ دیتا ہوں" سیدو میاں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔
"اس بے زبان کا بڑا خیال ہے اور میری بے زبانی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ میں جو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی تو تم میری طرف دھیان بھی نہیں دیتے" بیگم سیدو شکایتی انداز میں بولیں۔
"اچھا اچھا فی الحال میں باہر جا رہا ہوں۔ سیدو میاں نے جان چھُڑاتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئے۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک شخص نے سیدو میاں کو دیکھتے ہی چلّانا شروع کر دیا۔
"اچھّن میاں... ارے او اچھّن میاں! کیسے ہو بھئی؟ کتنی مدّتیں ہو گئیں، تمھیں دیکھے ہوئے! تم کتنے بدل گئے ہو! پہلے تم موٹے تھے، اب دُبلے ہو۔ پہلے تمھارے سر پہ بال تھے اب گنجے ہو۔ پہلے تم چشمہ نہیں لگاتے تھے، اب لگاتے ہو۔ تم کس قدر بدل گئے ہو"

"میرا نام اچھن میاں نہیں، سید و میاں ہے۔ سید و میاں۔" سید و میاں نے وضاحت کی۔

"واہ بھئی واہ۔ اب تم نے نام بھی بدل لیا۔" اجنبی نے سید و میاں کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

"آپ سے کہہ جو دیا کہ میں اچھن نہیں بلکہ سید و میاں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" سید و میاں غصّے میں بولے اور بکری کی رسّی کھینچتے ہوئے آگے چل پڑے۔۔۔ لیکن یہ کیا! بکری تو غائب تھی۔ صرف رسّی سید و میاں کے ہاتھ میں تھی۔ شاید کسی نے سید و میاں اور اجنبی کی گفتگو کے دوران بکری کے گلے سے رسّی کھول دی تھی۔ سید و میاں کی تو حالت بڑی غیر ہونے لگی۔ جگہ جگہ بکری کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے لیکن بکری نہ ملنی تھی، نہ ملی۔ آخر تھک ہار کر گھر واپس چل دیے۔ وہ اتنے پریشان تھے کہ جیسے ان کی بچّی کھو گئی ہو۔ ابھی سید و میاں نے بہ مشکل آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ وہی اجنبی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو، سید و میاں؟" اجنبی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"گدھا!" سید و میاں نے غصّے میں جواب دیا۔

"وہ رہا آپ کا گدھا!" اجنبی نے قریب کھڑی ایک گاڑی کے شیشے کی طرف اشارہ کیا۔ سید و میاں نے لاشعوری طور پر گاڑی کے شیشے پر نظر ڈالی اور اپنی شکل اس میں دیکھ کر غصّے سے اجنبی کی طرف پلٹے، مگر وہ ہنستا ہوا بہت دُور جا چکا تھا۔ بہر حال سید و میاں ناکام شکاری کی طرح گھر کو چل دیے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سید و میاں چارپائی پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔

"آئے ہائے، خیریت تو ہے۔ یہ کدّو جیسی شکل کیوں بنائی ہوئی ہے؟ اور وہ تمھاری رازدار بکری کہاں گئی؟ جس سے تم ہر روز خُفیہ میٹنگیں کرتے تھے۔" بیگم سید و نے اُن کے چہرے پر پریشانی کے اثرات دیکھتے ہوئے طنز کیا۔

"کھو گئی۔" سید و میاں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کھو گئی! کھو گئی سے تمھاری کیا مراد ہے؟" بیگم سید و حیرانی سے بولیں۔

"بھئی کھو گئی سے مطلب گُم ہو گئی۔ تمھیں تو ایک ایک بات بتانی پڑتی ہے۔" سید و میاں جھنجھلا گئے۔

"دیکھو، بکری کو جلد از جلد ڈھونڈ لینے میں ہی تمھاری خیر و عافیت ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے وہ تمھارے اہم راز فاش کر دے اور تمھارے خلاف محلّے میں پروپیگنڈا شروع کر دے۔" بیگم سید و نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"تمھارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں۔ کبھی جانور بھی ایسی حرکت کرتے ہیں؟" سید و میاں بھنّا کر بولے۔

"تمھارے اور بکری کے ساتھ ساتھ رہنے سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی خُفیہ مسئلے پر غور کیا جا رہا ہو"۔ بیگم سیدو نے وضاحت کی۔ پھر بولیں: "ویسے اچھا ہی ہوا۔ میرا گھر بھی صاف رہے گا اور دماغ بھی ہر وقت مَیں مَیں کا راگ الاپتی رہتی تھی"۔ بیگم سیدو تو جیسے سیدو میاں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھیں۔

"ارے بڑی نیک تھی صرف تمھارے سوتے وقت، ہی ممیاتی تھی"۔ سیدو میاں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یکایک محلّے کی بڑی آپا اندر داخل ہوئیں۔ ان کو محلّے کا چلتا پھرتا اخبار کہا جاتا تھا۔ کوئی بھی خوشخبری یا بدخبری ان کے ذریعے محلّے والوں تک پہنچتی تھی۔ اندر آتے ہی انھوں نے بیگم سیدو کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔

"اے بہن! یہ تو بہت بُرا ہُوا، میرا تو دل ہَول رہا ہے۔ نہ جانے بے چاری کہاں ہوگی"؟ بڑی آپا نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ پہلے پہل تو بیگم سیدو گھبرا گئیں کہ بڑی آپا کس کو رو رہی ہیں پھر جب انھیں معلوم ہُوا کہ بات بکری کی ہو رہی ہے تو دل ہی دل میں ہنس دیں۔ ابھی بڑی آپا بیٹھ بھی نہ پائی تھیں کہ بکری کی گم شدگی کی تعزیت کرنے محلّے کی چھ سات مزید عورتیں آگئیں۔

"بہن! بہت افسوس ہُوا، تمھاری بکری کی گمشدگی کا سُن کر پڑوسی ہونے کے ناطے میں تمھارا دِل ہلکا کرنے آگئی"۔ ان عورتوں میں سے ایک نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"مجھے جیسے ہی معلوم ہوا کہ بیگم سیدو کی بکری چوری ہو گئی ہے، میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ ہاتھ میں موجود پلیٹیں ایک جھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں"۔ ایک اور عورت رونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں ابھی آئی"۔ یہ کہہ کر بیگم سیدو ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں، جہاں سیدو میاں دروازے سے کان لگائے، بڑے غور سے عورتوں کی باتیں سُن رہے تھے۔

"ہُوں! یہ کیا ہو رہا ہے"؟ بیگم سیدو نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کک۔۔۔کچھ نہیں، اِن گپ باز عورتوں کی گفتگو سُننے کی کوشش کر رہا تھا"۔ سیدو میاں نے جواب دیا۔

"اچھا اب جلدی سے مہمانوں کے لیے بوتلوں کا ایک کریٹ لے آئیے، ہو سکتا ہے، ابھی اور عورتیں بھی افسوس کرنے کے لیے آئیں"۔

"کیا کہا؟ بوتلوں کا کریٹ لے آؤں، مہمانوں کے لیے، تمھارا دماغ تو درست ہے؟ ہماری بکری کھوئی ہے کوئی ہم نے باڑہ نہیں خریدا جو سب کو بوتلیں پلاتے پھریں۔ سیدھے سیدھے پانی پلاؤ اور ان گپ باز مہمانوں کو ٹرخاؤ، سمجھیں"۔ سیدو میاں غصّے کی کیفیت میں بولے۔

"ارے آج کل تو پورے علاقے میں پانی بھی نہیں آرہا۔ پرندے بھی پانی کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں

کھا رہے ہیں، جس طرح نوجوان اپنی ڈگریاں لیے نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ علاقے کے سارے نلکے خاموش پڑے ہیں، حتیٰ کہ گوالے بھی مجبوراً خالص دودھ دے رہے ہیں۔" بیگم سیدو نے بڑی صفائی سے پانی کا نایاب ہونا ثابت کیا۔ چاروناچار سیدو میاں بوتلوں کا کریٹ لینے دُکان کی طرف چل دیے۔

سیدو میاں کی بکری کو گُم ہوئے آج پانچواں روز تھا۔ بیگم سیدو باورچی خانے میں بیٹھی شام کی چائے بنا رہی تھیں اور سیدو میاں چارپائی پر لیٹے نہ جانے کن کن سوچوں میں غرق تھے کہ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ میں ممیانے کی آواز بھی آئی۔

"ارے، یہ تو اپنی بکری کی آواز لگتی ہے۔ راگ تو اپنی بکری جیسا ہی ہے، بے سُرا سا!" بیگم سیدو نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا اور سیدو میاں دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ دروازے پر وہی اجنبی شخص کھڑا تھا۔

"السلام علیکم گدھے!۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے، سیدو میاں۔" اجنبی شخص نے سیدو میاں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو میری بکری ہے۔" سیدو میاں اجنبی کے سلام کا جواب دیے بغیر بکری کے کان پکڑتے ہوئے بولے۔ بیگم سیدو بھی دروازے پر آکھڑی ہوئیں۔ "ہاں ہاں، بالکل ہماری ہی بکری تو ہے۔" انھوں نے اپنے میاں کی تائید کی۔

"تو میں نے کب کہا ہے کہ یہ آپ لوگوں کی بکری نہیں ہے۔" اجنبی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور بکری کی رسّی سیدو میاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ سیدو میاں نے رسّی ہاتھ میں پکڑی اور بکری کو پیار کرنا چاہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہمسایوں کے خیال سے رسّی کو چھوڑ دیا۔

"نہیں نہیں، یہ ہماری بکری نہیں ہو سکتی۔" سیدو میاں گھبرا کر بولے۔

"ارے غور سے دیکھیے۔ یہ آپ ہی کی بکری ہے، جو آپ کچھ دن پہلے اس طرح ڈھونڈ رہے تھے جیسے آپ کی بکری نہیں، بچّی گُم ہو گئی ہو۔" اجنبی کے انداز میں طنز کے ساتھ حیرت بھی نمایاں تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں یہ بکری لے جاؤ، یہ کسی اور کی ہے۔" سیدو میاں نے نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولا۔

"یہ آپ ہی کی بکری ہے ذرا پھر غور سے دیکھیے ورنہ اپنی آنکھوں کا علاج کروائیے، لگتا ہے، نظر کچھ کمزور ہو گئی ہے۔۔۔" اجنبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ارے بھائی، اِن کا علاج کروانا اور پھر چشمہ لگوانا بھی ایک مسئلہ ہے کیونکہ جب ڈاکٹر چشمہ لگا کچھ پڑھوائیں گے، تو یہ گونگے بن جائیں گے۔ اسی دن کے لیے تو بڑے بوڑھے پڑھواتے تھے کہ علم کبھی

نقصان نہیں پہنچا تا بلکہ اِس میں فائدے ہی فائدے ہیں، لیکن ان کو بکری پالنے سے فرصت ملے" تب نا"
بیگم سیدو غصّے میں بولیں اور اجنبی بکری کی رسّی دروازے کی کُنڈی سے باندھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔
" لو آگئی، تمھاری جاسوس۔کرو اس سے راز و نیاز کی باتیں" بیگم سیدو جلے بھُنے انداز میں بولیں اور گھر کے کام پر جُٹ گئیں۔ابھی تھوڑی ہی دیر گُزری ہوگی کہ بڑی آپا چلی آئیں۔
" اے بہن! سُنا ہے، تمھاری بکری مل گئی ہے مُبارک ہو، ارے قسمت والوں کو کھوئی ہوئی چیزیں ملتی ہیں" بڑی آپا اپنی بتیّسی کی نمائش کرتے ہوئے بولیں۔
" اے آپا، یہ سب آپ کی دُعاؤں کا اثر ہے" بیگم سیدو بولیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد محلّے کی تمام عورتیں بیگم سیدو کے گھر میں جمع تھیں۔
" میں نے بکری کے ملنے کی خبر سُنی تو خوشی کے مارے میرے آنسو نکل آئے" بڑی آپا نے شوشا چھوڑا۔
" مگر میرے تو غم کے مارے آنسو نکل رہے ہیں" سیدو میاں اپنے کمرے سے مدّھم آواز میں کراہے۔
" کیا کہا؟" بڑی آپا نے بیگم سیدو سے پوچھا۔
" کہہ رہے ہیں اس خوشی کے موقع پر آپ کیا پسند کریں گی؟" بیگم سیدو نے بات بنائی۔
" ارے اس گرمی میں تو بوتلیں پلوا دو" بڑی آپا سمیت تمام عورتیں بولیں۔
" میں ابھی منگواتی ہوں" یہ کہہ کر بیگم سیدو اُٹھیں اور سیدو میاں کے کمرے کی جانب چل دیں۔
تھوڑی دیر بعد سیدو میاں کولڈ ڈرنک کی دُکان پر کھڑے بوتلوں کا کریٹ خریدتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں یا۔۔۔!

پہلی غلطی

تنخواہ کا لفافہ لے کر ملازم کیشیئر کے پاس آیا اور کہا " اس میں پانچ روپے کم ہیں۔"
" پچھلی بار جب تمھارے لفافے میں پانچ روپے زیادہ چلے گئے تھے، تب تم میرے پاس کیوں نہیں آئے" کیشیئر نے کہا۔
" تب آپ نے پہلی بار غلطی کی تھی جسے میں برداشت کر گیا، لیکن بار بار آپ کی غلطی کو نظرانداز نہیں کر سکتا" ملازم نے جواب دیا۔

محمّد انجم مبین ـــــ ڈیرہ اسماعیل خان

ذیشان بن صفدر

اب میں خوش ہوں

بہت پُرانے زمانے کی بات ہے جب فلسطینی باشندے اپنی سرزمین میں امن وسکون سے رہا کرتے تھے۔ شہرِ خلیل میں ایک غریب خیاط (درزی) عُمر رہا کرتا تھا۔ عمر بہت ـ ـ ـ ـ عُسرت کے دن گزار رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی قسمت سے شاکی نہیں تھا۔ اس کی جھونپڑی بہت پُرانی اور خستہ ہو چکی تھی۔ مسلسل تنگدستی اور غُربت نے اُس کے مزاج پر بُرا اثر ڈالا اور وہ چڑچڑا ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اس طرح بھڑک اُٹھتا، جیسے کوئی شخص بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگا دے۔ عمر کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ جھونپڑی میں وہ خود، اس کی بیٹی عارفہ اور نواسیاں ہل جُل کر رہتے تھے۔۔۔ کبھی کبھی عمر کو اپنی ننھی منّی نواسیوں کا شور بھی ناگوار گزرتا۔ اور نواسیوں کو غصّے کے عالم میں بُرا بھلا بھی کہہ ڈالتا۔ تب اس کی معصوم اور بھولی بھالی نواسیاں بُری طرح سہم کر خاموش ہو جایا کرتیں ان کے مُسکراتے چہرے سنجیدہ ہو جاتے۔۔۔

ایک دن کی بات ہے، بچّے حسبِ معمول ناشتے سے فارغ ہو کر کھیل رہے تھے۔ عمرؔ ان بچّوں کے شور وغُل کی آواز سے بُری طرح تلملا رہا تھا۔ جب بچّوں کا شوروغل اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ بیر

بیٹھتا ہُوا جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ پہلے تو وہ کافی دیر تک بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر اُس کے ذہن میں آیا، کیوں نہ کسی سے اس سلسلے میں مشورہ کر لیا جائے۔ مشورے کے نام پر اُس کے ذہن میں ابوالحسن کا نام آیا۔ ابوالحسن ایک دانا و بینا شخص تھا۔ بستی کے تمام لوگ اپنے مسائل کے سلسلے میں اُسی کے پاس مشورے کے لیے جاتے اور خوش خوش واپس آتے۔ عمر بھی ابوالحسن کے گھر کی طرف چل پڑا۔

ابوالحسن اپنے گھر کے باہر پلنگ پر نیم دراز کوئی بہت ہی موٹی سی جلد کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ عمر نے قریب پہنچ کر "السّلام علیکم" کہا۔ ابوالحسن نے وعلیکم السّلام کہتے ہوئے کتاب بند کر کے رکھ دی اور اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے خوش دِلی سے بولا۔" آؤ عمر بھائی! کہو کیسے ہو؟ خیریت تو ہے۔ کام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، نا؟"

"ہاں ابوالحسن بھائی! خدا کا شکر ہے۔ کام تو گزارے کے لائق ٹھیک چل رہا ہے۔۔ بس اپنی نواسیوں سے بہت تنگ ہوں۔ گھر میں ہر وقت ایک شور ہنگامہ مچائے رکھتی ہیں۔ دو منٹ کو بھی سکون نہیں ملتا۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ اس شور اور ہنگامے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مِل جائے۔" عمر ابوالحسن کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی بات سُن کر ابوالحسن گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولا۔

"بھائی عمر! آپ اگر شور اور ہنگامے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے گھر میں ایک بلّی پال لیں!"

"بلّی۔۔۔!" عمر نے حیرت سے پوچھا، پھر بولا "ابوالحسن بھائی! کیا بلّی سے شور شرابے میں اور اضافہ نہیں ہو جائے گا"؟

ابوالحسن نے سنجیدگی سے کہا "بھائی، اگر تم شور سے نجات حاصل کرنا ہی چاہتے ہو تو میرے مشورے پر عمل کرو۔۔۔ ورنہ تم جانو اور تمھارا مسئلہ۔۔۔" عمر سلام کر کے خاموشی سے گھر واپس آگیا اور ابوالحسن کے مشورے کے مطابق گھر میں ایک بلّی پال لی۔ پھر وہی ہوا، جس کا اُسے خدشہ تھا۔ بلّی دن بھر ساری جھونپڑی میں اِدھر سے اُدھر میاؤں میاؤں کرتی پھرتی۔۔۔ اور یوں شور میں مزید اضافہ ہو گیا۔

کئی دن تک تو عمر اس نئے شور کو بچّوں کی ہُلّڑ بازی کے ساتھ برداشت کرتا رہا، آخر تنگ آگیا اور تیز تیز چلتا ابوالحسن کے گھر جا پہنچا۔ ابوالحسن اپنے صحن میں لگے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔۔۔ عمر نے اپنی مشکل اُس سے کہہ سُنائی۔ ابوالحسن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب میں کہا۔" ہوں۔۔۔ ایسا کرو، اب تم ایک کتا بھی پال لو۔"

عمر یہ جواب سُن کر اُلجھن میں پڑ گیا اور سوالیہ نگاہوں سے ابوالحسن کی طرف دیکھا۔ ابوالحسن اس کا مقصد

سمجھ کر بولا: "ہاں ہاں، سوچو نہیں جاؤ، میرا مشورہ مان لو اور جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو۔"

عمر بادلِ نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھر واپس لوٹ آیا اور ابوالحسن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک کتّا بھی پال لیا۔ اب کیا تھا۔ گھر میں کتّے کے بھونکنے کا بھی اضافہ ہوگیا۔ بلّی اور کتّا آپس میں لڑتے اور خوب شور مچاتے۔ عمر پھر پریشانی کے عالم میں ابوالحسن کے پاس پہنچا اور مدد کا طالب ہوا۔

ابوالحسن نے عمر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اب وہ ایک مرغا پال لے۔۔۔!

"مُرغا۔۔۔؟" عمر نے بڑی گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں بابا، مُرغا۔۔۔! وہ ککڑوں کوں بولتا ہے۔" ابوالحسن نے مُسکرا کر کہا اور اپنی موٹی جلد والی کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

عمر نے ایک مُرغا خرید لیا۔ اب بلّی، کتّا، مُرغا تینوں مِل کر خوب شور مچاتے۔ اُن کے شور سے عمر کی راتوں کی نیند بھی اُڑ گئی۔۔۔ نواسیوں کا شور تو اُسے صرف دن میں ہی تنگ کرتا تھا۔ اب ابوالحسن کے قیمتی مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اس کی راتوں کا چین اور آرام بھی غارت ہوکر رہ گیا تھا۔ رات بھر بلّی اور کتّے کے شور سے جاگتے رہنے کے بعد صبح کے قریب تھکن سے جب اُس کی آنکھ لگتی تو مُرغا بانگ دے کر اُسے جگا دیتا۔

عمر پھر پریشان ہوکر اپنے ذہین اور قابلِ فخر محسن ابوالحسن کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا کہہ سُنائی۔

ابوالحسن نے ساری روداد سُن کر ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا: "اچھا تو عمر میاں! اب تم ایک گدھا پال لو۔"

عمر گدھا پالنے کا مشورہ سُن کر مبہوت رہ گیا۔ اس کے چہرے کے گلاب سورج مُکھی کا پھول بن گئے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ گدھے کے آنے سے جھونپڑی کا حال کیا ہوگا؟۔۔ اُسے سوچتے دیکھ کر ابوالحسن نے سختی سے کہا "جاؤ زیادہ مت سوچو۔ انجام کی پرواہ کیے بغیر مشورے پر عمل کرو اور گدھا پال لو۔"

لیجیے صاحب، ابوالحسن کے کہنے کے مطابق عمر کے گھر میں ایک گدھے کا اضافہ بھی ہوگیا۔ اب بلّی کتّا، مُرغا اور گدھا اپنی اپنی بولیاں بول کر خوب شور مچاتے۔ کبھی کُتّے کی بھوں بھوں گدھے کی آواز سے دب جاتی اور کبھی بلّی کی میاؤں میاؤں مُرغے کی ککڑوں کوں میں اور جب ایک ساتھ چاروں مل کر کورس کے انداز میں بول اُٹھتے تو عمر بڑی بے بسی کے ساتھ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔

اس طرح تین دن ہی گزرے تھے کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اپنی آنکھوں میں بے بسی کے سائے اور آنسوؤں کے موتی لیے بیچارگی کی مجسّم تصویر بنا وہ پھر ابوالحسن کی خدمت میں حاضر ہوا اور

روہانسی آواز میں بولا۔"بھائی ابوالحسن! میری تو زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ بلّی، کتا اور مُرغا پہلے ہی کیا کم تھے، جو آپ نے گدھا بھی جھونپڑی میں پہنچوا دیا۔۔۔اب تو میں کچھ ہی دنوں بعد پاگل ہو کر سڑکوں پر بچوں کو ڈھیلے مارتا نظر آؤں گا!"

ابوالحسن کے چہرے پر مُسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا:"اچھا جاؤ۔ اب تم اپنے گدھے کو فروخت کر دو۔"

دو دن بعد ابوالحسن خود عمر کے گھر اس کی خیریت پوچھنے کے لیے پہنچا۔ عمر جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا قمیص میں بٹن ٹانک رہا تھا۔"کہو بھائی عمر! کیسے ہو؟" ابوالحسن نے پوچھا۔

عمر پہلی بار مُسکراتے ہوئے بولا:"آئیے ابوالحسن بھائی! بیٹھیے۔ گدھا فروخت کرنے کے بعد سے میں کافی سکون محسوس کر رہا ہوں۔ اور بہت خوش ہوں۔ اب صبح ہونے سے قبل کچھ دیر سکون کی نیند بھی سو لیتا ہوں۔ گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں تو سونے ہی نہیں دیتی تھی۔"

"ٹھیک ہے اب کتّے کو بھی گھر سے نکال دو۔۔۔ اور تیسرے دن میرے گھر آ کر مجھے اپنی کیفیت بتاؤ۔"

تیسرے دن عمر خوشی خوشی مُسکراتا ہُوا ابوالحسن کے گھر پہنچا۔

"آج تو بہت خوش نظر آ رہے ہو۔" ابوالحسن نے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھائی ابوالحسن! میں بہت خوش ہوں۔۔۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ جب سے آپ کے کہنے کے مطابق میں نے کتّے کو جھونپڑی سے نکالا ہے، تب سے بلّی ایک طرف کونے میں خاموش اور سُست آنکھیں بند کیے پڑی رہتی ہے۔ اب تو بہت سکُون اور خاموشی ہوگئی ہے، میرے گھر میں۔"

"مبارک ہو۔۔۔ بہت بہت مبارک! کہ تمھیں سکون جیسی نعمت حاصل ہو گئی۔ جاؤ اب بلّی کو بھی گھر سے نکال دو۔" ابوالحسن نے ہدایت کی۔

"بلّی کو رہنے ہی کیوں نہ دیں۔" عمر نے کہا۔"اس کے رہنے سے میرے سکون اور آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔"

"جس طرح میں کہہ رہا ہوں، ویسے ہی کرو۔" ابوالحسن نے سختی سے کہا۔ عمر نے کچھ کہنا چاہا مگر ابوالحسن نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ اور دو دن بعد پھر ملاقات کے لیے کہہ کر اُسے رخصت کر دیا۔

دو دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ عمر خوشی سے جھُومتا ہُوا ابوالحسن کے گھر پہنچا۔ اس کے چہرے پر

شگفتگی اور تازگی کھلی ہوئی تھی ۔۔۔

"سناؤ بھائی عمر! اب کیا حال ہے ؟" ابوالحسن نے سوال کیا۔

"خدا کا شکر ہے، ابوالحسن بھائی ! آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اب گھر میں سکون کی دولت ہی دولت ہے ۔۔۔ اب تو جھونپڑی کے سناٹے اور خاموشی سے میں خود کسی وقت گھبراجاتا ہوں ۔۔۔ اگر میری ننھی ننھی معصوم نواسیوں کے قہقہے جھونپڑی میں نہ گونجیں تو یہ خاموشی مجھے پاگل کردے۔ سچ، اگر یہ لڑکیاں گھر میں نہ ہوتیں تو شاید تنہائی مجھے زندگی سے بیزار کر دیتی ۔"

"کیا تم خوش ہو؟" ابوالحسن نے سوال کیا۔

"بہت خوش، بھائی ابوالحسن ۔۔۔! میں تو اب یہ سمجھتا ہوں کہ میں ہی دُنیا کا سب سے خوش نصیب شخص ہوں۔" عمر نے جواب میں کہا۔

"ٹھیک ہے ۔اب تم جاؤ اور اپنی نواسیوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارو ۔ دراصل خوشی اور سکون تو تمہارے گرد پہلے ہی موجود تھے ۔بس تم ان سے لاعلم تھے اور پہچان نہ سکے تھے ۔۔۔!"

یہ تو وہی جگہ ہے...

دو امریکی شکاری افریقہ میں گینڈے کا شکار کھیلنے گئے ۔انہوں نے ایک چھوٹا اور ہلکا ہوائی جہاز کرائے پر لیا، اور جنگل میں جاکر ایک کے بجائے دو گینڈے مارے۔ جب وہ گینڈے جہاز میں لادنے لگے تو پائلٹ نے کہا "تم نے صرف ایک گینڈے کا کہا تھا۔ یہ دو گینڈے ہیں۔ میرا جہاز دو گینڈوں اور تین آدمیوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا"

شکاری بولے" ہم نے پچھلے سال بھی ایک ایسا ہی جہاز کرائے پر لیا تھا اور اس میں دو گینڈے لادے تھے۔ اس جہاز کے پائلٹ نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔"

چنانچہ پائلٹ راضی ہوگیا، ابھی جہاز ایک سو فٹ ہی بلندی ہوا تھا کہ وہ ڈگمگایا اور پھر زمین پر گر کر پاش پاش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک شکاری کو ہوش آیا تو اس نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اپنے ساتھی سے بولا۔" ہیری گزشتہ سال بھی ہم اسی جگہ پر گرے تھے نا"؟

خرم عبدالحمید بٹ، ——— گلشن اقبال، کراچی

محمد عمر احمد خان

اُف یہ باجی

دروازے پر مخصوص قسم کی دستک ہوئی جسے سُن کر ہماری رُوح فنا ہوگئی۔ ہم فوراً تولیہ لے کر غسلخانے میں گھُس گئے۔ ابھی ہم نے پانی کے دو چار مگے ہی اپنے جسم پر ڈالے تھے کہ باہر سے باجی کی آواز سُنائی دی: "امّی جان! یہ عمُر کہاں ہے؟"

جواب میں امّی نے کہا "وہ تو نہا رہا ہے۔"

"کیا بات ہے، میں جب بھی آتی ہوں، وہ نہا ہی رہا ہوتا ہے۔ اتنا صفائی پسند کب سے ہو گیا ہے وہ!!" باجی کی منمِناتی آواز سنائی دی جس میں کچُھ کچھ طنز بھی شامل تھا۔

باجی جب تک امّی جان سے باتیں کرتی رہیں، تب تک ہم نہاتے رہے۔ پانی گرنے کے شور میں باجی کے سلیپر گھسیٹے جانے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی اور اسی شور میں باجی کی آواز بھی سُنائی دی جو جاتے جاتے کہہ رہی تھیں: "اچھا امّی جان! میں جا رہی ہوں، عمُر نہالے تو اسے میرے گھر بھیج دیجئے گا۔ مجھے اس سے گوشت اور سبزی منگانی ہے اور ہاں، آج اس سے بجلی کا بل بھی بھروانا ہے اس سے کہیے گا کہ گھر آئے تو مجھے بجلی کے بِل کا ضرور یاد دِلا دے شاید مجھے بعد میں یاد نہ رہے۔"

باجی تو چلی گئیں اور ہم نہاتے نہاتے ان چھٹیوں کو کوسنے لگے جن کے آنے سے ہماری شامت آگئی تھی۔ پہلے ہی گھر کے کام کیا کم تھے کہ اب باجی کے گھر کا بھی سارا کام ہمیں ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ باجی کو دیکھتے ہی ہماری رُوح فنا ہونے لگتی۔ ان کی آمد سے ہمارے جسم کا رہا سہا خون بھی خشک ہو جاتا مگر اس کے باوجود وہ ہمارا خون نچوڑنے پر تُلی رہتیں۔ کبھی ہمارا دل چاہتا کہ باجی کے آگے فریاد کریں انھیں سمجھائیں "اے میری پیاری سی سویٹ سی باجی! آپ دن بھر میرے کان کھایا کریں پر یہ بار بار بازاروں کی طرف مجھے نہ دوڑایا کریں۔ اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے میرے کتنے ہی کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میری کتنی ہی کہانیاں نامکمّل رہ جاتی ہیں۔ ہائے جی! آپ کیسی ظالم سماج ہیں کہ آپ کی آمد میری کہانیوں کی راہ میں دیوار بن جاتی ہے"۔

نہانے کے بعد جیسے ہی ہم باجی کے گھر پہنچے، انھوں نے بازار جانے اور سودا سلف لانے کے احکامات جاری کر دیے۔ احکامات کی بجا آوری کے لیے ہم نے بڑی تابعداری کے ساتھ اپنا کدّو جیسا سر ہلایا۔ اس کدّو (سر) کے بارے میں امّی جان کا خیال تھا کہ اس میں سیروں کے حساب سے بھُوسا بھرا ہُوا ہے۔ اب بھلا ہم امّی جان کو یہ کس طرح بتاتے کہ اگر ہمارے سر میں بھُوسا نہ بھرا ہوتا تو ہم یہ اتنے اعلیٰ پائے کی کہانیاں بھلا کس طرح تخلیق کر پاتے؟

اکثر یہ ہوتا کہ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کہانی تخلیق کر رہے ہوتے کہ اچانک باجی کی آواز سنائی دیتی۔ "عُمر ---! عُمر! تم کہاں ہو، میرے بھیّا؟ میری بات تو سنو!!"

"جی، ایک نہیں، دس باتیں سُنائیے۔ ہم آپ کی تمام باتیں سُن لیں گے مگر پلیز کوئی کام ---!" ابھی ہماری بات پوری بھی نہ ہو پاتی کہ باجی ہماری بات کاٹ کر کہتیں "ارے کام ہی کی تو بات سُنا رہی ہوں تمھیں"۔

"جی سنائیے!" ہم کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیتے۔ باجی فرماتیں "ایک کام کروانا ہے تم سے"۔

"دیکھا! آگئیں نا آپ، اپنے مطلب کی بات پر۔ اچھا چھوڑئیے! کہانی لکھنا تو میں نے اس وقت بند کر دیا ہے آپ جلدی سے کام بتائیے!!"

ہماری یہ بات سُن کر باجی کہتیں "بازار سے ایک کلو دہی لا دو۔ گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا جلدی سے لانا"۔ ہم تھیلا اور پیسے سنبھال کر بازار جانے لگتے۔ ابھی دروازے تک بھی نہ پہنچ پاتے کہ باجی فرماتیں۔

"اور ہاں، کچھ مٹھائی اور سموسے وغیرہ بھی لے لینا"۔

"جی اچھّا!" ہم تابعداری سے اپنا سر (کدّو) ہلاتے۔ ابھی دروازے کو کھولنے کے لیے ہم نے دروازے پر ہاتھ ہی رکھا ہوتا کہ باجی چلّا کر کہتیں "منّی کی فیڈر کا نپل خراب ہو گیا ہے۔ بازار سے واپسی پر وہ بھی لیتے

آنا۔ "جی بہت بہتر!" ایک بار پھر ہمیں اپنا کدو جیسا سر ہلانا پڑتا۔ جب گلی میں پہنچتے تو دروازے پر سے باجی پھر آواز لگا کر ہمیں بلاتیں "ارے عمر! ایک بات تو میں کہنا بھول ہی گئی؟"

"جی، کونسی بات؟!!" ہمارا دل رونے کو چاہتا۔

باجی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتیں، پھر سر پر اپنا ہاتھ مار کر کہتیں "کمبخت! یہ میری یادداشت کو نجانے کیا ہو گیا ہے۔ کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔ ابھی میں تم سے ایک کام کی بات کرنے والی تھی اور ابھی ابھی میں بھول گئی۔ اچھا خیر چھوڑو، تم جاؤ۔"

ہم جلدی سے جانے لگتے۔ پیچھے سے پھر آواز لگتی "عُمر! عمر!!"

"جی باجی! کیا وہ کام کی بات یاد آگئی؟"

"ہاں! میں پہلے یہ کہنے والی تھی کہ جلدی آجانا۔ بازار میں کسی دوست کے ساتھ گپ شپ لگانے نہ بیٹھ جانا۔"

"جی بہت بہتر!" ہم تابعداری سے جواب دے کر جلدی سے اپنا رُخ بازار کی طرف کر لیتے کہ کہیں باجی کی یادداشت بالکل درست نہ ہو جائے۔!

باجی کی ساری باتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں، سوائے ان باتوں کے، جو کہ وہ اپنے احکامات کے ذریعے صادر فرماتی ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ہمیں بازار کی طرف دوڑنا پڑتا ہے۔ مثلاً "ارے عمر! ذرا بھاگ کر انڈے لے آنا۔ عمر! ذرا جلدی سے مجھے آدھا کلو بیسن لا دو، پکوڑیاں بنانی ہیں۔ تمھارے دولہا بھائی کھائیں گے۔ ارے تم ابھی تک بازار ہی نہیں گئے۔ فٹافٹ دوڑ کر جاؤ اور گوشت اور سبزی لے کر آؤ۔ اور ہاں، راشن ڈپو سے آٹا بھی لانا ہے تمھیں۔ ارے! ابھی تک یہیں بیٹھے ہو۔ بل بھرنے کب جاؤ گے؟" وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن کی بات ہے۔ باجی ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں اور کسی کمانڈر کی طرح احکامات صادر فرما رہی تھیں "بازار سے سبزی اور گوشت وغیرہ لانا ہے۔ اور ہاں، ایک پاؤ کلیجی بھی لے لینا اور سنو! واپسی میں میڈیکل اسٹور سے یہ دوائیں بھی لے لینا۔" باجی نے ایک چٹ ہمیں پکڑا دی جس پر دواؤں کے نام لکھے تھے۔

"اور کچھ تو نہیں منگوانا آپ کو۔ جلدی سے یاد کر لیں شاید آپ کوئی چیز بھول گئی ہوں۔" ہم نے انھیں خیال دلایا۔

"اس وقت تو کچھ یاد نہیں آرہا۔ خیر، اگر کوئی چیز بھول بھی گئی تو تم سے بعد میں منگوا لوں گی۔" باجی کا یہ جواب سُن کر ہمیں بڑا غصہ آیا۔ انھوں نے تو ہمیں گھر کی مرغی دال برابر، سمجھا ہوا ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے ہم نے

ٹوکری سنبھالی۔ باجی سے پیسے لیے۔ دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ آواز آئی "اے سنو!"
ہم نے باجی کی طرف دیکھا۔ یہ جملہ وہی کہہ سکتی تھیں۔ لیکن وہ تو منی کا سویٹر بُننے میں مصروف تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور آواز دوبارہ آئی، تب ہمیں پتہ چلا کہ آواز باہر سے آرہی ہے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ آواز باجی کی نہیں تھی۔ ہم نے دروازہ کھولا تو باجی کی ہم عمر دو خوش پوش لڑکیاں کھڑی نظر آئیں۔ دونوں کے کاندھوں پر بیگ لٹک رہے تھے۔ ہاتھ میں کاپی اور قلم تھا۔

"جی فرمائیے؟" ہم نے انکساری سے پوچھا، جو کہ باجی کی تابعداری کرتے کرتے ہم میں بڑی کثرت سے پیدا ہو چکی ہے۔۔۔ ہماری یہ بات سُن کر اُن میں سے ایک لڑکی نے پوچھا "آپ لوگ کون سا مکھن استعمال کرتے ہیں؟"

"جی مکھن؟" ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ابھی ہم کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے دروازے سے اپنا سر باہر نکالتے ہوئے مکھن لگایا "یہی مکھن، جو آپ کے بیگ میں پڑا ہوا ہے!"

اس سے پہلے کہ ہم اپنے بھائی کے اس جھوٹ پر اُسے ایک تھپڑ رسید کرتے، پیچھے سے باجی کی منمناتی ہوئی آواز آئی "جی ہاں! ہم لوگ صبح ناشتے میں یہی مکھن استعمال کرتے ہیں۔ اجی، یہ بڑا اچھا مکھن ہے۔"

باجی کے دو خوشامدی جملوں نے ان دھان پان سی لڑکیوں کا سیروں کے حساب سے خون بڑھا دیا۔ پہلے تو ہم چاہ رہے تھے کہ ان لڑکیوں کو بتا دیا جائے کہ محترمہ! جس مکھن کے لیے آپ سروے کر رہی ہیں وہ ہمارے گھر میں استعمال نہیں ہوتا لیکن یہ سوچ کر خاموش رہے کہ کہیں ہمارے ان سچے جملوں سے اُن لڑکیوں کا خون خشک نہ ہو جائے۔

"آپ اپنے والد صاحب کا نام بتائیں" سروے کرنے والی لڑکی نے پوچھا۔

باجی نے اس کے ہاتھ میں مکھن کی ٹکیا دیکھ لی تھی۔ مکھن کا نام پڑھ کر بولیں "بلو بینڈ مارجرین!"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ دوسری لڑکی نے کہا "ہم نے مکھن کا نام نہیں، آپ کے والد صاحب کا نام پوچھا ہے۔"

"اوہ! والد صاحب کا نام۔ وہ تو میں ابھی بتا دیتی ہوں محبوب خان، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اُردو بوائز۔۔۔"

"بس بس جی! ہم نے صرف آپ کے والد صاحب کا نام پوچھا۔ آپ تو اسکول کا ایڈریس بھی لکھوانے لگی ہیں" سروے کرنے والی لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھیے نا، آپ کو کبھی والد صاحب کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے" باجی عقلمندوں کے سے انداز میں بولیں۔

"جی۔۔۔!" دونوں لڑکیاں ایک ساتھ بولیں۔
"میرا مطلب ہے، کبھی آپ کو اپنے کسی بھائی وغیرہ کا داخلہ کرانا پڑے تو میں اپنے والد صاحب سے کہہ کر آپ کی مشکل حل کرا سکتی ہوں۔" باجی نے وضاحت کی۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ" لڑکیاں انکساری سے بولیں۔
اتنے میں باجی نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا: "ارے عُمر! تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ جلدی سے بازار پہنچو۔ مجھے دوپہر کا کھانا بھی تیار کرنا ہے!"
"جی بہت بہتر!" ہم نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔
"یہ آپ کا بھائی ہے؟" ایک لڑکی نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں!" باجی نے جواب دیا۔
"کتنا اچھا ہے، آپ کا بھائی۔ ایک میرا بھائی ہے، کوئی کام ہی نہیں کرتا۔" وہ لڑکی بولی۔ اس کے اس جملے پر ہمارا ابھی کچھ خون بڑھ گیا۔ بعد میں جب ہم بازار سے سودا سلف لے کر واپس آئے تو پتہ چلا کہ باجی کی خوشامد بھری باتوں سے متاثر ہو کر وہ لڑکیاں انھیں مکھن کا ایک پورا پیکٹ دے گئیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ باجی نے انھیں کس طرح مکھن لگایا؟

■■

اُردو کی حمایت میں ایک تقریر

فرینڈز! .... جیسا کہ نیو ایئر آنکھ مچولی میں باور کرایا جا چکا ہے کہ آج کل ینگ جنریشن اردو میں انگلش کی ہائی مکسنگ کر رہی ہے۔ انہوں نے نہ صرف اسے مدر ٹنگ بنایا ہوا ہے۔ بلکہ اس پر پراؤڈ کرتے ہیں۔ اِٹس رانگ اینی وے! ..... ہمیں چاہیے کہ جتنا پاسیبل ہو سکے، اُردو لینگویج یوز کریں اور اردو کو مدر لینگویج سمجھتے ہوئے اُس پلیس تک لائیں ... کہ انگریز بھی اس زبان میں بات کر کے ہیپی فیل کر سکیں۔ تو آج سے ہم یہ پرامس کرتے ہیں کہ، انگلش سے بائیکاٹ اور اُردو اسٹارٹ۔ ونس اگین... تھینکس .....!

محمد انجم مبین ______ ڈیرہ اسماعیل خان

فوقیہ مشتاق

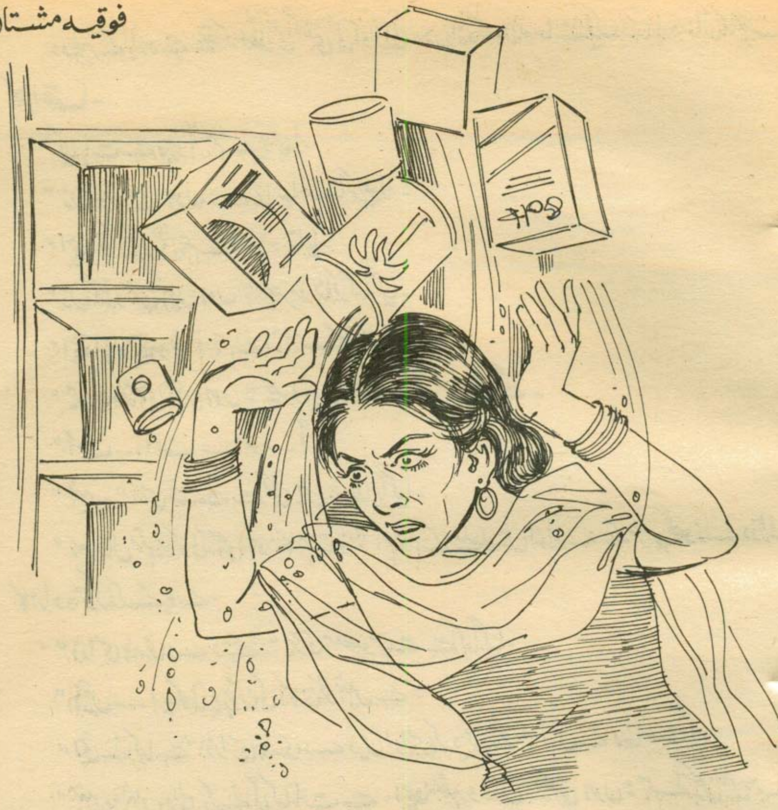

ہمسائے کا سایہ

فنّا جانی کے انتقال کی خبر ملتے ہی امّی بڑے بھیاّ کے ساتھ حیدر آباد روانہ ہو گئیں اور ہمیں نوید بھائی کے پاس اس لیے چھوڑ گئیں کہ اُن کے چار پانچ دن میں امتحان شروع ہونے والے تھے اور اُن کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نوید بھائی صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتے تو شام کو لوٹتے۔ اس کے بعد کمرہ بند کر کے پڑھتے رہتے۔ کھانا ہوٹل سے آتا تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں نوید بھائی نے فریج میں بھر دی تھیں۔

دوپہر کے بارہ بجے تھے کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک دس بارہ سال کا بچّہ کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے پپّو؟" ہم نے پوچھا۔

"میں پپّو نہیں ہوں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"اچھا تو گڈّو؟" ہم نے اندازہ بتایا۔

"میں گڈّو بھی نہیں ہوں۔" پھر منہ بنا کر کہا گیا۔

"اچھا چلو، چھوٹو!" ہم نے اندازے کا اگلا تیر چھوڑا۔

"میں چھوٹو بھی نہیں ہوں۔" پھر وہی جواب ملا تو ہم جھلّا گئے۔

"اُف... اُف... منّو...!"

"نہیں۔" اُسی شدّت سے نفی میں سَر ہلایا گیا۔

"بہرحال، تم جو کوئی بھی ہو، کام بتاؤ۔" ہم نام کے سِلسلے میں اندازے کے مزید گھوڑے دوڑانے کا ارادہ ترک کر کے بولے۔

"ذرا سی ہلدی دے دیجیے۔" بڑی معصومیت سے کہا گیا۔

"ہائیں...! یہ کوئی پرچون کی دکان تو نہیں ہے۔"

"امّی نے کہا ہے، ذرا سی ہلدی دے دیں، واپس کر دیں گے۔" اُس نے وضاحت کی۔

"نہیں، نہیں واپس کرنے کی کیا بات ہے۔ اچھا ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔" ہم نے کچن میں جا کر جائزہ لیا۔ نیچے تو ڈبوں میں کہیں ہلدی نظر نہ آئی تو ہم نے اوپر نظر دوڑائی مگر اتنی اونچائی تک ہمارا پہنچنا ممکن نہ تھا۔

"سُنو، تم جو کوئی بھی ہو، ہلدی تو اُوپر رکھی ہوگی۔ اور وہاں ہمارا ہاتھ نہیں پہنچ رہا۔"

"مگر امّی نے کہا تھا، آپ کے یہاں سے مل جائے گی۔" یہ سُن کر ہم نے سوچا، ہو سکتا ہے، امّی سے یہ لوگ چیزیں لے جاتے ہوں۔ کیونکہ نہ تو ہماری محلّے والوں سے اتنی جان پہچان ہے اور نہ ہی گھر اور کچن کے معاملات میں ہم نے کبھی دلچسپی لی۔

بہرحال، اس بچّے کو ہلدی دینے کے لیے اُوپر بنی کارنس تک پہنچنا لازمی تھا لہٰذا سب سے پہلے میز، اُس کے اُوپر کرسی اور اُس پر لکڑی کا تختہ رکھا اور اللہ کا نام لے کر چڑھ گئے۔ ہاتھ تو پہنچ گیا مگر وائے

سے قدرا کہ اب بھی ہم ٹھیک طرح سے اُوپر دیکھ نہیں سکتے تھے بہرحال اندازاً ہاتھ مارا تو قطار سے ڈبّوں کا احساس ہوا۔ آگے آگے اور ایک کے اُوپر ایک ترتیب سے۔ بڑے بڑے تھیلوں میں نہ جانے کیا رکھا تھا ایک ڈبّہ ہم نے اُٹھایا تو خوشی میں ہماری چیخ نکل گئی۔ "ہلدی۔۔۔" مگر اس کے ساتھ ہی کرسی ہلی تو ہماری جان ہی نکل گئی۔ گھبرا کے ہم نے ایک تھیلا پکڑنا چاہا، ایک تھیلے کا ہلنا تھا کہ باری باری کئی تھیلے اپنی جگہ چھوڑ گئے۔ سب سے پہلے چاولوں کی بارش ہوئی۔ پھر آٹا، بیسن، سُوجی، چینی ہم نے گھبرا کر دوسرے تھیلے کا سہارا لیا، مگر وہ بھی اپنی جگہ سے ہلا۔ اس کا ہلنا تھا کہ قیامت ہوگئی۔ تیل کی برنی ہمیں نہلاتی ہوئی دھماکے سے زمین پر جا گری۔ اس کے بعد آم کا اچار، مُولی کا اچار، گاجر کا مُربّہ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔ ہم نے چیخ ماری اور کارنس پکڑ کے جھُول گئے۔ مگر کارنس تیل کی وجہ سے چکنا ہو گیا تھا۔ لہٰذا ہمارا ہاتھ وہاں جم نہ سکا تو فوری طور پر دوسرے ہاتھ سے، ہم نے ڈھیر سارے تھیلوں کا سہارا لینا چاہا مگر ناکامی۔۔۔! اور دوسرے لمحے ہم میز کرُسی اور تختے سمیت زمین بوس ہو گئے۔ ہم نے گرتے گرتے صرف، مُونگ، مسُور، ارہر اور ماش کی دالوں کی بارش دیکھی اور اس کے بعد ہم بے ہوش ہو گئے۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ وہی بچّہ ہلدی کا ڈبّہ لیے کھڑا ہے۔ ہم نے اوسان درست کرتے ہوئے پوچھا: "کیا ہے؟"

"جی وہ امّی نے ہلدی نہیں، پسا ہُوا دھنیا منگایا تھا، میں بھُول سے ہلدی لے گیا۔" وہ مُسمسُی صورت بنا کر بولا۔

"اگر تم ان بکھری ہوئی چیزوں میں سے دھنیا تلاش کر سکو تو تلاش کر کے لے جاؤ۔" ہم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سُن کر ہمارا دل بال نوچنے کو چاہ رہا تھا۔۔۔ اس کے نہیں، اپنے!

اب سب سے بڑا مسئلہ مہینے بھر کے راشن کو بھائی جان کی آمد سے پہلے ٹھکانے لگانے کا تھا۔

خیر صاحب ہم نے کمر کس کے کام شروع کر دیا اور بھائی جان کی آمد سے پہلے کام ختم کر کے نہا دھو کر اپنی اصلی حالت میں آگئے۔

شام کو وہی بچّہ پھر آگیا۔ "اب کیا جان لینے آئے ہو؟" ہم نے اُسے گھُور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں باجی۔ جان نہیں، استری چاہیئے۔ ہماری استری کا چھوٹے بھائی گڈّو نے فیوز اُڑا دیا ہے۔" اُس نے یہ جملہ اس انداز سے کہا، گویا گڈّو اس کے بجائے ہمارا بھائی ہو۔ خیر ہم نے اُسے استری نکال کر دے دی۔

ایک دن جب ہم صبح کا ناشتہ کرنے میں مصروف تھے، ایک محترمہ تشریف لائیں معلوم ہوا کہ وہ اُس بچّے کی والدہ ہیں جو ہم سے ہر روز کوئی نہ کوئی چیز لے کر جاتا ہے۔ وہ محترمہ ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں "بیٹی آج ہمارے گھر میں قرآن خوانی ہے تمھارے یہاں اگر دری ہو تو دے دو۔ میں شام تک لوٹا دوں گی۔"

ہم نے امّی کے جہازی سائز صندوق سے دری نکال کر اُن کے حوالے کی۔ اس کے بعد اُن کے یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی چیز ہمارے یہاں سے چلی جاتی اور ہم یہ سوچ کر چیزوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتے کہ کہیں وہ لوگ یہ نہ سوچیں کہ ہم بے اعتباری کر رہے ہیں۔

ایک دن حد ہو گئی۔ اُن محترمہ نے ہم سے آکر امّی کا زیور مانگ لیا۔ بولیں: "بیٹی تم تو جانتی ہو ہم غریب لوگ ہیں، میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ کل اُس کی مہندی ہے میرے پاس سونے کا زیور نہیں ہے تم ایک سیٹ دے دو میں واپس کر دوں گی۔"

"مگر... دیکھیں میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ امّی سے پوچھے بغیر میں..."

ہمارے انکار پر وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔ "دیکھو، ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی پر بڑا حق ہوتا ہے، صرف ایک دو دن کی تو بات ہے، اللہ نے تم لوگوں کو دیا ہے، تمھیں چاہیئے کہ غریب پڑوسیوں کی مدد کرو، اُن کے آڑے وقت میں کام آؤ، اگر میں تمھاری امّی سے مانگتی تو شاید وہ انکار نہ کرتیں۔ آج ہماری عزّت رکھو۔ پڑوسی کا حق ادا کرو، کل اللہ تمھاری مدد کرے گا۔"

ہم نے حقِ ہمسایہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سُنا ہے اور ویسے بھی ہم ٹھہرے کمزور دِل کے۔ ہم نے انھی کے سامنے سیف کھول کر امّی کا سب سے بھاری سونے کا سیٹ نکال کر انھیں دے دیا۔ صرف یہی نہیں، چار باہر کی اور چار کمخواب کی بھاری ساڑیاں، دو غرارہ سوٹ، دو بھرے دوپٹے اور دو جوڑی سینڈل، چار کانچ کی چوڑیوں کا سیٹ اور ایک درجن سونے کی چوڑیاں۔ اُس رات ہمارا دِل پُر سکون تھا ہم نے کسی کی مدد کی تھی پڑوسی ہونے کا حق ادا کیا تھا۔ ہم نے سوچا، جب وہ اپنی بیٹی کی مہندی سے فراغت پالیں گے تو ہم ساری چیزوں کی واپسی کا مطالبہ کریں گے کیوں کہ ہمارے گھر سے کافی چیزیں جا چکی تھیں۔ نوید بھائی سے تو کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا چشمہ برابر کرتے، نوٹس اور کتابیں اُٹھائے گھر سے نکلتے اور اسی طرح گھر میں بنا اِدھر اُدھر دیکھے داخل ہوتے تھے۔ کھانا بھی اپنے کمرے میں کھاتے تھے۔ اور چائے بھی وہیں پیتے تھے اور امّی جان کو تو گئے ابھی دس روز ہی ہوئے تھے، جبکہ وہ بیس دن کے

لیے گئی تھیں، لہٰذا ہمارا خیال تھا کہ امّی کی واپسی سے پہلے پہلے ہم تمام چیزیں اُن سے مانگ لیں گے ۔ یوں پڑوسی ہونے کا حق ادا کر کے ثواب بھی حاصل کریں گے اور کسی کی مدد بھی ہو جائے گی ۔

دو دن سکون سے گزر گئے تیسرے دن ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ کسی نے بیل بجائی، ہم نے سوچا ہو سکتا ہے، وہی محترمہ چیزیں واپس کرنے آئی ہوں ۔ ہم نے دروازہ کھولا ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہمیں یوں لگا جیسے کسی نے ہمارا سارا خون نچوڑ لیا ہو ۔ سامنے امّی جان کھڑی تھیں ۔

" آ ۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ آگئیں ؟" حیرت اور دہشت سے، ہماری آنکھیں پھیل گئیں " ہٹو ۔۔۔ راستہ تو دو" ہماری امّی بڑی تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں، ہم نے راستہ دیا اور مرے مرے قدموں سے اندر آگئے ۔

" ہائیں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ !" انھوں نے اِدھر اُدھر گھوم کر ہمیں حیرت سے دیکھا ۔

" کیا ہوا ؟" ہم پریشانی سے بولے ۔

" یہ ۔۔۔ !"

اتنا کہہ کر ایک دم ہی انھوں نے کچن، ڈائننگ، ڈرائنگ روم میں جھانک ڈالا " کیا ہُوا! ۔۔۔ کیا خُدانخواستہ چوری ہو گئی !" وہ فکرمندی سے بولیں ۔

" نہیں امّی ! وہ ۔۔۔ دراصل ۔۔۔ !" ہمیں انھوں نے جملہ مکمل کرنے ہی نہیں دیا ۔

" یہ کرسیاں، واشنگ مشین، ٹیبل فین، صوفہ سیٹ، قالین، ٹیپ ریکارڈر اور کچن کا سامان اور ۔۔۔ اور دیگر چیزیں، یہ سب کیا ہوئیں ؟" ممّی اپنی ریشمی ساڑی سنبھالتی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بولیں ۔

" نوید کہاں ہے ؟" کچھ دیر بعد اُنھوں نے کڑک کر پوچھا اور ہم سمٹ کر خاموش ہی رہے ۔ انھوں نے زور سے آواز دی تو نوید بھائی دوڑے چلے آئے ۔ اپنا چشمہ برابر کیا اور پھر ایک دم حیرت سے چلّائے ۔

" اُو ۔۔۔ مما ! آپ آگئیں ؟" پھر ان کی نظر مما کے چہرے پر پڑی تو ایک دم سنجیدہ ہو گئے ۔

" مجھے یہ بتاؤ، گھر کا سارا سامان کہاں گیا ؟" ممّی نے بڑے غصّے سے پوچھا ۔

" جی ۔۔۔ میں سمجھا نہیں !" نوید بھائی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ۔

" اپنے اِردگِرد دیکھو ۔ کوئی فرنیچر، کوئی چیز نظر آ رہی ہے تمھیں ؟" ممّی کے توجہ دلانے پر نوید بھائی نے اپنا چشمہ برابر کیا اور چاروں طرف نظر دوڑاتے ہی حیران رہ گئے ۔

" اوہ واقعی، آپ درست کہہ رہی ہیں مما ! ۔۔۔ کیا ڈاکہ پڑا تھا، بے بی ؟" وہ ہم سے مخاطب ہوئے ۔

" نوید ! میری غیر موجودگی میں تم گھر کے بڑے تھے ۔ بے بی سے کیا پوچھ رہے ہو ؟"

ممّی کا پارہ اونچا ہونے لگا۔

"او۔۔۔ نو مَما! میں تو سارا دن پروفیسر جان کے پاس ہوتا ہُوں یا پھر لائبریری میں۔ اگر ڈاکہ پڑا تھا تو بے بی کو ذکر کرنا چاہئیے تھا۔" نوید بھائی بوکھلا کر بولے۔

"جتنی بے وقوف بے بی ہے، اُس سے زیادہ بے وقوف تم ہو۔ اُف اللہ! کیسے بے وقوف بچّوں سے پالا پڑا ہے میرا۔ کچھ بولو بے بی! میں پہلے ہی بڑی پریشان ہوں۔ بتاؤ، میرے بعد اس گھر میں کیا سانحہ پیش آیا؟"

"وہ دراصل ممّی۔۔۔ وہ فرسٹ فلور پر جو نائلہ آنٹی رہتی ہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل اُن کو ضرورت تھی!" ہم نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"کیا؟" ممّی حیرت سے چلّائیں "میں تو تمھاری اُن نائلہ کو نہیں جانتی۔"

"انھوں نے کہا تھا، وہ جلد ہی واپس کر دیں گی۔" ہم نے رونی صورت بنا کر کہا۔

"کیا بکواس ہے میری سمجھ میں نہیں آرہا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" ممّی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"میں نے تو صرف اُن کی مدد کی ہے۔ میں سمجھی، آپ ان کو دیتی رہتی ہوں گی۔" ہم منمنائے۔

"اُف!۔۔۔ بے وقوف لڑکی، مدد اس طرح کی جاتی ہے کہ پورا گھر ہی لُٹا دو۔ اگر دو چار چیزیں دی ہوتیں تو کوئی بات تھی۔ تم نے تو پُورا گھر اُٹھا کر اُن کے حوالے کر دیا۔ جاؤ، ابھی جا کر اُن سے ساری چیزیں مانگ لاؤ۔ اُن سے کہو، ابھی اور اسی وقت سارا سامان اُوپر بھیجیں۔" ممّی نے کھڑے ہو کر حکم دیا۔ اُن کا پارہ یقیناً آخری حد تک جا پہنچا تھا۔ ہم تھر تھر کانپتے نائلہ آنٹی کے گھر کی طرف جانے لگے۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک خاتون نکلیں۔ "وہ نائلہ آنٹی کہاں ہیں؟" ہم نے اُن سے پوچھا۔

"کون نائلہ آنٹی؟" انھوں نے اُلٹا ہم سے سوال کر ڈالا۔

"تو، ممّی کی طرح آپ بھی نہیں جانتیں۔ وہی، جن کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے اور جن کا دس بارہ سال کا ایک بچّہ ہے اور۔۔۔ اور جو ہمارے گھر کا سارا سامان اُٹھا لائی ہیں۔" ہم بڑے جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔ ممّی کی ڈانٹ سُننے کے بعد ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے روئیں۔ اب ہمیں احساس ہو رہا تھا کہ ہم نے واقعی غلطی کی۔ انھوں نے تو سارا سامان خراب کر دیا ہوگا۔ اس صورتِ حال کے بعد ہمدردی اور ثواب کمانے کا شوق ہَوا ہو گیا تھا۔

"یہاں تو ایسے کوئی لوگ نہیں رہتے۔" وہ خاتون بیزار ہونے لگیں۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں، کیوں نہیں رہتے" ہمیں غصّہ آنے لگا۔

"اچھا، اب سمجھی، بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ خود کل ہی اس مکان میں شفٹ ہوئے ہیں۔ وہ لوگ ہم سے پہلے یہاں رہتے ہوں گے جن کا آپ ذکر کر رہی ہیں" شاید بم کے دھماکے کا اثر بھی اتنا شدید نہ ہوتا، جتنا اُن کی یہ بات سُن کر ہم پر ہُوا۔

"کہاں گئے وہ لوگ؟" ہم نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"ہمیں کیا معلوم۔ ہم نئے کرائے دار ہیں۔ ویسے شاید وہ کسی دوسرے شہر گئے ہوں گے۔ کیونکہ ہمیں دس دن پہلے یہاں آنا تھا، مگر وہ لوگ اسی لیے خالی نہیں کر رہے تھے کہ اُنھیں دوسرے شہر جانے کے لیے سارے سامان کی اچھی طرح پیکنگ وغیرہ کرنی تھی" یہ سُن کر تو ہمارے دیوتا ہی کوُچ کر گئے۔ ڈوبتے دل کو سنبھالتے ہم اپنے فلیٹ میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دو زینے چڑھے، مگر پھر ہمت جواب دے گئی اور ہم وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہم سوچ رہے تھے 'ابھی تو امّی کو بڑے نقصان کا علم ہی نہیں ہوا۔ اپنے زیور اور کپڑوں کا اس کے علاوہ سینکڑوں چھوٹی چھوٹی چیزیں۔۔ یہ سوچتے ہوئے ہمیں چکّر آنے لگا۔ ہم نے ہلتے ڈولتے اور چکراتے سر کے ساتھ آئندہ کے لیے پڑوسیوں کی مدد کرنے سے توبہ کر لی ہو سکتا ہے آپ یہ کہیں کہ پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور سارے پڑوسی تو ایسے نہیں ہوتے مگر، جناب آپ چاہیں کچھ کہیں اب تو ہمیں، ہمسائے کا سایہ بھی جُھلسا دینے والی دھوپ لگتا ہے۔

بقیہ :۔ گنی چنی معلومات

• اولمپک پرچم میں پانچ دائرے پانچ برِّاعظموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ پانچ دائرے سُرخ، سبز، سیاہ زرد اور نیلے رنگوں پر مشتمل ہیں اور کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے پرچم پر ان رنگوں میں سے کم از کم ایک رنگ ضرور پایا جاتا ہے۔

• پانچ پیغمبروں نے عربی زبان میں تبلیغ کی۔ ان کے نام ہیں۔ حضرت ہوُدؑ، حضرت صالحؑ، حضرت اسماعیلؑ حضرت شعیبؑ اور خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم۔

• اسلام کے بنیادی ارکان اور بنیادی عقائد دونوں کی تعداد پانچ پانچ ہے۔

• قوّتِ باصرہ (دیکھنا)، قوّتِ سامعہ (سننا) قوّتِ شامّہ (سونگھنا) قوّتِ لامسہ (چھُونا) اور قوّتِ ذائقہ (چکھنا) کو بالعموم حواسِ خمسہ کہا جاتا ہے۔

باقی آئندہ

وی سی آر

شاہ نواز فاروقی

کل ملے تو میں نے پوچھا حضرتِ شیطان سے
کس لیے اُکتا گئے ہیں آپ پاکستان سے؟

ایک عرصہ ہو گیا میرے وطن آئے نہیں
کچھ نئے فتنے زمیں پر میری پھیلائے نہیں

ہنس کے بولے اب مرا آنا یہاں بے کار ہے
کیونکہ ہر گھر میں یہاں موجود وی سی آر ہے

کام جو کرتا تھا میں وہ کر رہا ہے وی سی آر
یعنی پھیلانا مسلسل ہر طرح کا انتشار

بچّہ بچّہ قوم کا اس چیز کے زیرِ اثر !
ہو رہا ہے روز اِک تازہ بُرائی کی نذر

انڈین فلموں کے ہیرو قوم کے ہیرو ہیں اب
اور جو اصلی تھے ہیرو سب کے سب زیرو ہیں اب

چھوٹی چھوٹی بچّیاں کرتی ہیں وہ سولہ سنگھار
دیکھ کر "ریکھا" کو بھی چڑھ جائے تو ڈگری بُخار

ہو گئی معصومیت بچّوں کے چہروں سے فرار
بن گئے معصوم چہرے پختگی کا اشتہار

خیر سے یہ حال ہیں اب قوم کے اعمال کے
عشق فرماتے ہیں بچّے، آٹھ، نو، دس سال کے

اور جو حالت ہے معلومات کی وہ بھی سُنیں
اور سُن کر ہو سکے ممکن تو اپنا سر دُھنیں

کون تھے جو ہر کسی بچّے سے گر پوچھیں گے آپ
وہ کہے گا آپ سے متھن چکرورتی کے باپ

کون تھے اقبال گر پوچھا، تو پاؤ گے جواب
یہ کہ وہ سب شاعروں کے تھے امرت بچن جناب

مختصر بتلاؤں تم کو اِس مشین نے کیا کِیا
قوم کے کردار کا قیمہ بنا کر رکھ دیا !

یہ کہا شیطان نے اور مسکرا کر چل دیا
ہم نے بھی شرما کے اپنے گھر کی جانب رُخ کِیا

ایک صاحب جن کا دفتر روز نو بجے کھلتا تھا، ہر روز دیر سے دفتر پہنچتے تھے۔ ایک دن جب وہ دیر سے دفتر پہنچے تو اُن کے باس نے چلّا کر کہا "تمھیں نو بجے یہاں ہونا چاہیئے تھا۔"

"کیوں، یہاں نو بجے کیا ہُوا تھا؟" اُن صاحب نے نہایت اطمینان سے پوچھا

روبینہ احمد ________ لیاقت آباد، کراچی

جُوتوں کی ایک دُکان پر دکاندار نے بورڈ پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھوایا ہُوا تھا "ریسنگ کے جُوتے پہن کر دیکھنے سے قبل اُن کی قیمت چُکانا ضروری ہے۔"

ابنِ مُفرّح ________ گجوخان روڈ، مردان

ایک صاحب کی بیگم اُنھیں کئی روز سے کہہ رہی تھیں کہ اب ہمیں کسی مہنگے گھر میں چلے جانا چاہیئے۔ ایک دن وہ صاحب دفتر سے مُسکراتے ہوئے آئے اور بیگم سے مخاطب ہو کر بولے۔

"بیگم! خوش ہو جاؤ۔ ہمیں اب دوسرا گھر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مالک مکان نے اسی گھر کا کرایہ بڑھا دیا ہے۔"

عائشہ سلیم ________ کراچی

"کمپیوٹر بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں! ایک سو انسان جو غلطی سال بھر میں کریں گے، کمپیوٹر سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں کر دے گا۔" محمود حسین ________ کراچی

تین افراد ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے بدقسمتی سے اُن میں سے ایک باہر گر گیا۔ خوش قسمتی سے زمین پر خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ بدقسمتی سے اس گھاس کے درمیان ایک دوشاخہ بھی موجود تھا خوش قسمتی سے وہ شخص دوشاخے پر گرنے سے بچ گیا۔ بدقسمتی سے وہ گھاس کے ڈھیر پر بھی نہ گر سکا۔

اورنگ زیب عالمگیر ——— سڈھانڈی

ایک شخص پچھلے ایک مہینے سے سو نہ سکا تھا۔ گھر والوں نے پریشان ہو کر ڈاکٹر کو بُلا بھیجا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور تشخیص کی کہ اعصاب کی خرابی ہے لہٰذا مریض کو سُلانے کے لیے مسمریزم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مریض کے پاس جا کر دھیمے لہجے میں عمل شروع کیا۔

"تمھیں نیند آرہی ہے۔ تم سونے والے ہو، تمھاری آنکھیں بند ہونے والی ہیں۔ تم سو گئے ہو۔"

گھر والے یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ مریض کی آنکھیں واقعی بند ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر کو فیس دے کر رخصت کیا جونہی دروازہ بند ہوا، مریض نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا۔

"کیا وہ پاگل جا چکا ہے؟"

نادیہ مختار ——— گلشن اقبال کراچی

ایک گھر میں بہت سے بچے تھے والدین کو ان کے چہرے اور نام یاد رکھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ایک صبح ناشتے پر بیٹھے تو ماں نے دیکھا، ایک بچہ بڑا خاموش اور سہما سہما بیٹھا ہے، ماں پیار سے چمکارتے ہوئے بولی: "بیٹا ناشتہ کرو نا، تم چپ کیوں ہو؟"

"میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ کل آپ کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے آگیا تھا اُس وقت سے یہیں ہوں۔ اب مجھے گھر جانے دیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

عالیہ مظہر ——— شادمان ٹاؤن، کراچی

ایک صاحب، جنھیں اپنی نظر پر شبہ تھا، عینک ساز کے پاس گئے اس نے کئی طرح کے شیشے دکھائے لیکن ان کو پسند نہ آئے آخر کار تنگ آکر عینک ساز نے اُنھیں آتشی شیشہ (محدب عدسہ) دکھایا۔ ان صاحب کو فوراً پسند آگیا، ان کے لیے ایک عینک تیار کر دی گئی۔ عینک لگاتے ہی وہ بازار گئے ایک کپڑے والے کی دکان پر دوپٹے کو پکڑا اور بولے۔ "کیوں صاحب یہ شامیانے آپ کتنے کرائے پر دیتے ہیں؟"

عالیہ مظہر ——— شادمان ٹاؤن، کراچی

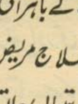

ایک ملک میں یہ رواج تھا کہ وہاں کے سب ڈاکٹر اپنے مطب کے باہر اتنی سرخ بتیاں جلاتے تھے، جتنے ان کے زیرِ علاج مریض مر جاتے تھے۔ اور جو ڈاکٹر جان بوجھ کر کم بتیاں جلاتا، حکومت اسے دھوکہ

دہی کے الزام میں پکڑ لیتی ۔۔۔ ایک دفعہ ایک امریکن سیّاح وہاں پہنچا اور اتفاق سے بیمار پڑ گیا۔ اس نے اپنے نوکر کو بلا کر کہا "جاؤ جس ڈاکٹر کے مطب کے باہر سب سے کم بتیاں جلی ہوں، اُسے یہاں لے آؤ"۔

نوکر ایک ایسے ڈاکٹر کو لے آیا جس کے مطب کے باہر صرف دو سرخ بتّیاں جل رہی تھیں۔ دوائی لینے کے بعد سیّاح نے خوش ہو کر ڈاکٹر سے پوچھا "آپ کے زیرِ علاج صرف دو مریض ہی فوت ہو سکے آپ تو بہت ہی مشہور ہوں گے۔ ویسے آپ کب سے یہ کام کر رہے ہیں؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "جی! میں نے آج صبح سے ہی پریکٹس شروع کی ہے"۔

محمد ادریس قریشی ——— منڈی بہاؤ الدین

ایک پادری **کا** دعویٰ تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ ایک عورت کا بچّہ مر گیا تو وہ اس پادری کو اپنے گھر لے گئی، پادری نے میّت کے سرہانے کھڑے ہو کر پہلے چند مناجات پڑھیں۔ اور پھر اونچی آواز میں بولا "باپ کا حکم بجا لاؤ بیٹے! اُٹھ کھڑے ہو" بچّے نے حرکت نہ کی تو پادری نے دوبارہ مناجات پڑھیں اور بولا "یہ تمہاری ماں کا حکم ہے، اُٹھ بیٹھو" مردہ بچّہ بے حس و حرکت رہا۔ تو پادری نے غصّے میں دہاڑ کر کہا "پادری تمہیں حکم دیتا ہے کہ اٹھ جاؤ"۔ مردے کو یہ حکم بھی سنائی نہ دیا۔ پادری نے منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے، بچّے کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا "ایسے بے ہودہ بچّے کا مر جانا ہی بہتر ہے، جو ماں باپ اور پادری کا حکم بھی ماننے کے لئے تیار نہیں"۔

اسعار احمد ——— لیاقت آباد کراچی

فلموں کا ایک کاؤبوائے (فلموں میں مار دھاڑ کرنیوالا) اپنے ایک دوست کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ سامنے کی میز پر چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں کاؤبوائے اپنے دوست کو بغیر کوئی اشارہ کئے کہنے لگا "وہ شخص مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

دوست نے پوچھا "کونسا شخص"۔

اس نے کہا "وہ کالے رنگ والا" دوست بولا۔ "رنگ تو سبھی کے کالے ہیں"۔

اس نے کہا "وہ بڑی مونچھوں والا"۔

دوست نے پھر کہا "مونچھیں بھی سبھی کی بڑی ہیں" تو وہ بولا "وہ نیلے سوٹ والا"۔

دوست ۔۔۔ جھلا کر بولا "سوٹ بھی چاروں کا نیلا ہے، آخر تمہیں کون اچھا نہیں لگتا"۔

جلعب میں کاؤبوائے نے پستول نکالا اور چاروں میں سے تین کو مار ڈالا۔ پھر چوتھے شخص کی طرف، جو اب اکیلا رہ گیا تھا۔ اشارہ کر کے کہنے لگا "یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

شکیل احمد عزیزی ——— طورو، ضلع مردان

ایک شخص (دوسرے سے) "جب میں نے سگریٹ پینا چھوڑا تو شروع میں بہت تکلیف ہوئی لیکن چوتھے دن بڑا سکون محسوس ہُوا۔"

دوسرا: "وہ کیسے؟"

پہلا: "چوتھے دن میں دوبارہ سگریٹ شروع کر چکا تھا۔"

ایک نوجوان سیلز مین نے ایک تجربہ کار سیلز مین سے کہا کہ آج کا دن بہت خراب گزرا، جہاں بھی میں آرڈر لے گیا، بے عزتی ہوئی۔

تجربہ کار سیلز مین بولا: "عجیب بات ہے۔ آرڈر حاصل کرنے کے سلسلے میں مجھے بھی طرح طرح کے تجربے ہوئے۔ مجھے ڈانٹا ڈپٹا بھی گیا، کبھی کبھی زینے سے دھکیلا اور دروازے سے باہر بھی پھینکا گیا۔ لیکن بے عزتی کا سامنا مجھے کبھی نہیں کرنا پڑا!"

شاہینہ زبیری ـــــ سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

سوال: "سائنسدان دوپہر کے کھانے میں کیا کھاتے ہیں؟"

جواب: "مائیکرو چپس!"

عاصرا عجاز ـــــ ڈنگہ گجرات

ایک صاحب کی بڑے عرصے بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے خیریت دریافت کرتے ہوئے پوچھا: "اور سناؤ! تمھارے بیٹے کیا کر رہے ہیں؟"

دوست نے جواب دیا: "ماشاءاللہ، میرا ایک بیٹا ڈاکٹر ہے، دوسرا وکیل ہے اور تیسرا انجینئر ہے۔"

"بہت خوب! لیکن تمھارا چوتھا بیٹا بھی تو تھا، وہ کچھ نہیں کرتا کیا؟"

"بھئی کیا بتاؤں! وہ کمبخت پڑھ لکھ نہیں سکا اور حجام بن گیا۔"

"ارے!" اس آدمی نے تعجب سے کہا: "پھر تم نے اُسے گھر سے نکال کیوں نہیں دیا؟"

"کیسے نکال دُوں! گھر کا تمام خرچ وہی تو چلاتا ہے۔"

نادیہ مختار ـــــ گلشن اقبال کراچی

ایک کسان کا لڑکا پڑھ لکھ کر دوسرے مُلک گیا کچھ دن بعد اُس نے تار دیا کہ میری فیملی یہاں بھیج دو، لیکن گاؤں میں کوئی بھی فیملی کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ آخر کار ایک شخص نے بتایا کہ فیملی رضائی کو کہتے ہیں۔ تو کسان نے اپنے بیٹے کو جواب میں لکھا کہ تمھاری فیملی کو چوہے کھا گئے ہیں۔

کاشف آزاد ـــــ راولپنڈی

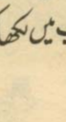

جُوتوں کی دُکان کے پوسٹر کے اوپر کسی نے اسپتال کا پوسٹر لگا دیا۔ کچھ دنوں بعد اُوپر والا پوسٹر جگہ جگہ سے پھٹ گیا، اب اشتہار کچھ یوں تھا: "ہمارے ہاں مریضوں

کی خاص مرمّت کی جاتی ہے۔ جُوتوں کو چیچک کے ٹیکے لگانے کا خاص انتظام ہے۔ مریضوں کو ایک سال کی گارنٹی دی جاتی ہے۔"

ولی محمد ———— لانڈھی، کراچی

کرکٹ میچ ہو رہا تھا ایک بولر بہت تیز بولنگ کر رہا تھا۔ اس کی پہلی بال بیٹسمین کے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری بال بیٹسمین کے ہیلمٹ کو گراتی ہوئی نکل گئی، تیسری بال بیٹسمین کے پاؤں پر لگی۔ ایمپائر نے بیٹسمین سے پوچھا "کیا وہ کھیلنے کے قابل ہے؟"

بیٹسمین نے جواب دیا "ہاں، لیکن وہ سائیڈ اسکرین کی پوزیشن میں تبدیلی چاہتا ہے۔" ایمپائر نے پوچھا۔ وہ سائیڈ اسکرین کی پوزیشن میں کہاں تک تبدیلی چاہتا ہے۔

بیٹسمین نے جواب دیا کہ وہ سائیڈ اسکرین کی پوزیشن میں اتنی تبدیلی چاہتا ہے کہ سائیڈ اسکرین اُس کے اور بولر کے درمیان لاکر کھڑی کردی جائے!

مرتضیٰ علی خان ———— طارق روڈ کراچی

ایک ڈاکٹر نے مینڈک کو بے ہوش کرنا تھا، لیکن اُسے بے ہوش کرنے کی کوئی دوا نہ ملی، ایک لڑکا پاس کھڑا تھا۔ اُس نے کہا "میری جُراب سُنگھا لیں"۔

ڈاکٹر نے کہا "مینڈک کو بے ہوش کرنا ہے، مارنا نہیں... !"

محمد رفیع ———— گاؤں کوٹیاں

ایک عورت گنجی تھی اتفاق سے اُس کے سر پر تین بال اُگ آئے اُسے دعوت میں جانا تھا اور سر پر صرف تین بال تھے۔ اُس نے اپنی نوکرانی کو بلایا اور خوش ہو کر بولی "یہ دیکھو، میرے تین بال اُگے ہیں، میرا جُوڑا بنا دو"۔

نوکرانی جُوڑا بنانے لگی تو ایک دم مایوس ہو کر بولی۔

"ایک بال ٹوٹ گیا ہے"۔

عورت بولی "چُٹیا بنا دو"۔ یوں ایک بال اور ٹوٹ گیا۔ نوکرانی نے عورت کو بتایا تو وہ بولی "چلو کوئی بات نہیں، آج میں بال کھول کر ہی چلی جاؤں گی"۔

سائرہ ظفر ———— میسن روڈ لاہور

ایک ڈاکٹر رات گئے اسپتال سے نکلا۔ ابھی وہ اپنی کار تک پہنچا ہی تھا کہ ایک پاگل اُس کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر بھاگ اُٹھا۔ پاگل بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ آخر ڈاکٹر بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور زمین پر گر پڑا۔ پاگل نے اُس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اُسے ہاتھ لگایا اور بولا۔

"چھو لیا..."

عظمیٰ عقیل فاروقی ———— میانی روڈ سکھر

سردی کا موسم تھا۔ مُلّا نصیرالدین لحاف اوڑھے سو رہے تھے کہ اچانک گلی سے شور و غُل کی آواز آئی۔

ملا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور شور وغل کی وجہ معلوم کرنے لحاف اوڑھے ہی باہر نکل گئے گلی میں دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ملا صاحب اُن کے قریب پہنچے تو ان میں سے ایک آدمی اُن کا لحاف اُتار کر بھاگ گیا۔ ملا سردی سے کانپتے ہوئے گھر میں آئے تو بیوی نے پوچھا "وہ لوگ کیوں لڑ رہے تھے؟"

"میرے لحاف کے لیے"۔ ملا نے جواب دیا۔

انیلا تسلیم احمد ـــــ ملتان

تھیٹر کے ٹکٹ گھر سے ایک طوطا اُڑ گیا۔ جو ٹکٹ لینے والوں سے کہتا تھا "قطار بنائیے، قطار بنائیے"۔ مالک ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک جگہ پہنچا جہاں بہت سے طوطے اُس کو مار رہے تھے اور طوطا اُن سے کہہ رہا تھا۔

"قطار بنائیے، قطار بنائیے"۔

مظہر اقبال ـــــ عثمان آباد کالونی، ملتان

اُستاد (کلاس سے مخاطب ہو کر) "قیامت کے دن زمین پھٹ جائے گی۔ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر روئی کی طرح اُڑ جائے گا ہر چیز فنا ہو جائے گی"

ایک طالب علم: "جناب اُس دن اسکول میں چھٹی ہوگی؟"

محمد موسیٰ سومرو ـــــ سیٹلائٹ ٹاؤن، نیو کوئٹہ

ایک پادری نے مجمع میں وعظ کرتے ہوئے کہا۔ لوگو! اللہ سے ڈرو۔ بُرائیوں سے بچو! ورنہ قیامت کے روز تم پچھتاؤ گے اور ڈر کے مارے تمھارے دانت بجیں گے۔۔۔"

"لیکن میرے تو دانت ہی نہیں ہیں"۔ ایک بوڑھی نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا "پھر بجیں گے کیسے؟"

"کوئی بات نہیں" پادری نے برجستہ جواب دیا۔ "دانت بھی مہیا کر دیے جائیں گے"۔

حامد علی شاہد ـــــ لاوہ۔ چکوال

ایک آدمی کے دونوں کان جلے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ وہ اپنے کپڑے استری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اُس نے ٹیلیفون ریسیور کی بجائے استری کان پر لگالی۔

"مگر آپ کے تو دونوں کان جلے ہوئے ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جونہی میں نے استری نیچے رکھی۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بج اُٹھی" مریض نے جواب دیا۔

سمیرا اعجاز ـــــ ڈنگہ، گجرات

روس کی خفیہ پولیس اقبالِ جرم کرانے میں ماہر خیال کی جاتی ہے۔ لہٰذا روسی سائنسدانوں نے مصر کی ایک قدیم ممی کی صحیح عمر کا تعین کرنے کے لیے خفیہ پولیس کی خدمات حاصل کیں۔ پولیس والے ممی کو اُٹھالے گئے اور تین گھنٹے بعد رپورٹ دی کہ ممی کی صحیح عمر چار ہزار

دوسو تیس برس ہے۔

سائنسدانوں نے حیران ہو کر پوچھا: "اتنی صحیح عمر آپ نے کیسے معلوم کی؟"

"بہت آسانی سے" پولیس افسر نے فخر سے جواب دیا "ممی نے خود اقبال کیا ہے!"

مرتضیٰ علی خان ـــــ پی ای سی ایچ ایس ۔ کراچی

شربت والے نے شربت دے دیا۔ اس شخص نے شربت پی کر کہا: "ایک گلاس اور دینا میری لڑائی اب ہونے والی ہے۔" اس طرح وہ دوسرا گلاس پی گیا اور بولا "تیسرا گلاس بھی دینا اب تو میری لڑائی ہونے ہی والی ہے"

شربت والے نے تنگ آکر کہا "آخر تمھاری لڑائی کس سے اور کہاں ہونے والی ہے؟"

وہ شخص بولا "میرے پاس چونکہ پیسے نہیں ہیں، اس لیے تم سے لڑائی ہونے والی ہے۔"

محمد راحیل عبید ـــــ ناظم آباد کراچی

مہمان نے کہا: "آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ میں آؤں گا اور بار بار آؤں گا۔"

میزبان نے تقریباً روتے ہوئے کہا: "جب آپ جائیں گے ہی نہیں تو آئیں گے کیسے؟"

مرتضیٰ علی خان ـــــ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

"امی! میں نہانے جا رہا ہوں۔"

امی: "نہیں بیٹے! تم ڈوب جاؤ گے۔"

بیٹا: "نہیں امی! میں ضرور جاؤں گا۔"

امی: (غصے سے) "کمبخت اگر ڈوب گیا تو گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔"

بابر الرحمٰن ـــــ حیدرآباد

گلے کا آپریشن ہو جانے کے بعد جب مریض کو ہوش آیا تو اس نے نرس سے پانی مانگا۔ نرس نے پوچھا "کیا آپ کو پیاس زیادہ لگی ہے؟"

مریض: "جی نہیں، میں تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا گلا لیک تو نہیں کر رہا۔"

محمد پرویز آرائیں ـــــ کوٹ عبدالمالک لاہور ۳۵

بینک میں ایک شخص نے اعلان کیا "کیا کسی شخص کی ایسی نوٹوں کی گڈی گری ہے، جس پر ربر بینڈ چڑھا ہوا تھا۔" جواب میں کئی دعویدار پیدا ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔" اس شخص نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "دراصل مجھے صرف ربر بینڈ پڑا ہوا ملا تھا۔"

لوگ: "مگر سائنسدان صاحب! یہ آگ لگی کیسے؟"

سائنسدان: "میری آگ بجھانے والی مشین سے!"

سید یوسف شاکر نصر اللہ ـــــ کراچی

سالانہ میٹنگ میں بینک کے اعلیٰ افسر اور دوسرے

ملازم اکٹھے ہوئے تو بینک مینجر نے گزارش کی "جناب ہمارے گن مین کے کارتوسوں کو بڑا عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ نئے کارتوس خریدنے کی اجازت دے دیں۔"

"آپ بھی کیسے لوگ ہیں ان کارتوسوں کو چلا کر دیکھ لیں، جو ٹھیک ہوں وہ رکھ لیں اور خراب کارتوسوں کی جگہ نئے خرید لیں۔" افسرِ اعلیٰ نے جواب دیا۔

ایم اکرم سیال عاجز۔ ——— وکیل والا

پہلا لڑکا: "کیا تم لڑ سکتے ہو؟"

دوسرا لڑکا: "نہیں"

پہلا لڑکا: "پھر اٹھو۔ یہ سیٹ مجھے دے دو"

یاسر اعجاز۔ ——— ڈنگہ، ضلع گجرات

باپ: "بیٹا حمید! کمرے میں جاکر دیکھنا، کلاک چل رہا ہے یا نہیں؟"

حمید: (واپس آکر) "کلاک چل تو نہیں رہا، البتہ کھڑا دُم ہلا رہا ہے۔"

ندیم آفاق ——— ملیر کالونی، کراچی

انگلستان کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل ایک دفعہ پاگل خانے کا معائنہ کرنے گئے۔ سب جگہیں دیکھ لیں تو انہیں خیال آیا کہ کسی کارندے سے کوئی سوال تو پوچھا ہی نہیں۔ دفتر کے باہر ایک آدمی کھڑا تھا اس سے پوچھنے لگے: "آپ کون ہیں؟"

اُس نے بتایا کہ وہ پاگل خانے میں زیر علاج تھا اور اب صحت یاب ہونے کے بعد گھر واپس جا رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا: "آپ کون ہیں؟"

"میں وزیر اعظم ہوں" چرچل نے جواب دیا۔

اس شخص نے ہنس کر چرچل کے کندھے پر ہاتھ مارا اور ہمدردی سے کہنے لگا: "بڑے میاں، فکر نہ کرو ٹھیک ہو جاؤ گے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اپنے آپ کو بادشاہ کہا کرتا تھا۔"

ایس نظیو سندھی ——— کندھ کوٹ

کسی پادری نے ایصالِ ثواب کی خاطر گرجا کے دروازے پر لکھ دیا۔ "میرا پیارا بھائی اسمتھ آج صبح تین بجے اس جہانِ فانی سے جنت الفردوس کی جانب کوچ کر گیا ہے۔" دوسرے دن جب وہ گرجا گھر میں داخل ہونے لگا تو اُس کی نگاہ اپنی تحریر پر پڑی جس کے نیچے کسی نے لکھ دیا تھا۔

"از جنت الفردوس ۸ بجے صبح۔ مسٹر اسمتھ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔ ہمیں بے حد تشویش ہے۔"

خُرّم عبدالحمید بٹ ——— گلشن اقبال، کراچی

ایک افیمی نشہ کر کے جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے بچوں نے پتھر مارے، ایک پتھر افیمی کی ٹانگ پر لگا۔ افیمی چلا کر بولا: "خدانخواستہ اگر اِدھر میری آنکھ ہوتی تو!"

بابر الرحمٰن ——— حیدرآباد

SCHOOL FOR FOOLS!!
اکبر نے بادشاہ بنتے ہی پہلا کام کیا کیا؟
وہ تخت پر بیٹھ گیا
HAR! HAR!
دودھ والی پانچ چیزوں کے نام بتاؤ؟
چائے، کافی، ملک شیک اور دو گائیں
ٹیچر نے مجھ سے بلیک بورڈ صاف کرنے کو کہا اور میں آدھے گھنٹے سے اسے رگڑ رہا ہوں مگر یہ اتنا کالا ہے کہ صاف ہی نہیں ہوتا۔
ٹامی! اگر تمھاری ایک جیب میں دس روپے ہوں اور دوسری میں پانچ روپے تو بتاؤ تمہارے پاس کیا ہے؟
مس! اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے کسی اور کی پتلون پہن لی ہے

اس میں وٹامن بہت ہے
مُنّے! کھانا کیسا لگا!
کیونکہ یہ انتہائی بدمزہ ہے!
میری امی کہتی ہیں کہ میں بہت ذمہ دار ہوں
جی ہاں! امی گھر میں ہر گڑبڑ کا ذمہ دار انہی کو ٹھہراتی ہیں۔

ہمارا پبلک اسکول

شہزاد کامران ـــــ حیات آباد

ہمارے اسکول کا نام پبلک اسکول ہے۔ اور شاید یہ پبلک کے بچوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیسی ہماری پبلک ہے ویسا ہی یہ اسکول ہے۔ آئیے ہمارے اسکول کے ایک دن کی رُوداد سُنیے۔ اس وقت صبح کے سات بجے ہیں اور اسکول جانے والے بچوں کے چہروں پہ بارہ۔ اُن کی پُشت پہ کوہان سا اُبھرا ہوا ہے۔ جسے عام طور پر بستہ کہا جاتا ہے۔ اس بستے میں کتابیں ہیں۔ اور بیشتر بچوں کو نہیں معلوم کہ ان کتابوں میں کیا ہے؟ کیونکہ وہ اُسے پڑھتے ہی کب ہیں۔ یکایک "چق چوں، چق چوں، چق چوں" کی عجیب وغریب آواز آپ کو سنائی دے گی، آپ پیچھے مُڑیں گے تو آپ کو ایک چھکڑا سائیکل نظر آئے گی جس پر موٹا سا چشمہ لگائے ایک صاحب جارہے ہوں گے۔ اگر آپ اُن کو سلام کرنے کی غلطی کر بیٹھیں تو وہ یا تو جواب نہیں دیں گے یا پھر صرف سر ہلا دیں گے جس کا مطلب ہوگا "وعلیکم السلام!" یہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں اگر یہی صاحب باآوازِ بلند سلام کا جواب دیتے تو پھر یہ اسلامیات کے اُستاد ہوتے۔ اگر جواباً مسکرا دیتے تو اُردو کے، اگر جواب میں کرخت سی "ہوں" کی آواز نکال دیتے تو ریاضی کے اور اگر سر جھکا کے زمین کو گھورتے ہوئے نکل جاتے تو جغرافیہ کے اُستادِ محترم ہوتے۔

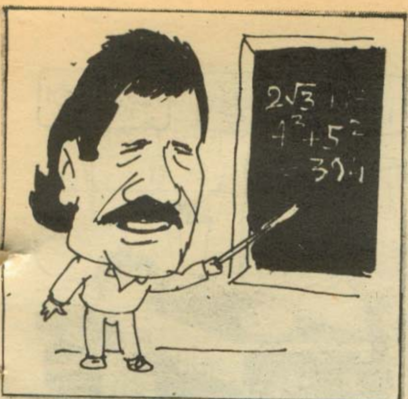

فرض کریجیے کہ آپ نے دو ماہ سے بال نہیں کٹوائے ہیں اور بستہ اُٹھائے اسکول چلے جارہے ہیں، یکایک کوئی پیچھے سے آپ پر حملہ آور ہو جائے گا۔ اور مُٹھی میں آپ کے بالوں کو جکڑ لے گا اور کھینچے گا۔ "ٹھہرو، تمھارے بال بڑے ہیں"۔ یہ مانیٹر صاحب ہیں جو طالب علموں کے بڑھے ہوئے بالوں کو چیک کرتے ہیں۔ اور اس طرح چیک کرتے ہیں جیسے ہٹلر کی فوج کے کمانڈر ہوں۔

آپ اسکول پہنچ چکے ہیں اور اب گھنٹی بھی بج چکی ہے۔ آپ کو نیند آجاتی ہے اور چاروں پیریڈ میں سوتے رہتے ہیں۔ جب اُٹھتے ہیں تو بریک ہو چکی ہے۔ آپ کینٹین کی طرف بڑھتے ہیں، لیکن یہاں تو اتنی بھیڑ ہے جیسے کسی دکان پر سیل لگی ہو۔ آپ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر خوش قسمتی سے برگر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن منہ میں ڈالتے ہی واپس اُلٹ دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ برگر نپولین نے فتح حاصل کرنے کے بعد کھانے تھے، لیکن

شکست کی وجہ سے نہ کھا سکا اس لیے اسکول میں سستے داموں سپلائی کر دیے گئے ہوں۔ خیر بریک ختم ہو چکی ہے، آپ کلاس میں جاتے ہیں تو کینٹین کی دھماچوکڑی سے تھکن محسوس ہوتی ہے اور آپ گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی اُستاد اُٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کیونکہ کبھی ایک سویا ہُوا آدمی دوسرے سوئے ہوئے کو اُٹھا تو نہیں سکتا۔ خیر چُھٹّی کی گھنٹی پوری کلاس کو جگاتی ہے اور آپ کلاس سے نکل پڑتے ہیں۔ ہر طرف شور و غل اور دھکّے بازی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ استاد بھی جماہیاں لیتے ہوئے سائیکلیں سنبھالتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے جنگی قیدیوں کو پندرہ سال بعد رہا کیا ہو۔ آپ اسکول سے باہر پہنچ کر اپنے جسم کے حِصّوں کو ضرور چھُوتے ہیں۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ کوئی حِصّہ اندر رش میں رہ نہ گیا ہو۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد آپ اسکول کی بَس کی طرف بڑھتے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد بس روانہ ہوتی ہے اور اتنی دیر میں خوش قسمتی سے آپ کو ایک لڑکے کے کندھے پر جگہ مل گئی ہے جو خود بھی بس سے باہر لٹک رہا ہے۔ آپ اس ہولناک سفر کا اختتام گھر کے سامنے کرتے ہیں اور لڑکے کے کندھے سے چھلانگ مار کر گھر کی راہ لیتے ہیں، اگلے دن دوبارہ اسی طرح اسکول جانے کے لیے!

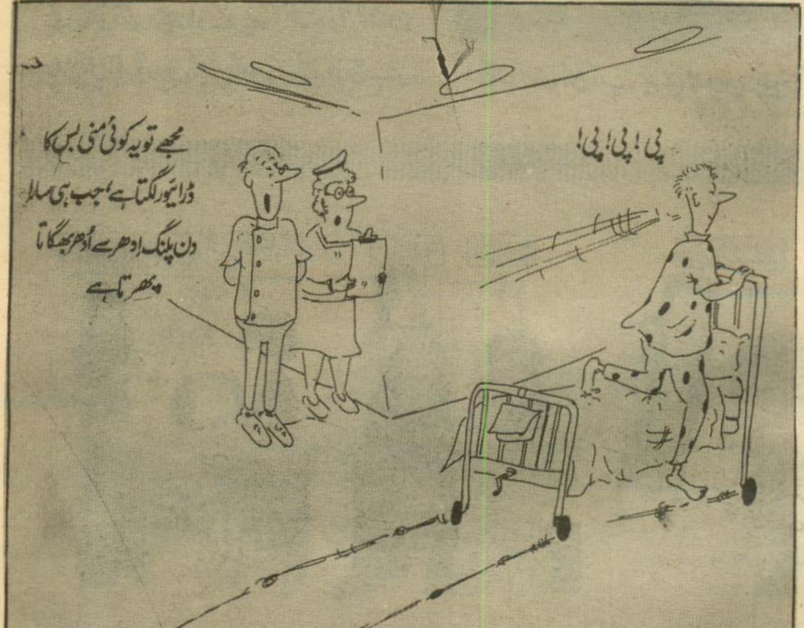

نتیجہ انعامی

مقابلہ کیپشن:

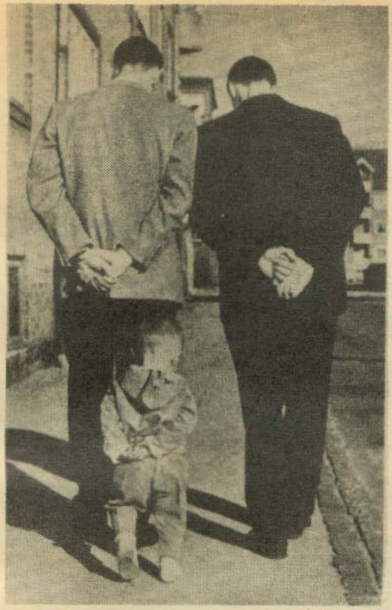

"دیکھتا ہوں آج آپ میری ٹافیاں کیسے بھولتے ہیں۔"

ادارہ "آنکھ مچولی" نے فروری کے شمارے میں اپنے قارئین کے درمیان ایک مقابلہ کیپشن کرایا تھا۔ اس مقابلے کے لیے، ہمیں بے شمار کیپشن موصول ہوئے۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق سکھر کے اعظم عقیل فاروقی کا بھیجا ہوا کیپشن انعام کا مستحق قرار پایا ہے۔ اعظم عقیل فاروقی کو مبارک باد کے ساتھ آئندہ چھ ماہ کے لیے "آنکھ مچولی" مفت جاری کیا جا رہا ہے۔ کیپشن تصویر کے نیچے درج ہے۔

جگہ تھوڑی ہونے کی بنا پر یہ جواب صہ ۲۱۳ پر دیا جا رہا ہے۔

ایک مقدّس شام

الف۔شین۔خان

یہ تاج محل ہوٹل کا خوبصورت اور پُرشکوہ تاجی ہال ہے۔لوگ جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ طلبہ وطالبات بھی جوش و جذبے اور عزم سے چمکتے چہروں کے ساتھ اپنے اساتذہ کرام کی معیّت میں ہال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔معزز مہمانانِ گرامی بھی آچکے ہیں اور سب لوگ مہمانِ خصوصی کی آمد کے منتظر ہیں۔ یہ لیجیے مہمان خصوصی تشریف لے آئے۔ بہت سے لوگ ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور وہ میزبان کی رہنمائی

اوپر طلبہ وطالبات تقریر کر رہے ہیں نیچے پنجابی سوداگر ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے عہدیداران خوش بخت شجاعت، محمود غزنوی اور سلیم مغل اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔

خوش بخت شجاعت، محمود غزنوی اور طاہر مسعود نتیجہ مرتب کر رہے ہیں

میں اسٹیج پر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے۔ یہ مہمان خصوصی ہیں، ناظم تعلیمات کراچی ریجن جناب عبدالمعید فاروقی۔ صدرِ محفل ہیں، رکن قومی اسمبلی عبدالخالق اللہ والا۔ ان کے ساتھ "آنکھ مچولی" کے مدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ صاحب، جمعیت پنجابی سوداگرانِ دہلی کے نائب صدر انیس الرحمٰن کالیا صاحب، "آنکھ مچولی" کے مدیرِ مسئول تجمل حسین چشتی صاحب اور پنجابی سوداگر ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے عہدیداران تشریف فرما ہیں۔ اس پروگرام کے لیے تعاون بھی پنجابی سوداگر ایجوکیشنل فاؤنڈیشن نے کیا ہے۔

مہمانِ خصوصی کے اپنی نشست پر تشریف رکھنے کے بعد حاضرینِ محفل بھی اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔ اس کے فوراً بعد آنکھ مچولی کے مشیرِ ادارت سلیم مغل نے کمپیئرنگ کے فرائض سنبھالتے ہوئے کہا: "آنکھ مچولی گشتی ٹرافی کے تحت پچھلے دنوں کراچی کے مختلف اسکولوں کے طلبہ و طالبات کے درمیان ایک ابتدائی تقریری مقابلۂ سیرت النبیؐ منعقد ہوا تھا۔ اس میں منتخب ہونے والے طلبہ و طالبات میں آج حتمی مقابلہ ہو رہا ہے۔ کامیاب ہونے والی ٹیم کے اسکول کو گشتی ٹرافی اور باقی شرکائے مقابلہ کو انعامات اور اسناد دی جائیں گی۔" اس کے بعد انھوں نے تلاوتِ کلامِ پاک کے لیے محمد سرمد یوسف کا نام پکارا۔ یوں پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

منصفین کے فرائض انجام دینے کے لیے خوش بخت شجاعت، محمود غزنوی اور طاہر مسعود مدیرِ اعزازی آنکھ مچولی سے اپنی نشستوں پر تشریف رکھنے کی درخواست کی گئی۔ اس مرحلے کے بعد کمپیئر نے مہمان مقرر اور ممتاز عالمِ دین مولانا تنویر الحق تھانوی کو دعوتِ خطاب دی تاکہ نو عمر مقررین ان کی تقریر کی روشنی میں فنِ خطابت کے رموز و اوقاف سے واقف ہو سکیں۔ مولانا صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اپنے ساتھی اور کرم فرما ظفر محمود شیخ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ جنھوں نے اس خالص علمی اور اسلامی محفل میں مجھے یاد

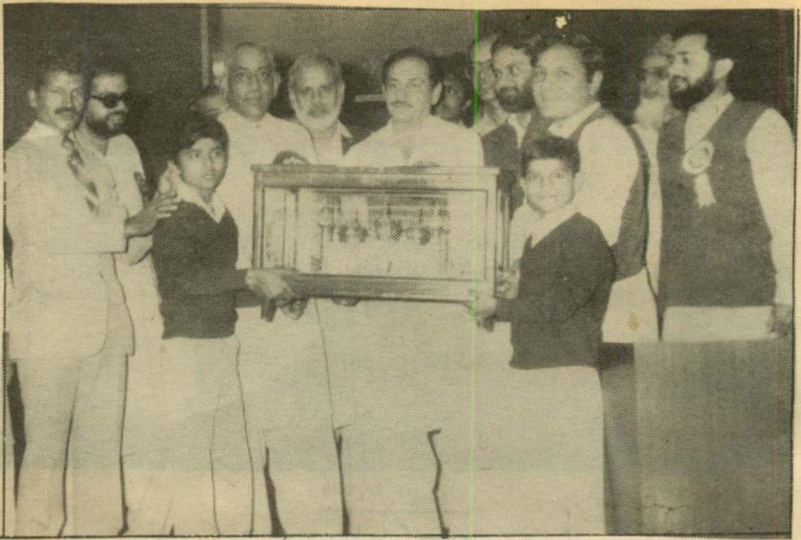

آنکھ مچولی گشتی ٹرافی حاصل کرنے والے اسکول کے طلبہ کا مہمانِ خصوصی اور مہمانانِ گرامی کے ساتھ گروپ

فرمایا اور دعوتِ خطاب دیا۔ انھوں نے طلبہ و طالبات سے کہا کہ آپ کے پاس کتابیں ہوں، لٹریچر ہو، مگر استادوں کا ادب نہ ہو تو علم تو حاصل ہو جائے گا، مگر اس سے خلقِ خدا کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ایسے علم میں خیر و برکت نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ حضورِ اکرمؐ دنیا میں تشریف لائے، علم بھی عطا فرمایا اور عمل کا جذبہ بھی۔ اس لیے اخلاق اور سیرت و کردار کا جوہر اگر ہمارے پاس نہ ہو تو حضورؐ کے دنیا میں آنے کا جو مقصد تھا وہ ہم پورا نہ کر سکیں گے۔

نیشنل گرامر اسکول کی عظمٰی زاہد نے سرورِ کونینؐ کے حضور ہدیۂ نعت پیش کیا۔ اور اس کے بعد تقریری مقابلے کا آغاز ہُوا۔ سب سے پہلے دہلی گرلز اسکول، فیڈرل بی ایریا کی شازیہ فاروق اور زمرّد بانو نے حضورؐ کی سیرت پر جوشیلی تقریر کی۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے انوار العلوم گرلز سیکنڈری اسکول کی صولت عزیز اور نازیہ انیس، گورنمنٹ کمپری ہینسو ہائی اسکول برائے طالبات کی شازیہ محمّد اور فریحہ بخاری، ڈی ایم ایس بوائز سیکنڈری اسکول کے سیّد اکبر حسین اور طارق محمود، گلستانِ شاہ عبداللطیف اسکول (صبح) کے فرحان حسن اور سعید اے خان اور سلطان محمّد شاہ آغا خان بوائز اسکول، کریم آباد کے عرفان فتح علی اور سہیل صدرالدّین نے سیرتِ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تقریریں کیں۔

تقریری مقابلے کے اختتام کے بعد کمپیئر نے ماہنامہ آنکھ مچولی کے مدیرِ اعلیٰ اور ضمیر الدّین میموریل آرگنائزیشن

حاضرین محفل کا ایک منظر

کے سینئر وائس چیئرمین ظفر محمود شیخ صاحب کو آنکھ مچولی گشتی ٹرافی کے تعارف کی دعوت دی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آنکھ مچولی گشتی ٹرافی کا بنیادی مقصد اسکولوں کے طلبہ وطالبات کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حوصلہ افزائی اور ان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ طلبہ وطالبات کی تربیت اسلامی خطوط پر ہو۔ اسی مقصد کے لیے ہم نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ اہتمام ایک ادارہ گرین گائیڈ اکیڈمی قائم کیا ہے۔ جس کے تحت اب تک ہم تین اسلامی اور معلوماتی کتابیں راہ نما، سفرِ مبارک، اور تعلیم الاسلام اور بچوں کے لیے اصلاحی کہانیوں پر مشتمل "حق اسکواڈ" شائع کر چکے ہیں اس سلسلے کا سب سے اہم اقدام ماہنامہ "آنکھ مچولی" کا اجرا ہے۔ اس کے علاوہ نظر زیدی صاحب کی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب "سب سے بڑا انسان" زیرِ طباعت ہے۔

اس کے بعد صدرِ محفل عبدالخالق اللہ والا جو پنجابی سوداگر ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے چیئرمین بھی ہیں، ڈائس پر آئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فاؤنڈیشن کی تعلیمی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور مہمانِ خصوصی "ناظم تعلیمات" سے درخواست کی کہ جمعیت پنجابی سوداگران کے تعلیمی ادارے واپس انھی اداروں کے حوالے کیے جائیں، جس طرح اس سے پہلے مختلف سماجی اور ادبی تنظیموں کو یہ اسکول واپس کیے جا چکے ہیں۔ تاکہ وہ بہتر انداز میں انھیں چلا سکیں۔

کمپیئر نے طلبہ وطالبات کو فنِ خطابت سے مزید متعارف کرانے کے لیے اپنے وقت کے بہت اچھے اور شعلہ بیان مقررین خوش بخت شجاعت اور محمود غزنوی کو خطاب کی دعوت دی۔ محمود غزنوی نے اپنی

تقریر میں کہا کہ جتنی ضرورت آج ہمیں حضورؐ کی تعلیمات کی ہے، شاید اس سے پہلے کبھی اتنی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ ہم نے اُن کی تعلیمات کو بُھلا دیا ہے، اسی لیے ہم تباہی و بربادی سے دوچار ہیں۔۔۔اگر ہم اُن کی تعلیمات کو پھر سے اپنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنا کھویا ہُوا مقام دوبارہ حاصل کرلیں۔ خوش بخت شجاعت نے کہا کہ جب مجھے کسی تعلیمی ادارے کی طرف سے بُلایا جاتا ہے تو مجھے فخر محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے، جیسے مجھے میرے میکے سے بُلایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو بھی شخص علم حاصل کرے، اُسے اپنے تک محدود نہ رکھے، بلکہ آگے بڑھائے تاکہ چراغ سے چراغ روشن ہوتے چلے جائیں۔

آخر میں مہمانِ خصوصی عبدالمعید فاروقی کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ آج کا بچّہ، کل کے بچّے سے زیادہ ذہین اور باشعور ہے۔ کیونکہ اس نے ٹی وی، وی سی آر اور کمپیوٹر کے دور میں آنکھ کھولی ہے۔ جب ہم بچّے تھے تو ہمارے لیے اس چیز میں ہی حیرت اور مسرّت تھی کہ ریڈیو کو چھُو کر اور بجا کر دیکھیں۔ مگر آج کا بچّہ ریموٹ کنٹرول کی مدد سے بیٹھے بیٹھے ٹی وی اور وی سی آر کھولتا اور بند کرتا ہے۔ انھوں نے اسکولوں کو سماجی و فلاحی اداروں کو واپس کرنے کا مطالبہ اصولی طور پر تسلیم کیا اور اپنی جانب سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

اس دوران میں منصفین نے نتیجہ مرتّب کر لیا۔ پہلے ابتدائی مقابلے کے تمام شرکاء کو کپ، اسناد اور تحائف دیے گئے۔ جن میں سیّد عبدالماجد اور عظمیٰ زاہد کو خصوصی انعام دیا گیا۔ اس کے بعد زمرّد یاتو صولت عزیز، نازیہ انیس، شازیہ محمّد، فریحہ بخاری، سید اکبر حسین، فرحان حسن، سعید اے خان، سہیل صلاح الدین اور دیگر مقرّرین کو بھی انعامات و اسناد دی گئیں۔ ان کے بعد پوزیشن حاصل کرنے والوں کا نمبر آیا۔ جس کے مطابق پہلا انعام سلطان محمد شاہ آغا خان اسکول کے عرفان فتح علی نے، دوسرا انعام ڈی ایم ایس بوائز سیکنڈری اسکول کے طارق محمود نے اور تیسرا انعام دہلی گرلز اسکول کی شازیہ فاروق نے حاصل کیا۔ آنکھ مچولی گشتی ٹرافی بھی سلطان محمّد شاہ آغا خان اسکول کو ملی۔

آخر میں تمام حاضرینِ محفل کو تحائف دیے گئے اور لذّتِ کام و دہن کا سلسلہ شروع ہُوا۔

طلبہ و طالبات اور شرکائے محفل کے لیے جن اداروں نے تحائف بھیجے، اُن کے نام یہ ہیں۔

انگلش بسکٹ — فینسی کاپی ہاؤس — انفورڈ لمیٹڈ پاکستان — ایشین فوڈ انڈسٹریز — مرینہ انڈسٹریز — نیپال چائے — ایگل پین — شاہ سنز — گولڈ فش پنسل — احمد فوڈ انڈسٹریز احمد کراچی حلوہ مرچنٹ — ضمیرالدّین میموریل آرگنائزیشن

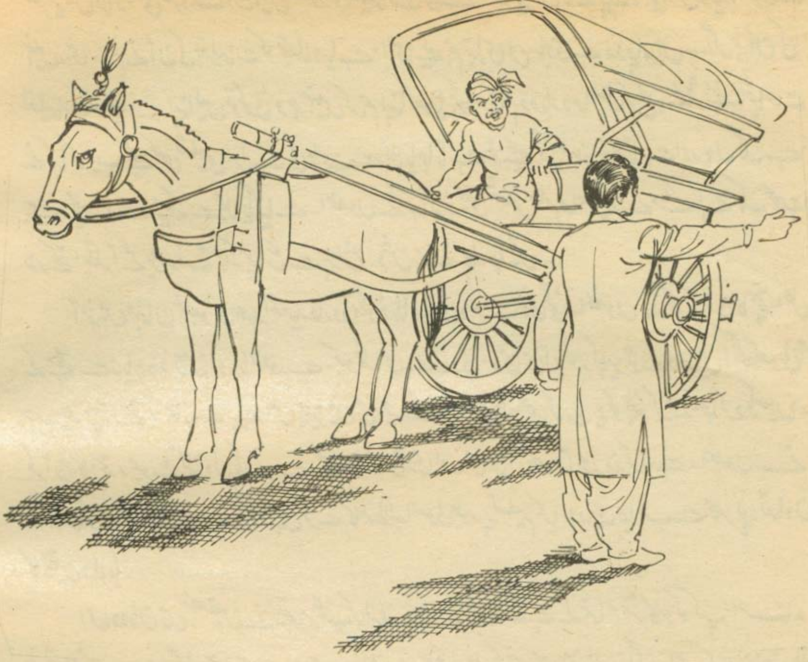

بلاعنوان

محمد سلیم خان

ایک شخص تھا۔ وہ تین فقروں کو باری باری بطورِ تکیۂ کلام استعمال کرتا تھا۔ وہ فقرے یہ تھے - کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں ؟ ناراض مت ہوئیے - آپ تو مذاق پر اُتر آئے -

ایک مرتبہ اُس شخص نے بگھی میں سفر کیا اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر کرایہ ادا کرکے اُتر گیا۔ کوچوان نے کہا کہ کرایہ تھوڑا ہے۔ یوُں جھگڑا شروع ہُوا -

"کرایہ پُورا دیجئے"۔ کوچوان بولا۔

"کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں ؟" اُن حضرت نے کہا۔

"سنجیدہ نہیں تو کیا مذاق کر رہا ہوں، دن بھر آپ کو لیے پھرا ہوں اور اب آپ آدھے کرائے پر ٹالنا چاہتے ہیں"

" ناراض مت ہوئیے۔"

" میں ناراض نہیں ہو رہا اپنا کرایہ مانگ رہا ہوں۔ پورا کرایہ۔ سمجھے آپ۔"

" آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

" میں مذاق وذاق کچھ نہیں جانتا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ براہِ کرم پورا کرایہ۔۔۔"

" کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

" اس میں کوئی شک نہیں ہے" (زور سے) "اگر دن بھر دھکے کھا کر بھی سنجیدہ نہیں ہوں گا تو کب ہوں گا؟"

" ناراض مت ہوئیے۔"

" میں ناراض نہیں ہوں یقین کیجئے، آپ صحیح نصف کرایہ دے رہے ہیں اتنا ہی کرایہ اور عنایت فرمائیے۔"

" آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔"

" یہ مذاق ہے؟ غضب خدا کا۔۔۔" (چلا کر) "پورا کرایہ مانگنا مذاق ہے۔ اپنی مزدوری مانگنا مذاق ہے؟"

" کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟"

" ہاں، سنجیدہ ہوں! بالکل سنجیدہ ہوں (چنگھاڑ کر) سو فیصد سنجیدہ۔ میں کہتا ہوں آپ۔۔۔"

" ناراض مت ہوئیے۔"

" خدایا (دہاڑتے ہوئے) سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟ میں ہرگز ناراض نہیں ہوں۔ ناراض کون گدھا ہوتا ہے۔ فقط آپ اتنی ہی رقم اور دے دیجئے میں یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤں گا۔"

" آپ تو مذاق پر اُتر آئے۔" اُن صاحب نے کہا اور کوچوان اپنے بال نوچتا، قسمت کو کوستا ہُوا چلا گیا۔ (ماخوذ)

ایک احمق نے آٹے کی بوری خریدنے کے بعد ایک مزدور کے حوالے کر دی تاکہ وہ اُسے اُس کے گھر پہنچا دے مگر مزدور آٹے کی بوری اٹھا کر غائب ہو گیا۔ دوسرے دن جب اس احمق شخص نے مزدور کو سامنے سے آتا دیکھا تو اس نے خود کو اس مزدور سے چُھپانے کی کوشش کی اس سے پوچھا گیا کہ اس نے مزدور کو دیکھنے کے بعد اس سے اپنے آٹے کی بوری کے بارے میں دریافت کرنے کے بجائے اس سے چُھپنا کیوں چاہا؟ تو اس نے جواب دیا "مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنی مزدوری نہ مانگ بیٹھے۔" 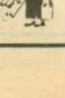 آپ بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ چلیئے پھر ص ۲۲۱ جلدی سے دیکھئے

انکل آئی کیو روبوٹ

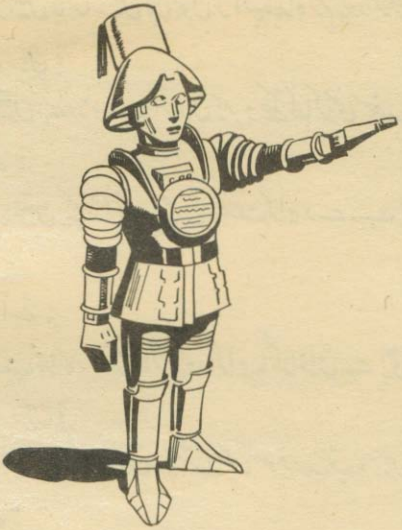

سوالاً جواباً

• انکل بیماریاں کیوں اور کیسے پھیلتی ہیں؟ (شاہد کامران صدیقی، کراچی)

ناقص غذا، صحت و صفائی کا فقدان۔ یہ دو بڑی وجوہات ہیں جو مختلف بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ ناقص غذا استعمال کرنے سے جسم کی قوتِ مدافعت کمزور ہو گی جو بیماری کا دعوت نامہ ہوتی ہے۔ جسم اور گھر اور محلوں میں صفائی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی بنا پر مکھی مچھر انسانی صحت کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات انہی وجوہات کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے وبائی امراض بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔

• "ریفلیکس ایکشن" سے کیا مراد ہے۔؟ (عباس فیروز، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

اس بات کو آپ ایک مثال سے یقیناً۔ سمجھ جائیں گے۔ اگر آپ کا ہاتھ جلتی ہوئی سگریٹ یا گرم توے

پر اچانک لگ جائے تو آپ کیا کریں گے۔ یقیناً سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے یہی ریفلیکس ایکشن ہے۔ ہمارے جسم کے ہر حصے میں ہونے والی تبدیلی سے ہمارا دماغ ہر وقت آگاہ رہتا ہے۔ اور اس صورت میں دماغ اپنے ان عضلات کو جو جسم میں پھیلے ہوئے ہیں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فوری احکامات جاری کرتا ہے اسی لئے اگر پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ہم سب سے پہلے بہت تیزی سے پاؤں اُوپر کھینچ لیتے ہیں۔

● وٹامن کیا ہیں اور یہ کتنے اقسام کے ہوتے ہیں؟ (حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی)

انسانی زندگی کے لئے چند اہم اجزا میں وٹامن یا حیاتین بھی شامل ہیں۔ یہ مختلف پھلوں، سبزیوں اناج حتٰی کہ سورج کی روشنی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ وٹامن ہڈیوں، دانتوں، کھالوں غرض پورے جسم کی مشینری کے لئے اہم ہوتے ہیں۔ کچھ وٹامن کے نام یہ ہیں۔ وٹامن اے، وٹامن بی، وٹامن سی، وٹامن ڈی، وٹامن ایچ اور وٹامن کے وغیرہ۔ وٹامن ڈی سورج کی روشنی سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

● نو بڑے سیاروں کے متعلق بتائیے؟ (سید جاوید حیدر شاہ، سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی)

ہماری زمین جس کہکشاں میں واقع ہے اس میں نو بڑے سیارے ہیں جو اپنے محور پر گھومتے ہوئے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ سورج سے سب سے قریب سیارہ عطارد ہے۔ اس کے بعد بالترتیب زہرہ، زمین مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو ہیں۔ ان میں زندگی کے آثار سوائے زمین کے کسی اور سیارے میں ابتک دریافت نہیں ہو سکے ہیں۔

● انکل یہ اڑن طشتریاں کیا واقعی وجود رکھتی ہیں؟ (فوزیہ اشرف، ساہیوال، طاہرہ رومی، ملتان کینٹ، مبشر علی زیدی، فیڈرل بی ایریا کراچی، پرنس وسیم بن اشرف، میاں چنوں)

سائنسدانوں نے طویل تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ دراصل بعض اوقات زہرہ سیارے کی روشنی یا کبھی خلا میں گردش کرتے ہوئے مختلف دھاتی اجسام ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو طشتری سے مشابہ ہوتی ہے۔ ویسے پہلی مرتبہ، جنوری ۱۹۴۸ء میں دن کے ایک بجکر پندرہ منٹ پر امریکہ کے شہر کینٹکی میں یہ اڑن طشتری نظر آئی پھر ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء میں ایک عورت اور اس کے پانچ بچوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ ویسے یہ اڑن طشتری مغربی یورپ، آسٹریلیا، روس میں بھی دیکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی اڑن طشتریوں کا مشاہدہ کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے جنہوں نے اسے دیکھ کر بعد میں مختلف سائنسی ٹیموں کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروا یا۔ اس زمانے میں اخبارات میں بھی اس کا بڑا چرچا رہا۔ تاہم اس سلسلے میں کسی مزید انکشاف کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

● دل کے دورے سے محفوظ رہنے کا کیا طریقہ ہے ؟ (محمد یوسف خان، لطیف آباد، حیدرآباد)

دل کا دورہ عموماً موٹے لوگوں کو پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کے جسم میں چربی اتنی بڑھ جاتی ہے جو شریانوں میں خون کے بہاؤ میں رکاوٹ بننے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خون دل تک نہیں پہنچ پاتا۔ چربی جسم میں جمع ہونے کی بڑی وجہ سستی، کاہلی، ورزش کا نہ کرنا اور مرغن غذاؤں کا استعمال ہے جس کی وجہ سے ہمارے جسم کی ضرورت سے زائد چربی جسم میں ذخیرہ ہونے لگتی ہے اور پھر ......!

● کیا یہ صحیح ہے کہ ۱۹۹۲ء تک مریخ کی مخلوق زمین پر حملہ آور ہوگی ؟

(محمود محمد اشرف، باتھ آئی لینڈ، کراچی)

آپ اتنے خوفزدہ نہ ہوں۔ جب مریخ پر زندگی کے آثار ہی نہیں ملے تو پھر کیسی مخلوق اور کہاں کا حملہ ؟ معلوم ہوتا ہے آپ "اسٹار وارز" ٹائپ کی فلمیں بہت دیکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی کے لئے آکسیجن اور پانی بنیادی ضروریات ہیں۔ جبکہ مریخ پر نہ تو آکسیجن ہے اور نہ ہی پانی۔ ایک انگریز ادیب ایچ۔جی۔ ویلز نے البتہ اپنے ایک ناول میں مریخی مخلوق کے زمین پر حملے کا ذکر کیا ہے۔ مگر بھائی ناولوں اور فلموں میں ساری باتیں حقیقت پر مبنی تو نہیں ہوتیں۔ ان میں تصوراتی چیزوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

● انکل امریکہ کا خلائی تحقیقاتی ادارہ "ناسا NASA" کس چیز کا مخفف ہے ؟ یہ کب قائم ہوا ؟ (طارق رحیم۔ ناظم آباد، کراچی)

اس کا مطلب ہے نیشنل ایروناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن۔ اور یہ ۱۹۵۸ء میں قائم کی گئی۔

● خالص ہیرے کی پہچان کیسے کی جاتی ہے ؟ (سلمان حیدر، ڈلمیا کراچی۔ محمد ظفر اللہ ضیاء، کمالیہ)

ہیرے کی پہچان کے لئے اسے تیزاب کے برتن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر ہیرا اصلی ہوگا تو اس کی چمک دمک بالکل ماند نہیں پڑے گی اور اگر نقلی ہوگا تو فوراً گل جائے گا۔

● انکل زمین واقعی گھومتی ہے یا نہیں ؟ (محمد الیاس بندھانی بھایا چاند گاڑی سکھر)

جی ہاں ! اپنے محور پر چوبیس گھنٹوں میں زمین ایک چکر پورا کرتی ہے جس میں دن اور رات بنتے ہیں۔ پھر اسی طرح اپنے محور پر گھومتے ہوئے ایک مدار میں سورج کے گرد تقریباً ۳۶۵ دنوں میں اپنا چکر پورا کرتی ہے جس میں موسم بدلتے ہیں، یعنی سردی، گرمی، خزاں اور بہار اپنے اپنے رنگ دکھاتے ہیں۔ اور صرف زمین ہی نہیں بلکہ ہماری کہکشاں کے باقی آٹھ سیارے بھی اپنے محور پر گھومتے ہوئے ایک خاص مدار میں سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔

امِ رباب جعفری

دائرۂ مُعلومات

شرکت کا طریقۂ کار:- ہر سوال کا جواب ذیل میں دیے گئے چار اشاروں کی مدد سے دینا ہوگا۔ آپ کی سہولت کے لیے ہم نے ہر سوال کا درست جواب دائرے میں ہی کہیں لکھ دیا ہے اور کچھ اضافی نام بھی ساتھ ہی لکھ دیے ہیں، جن کا سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مقابلے میں شرکت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دائرے میں موجود درست جواب پر نیلے بال پوائنٹ سے اس کا سوال نمبر ڈال دیجئے اور اصل دائرہ کاٹ کر ہمیں ارسال کر دیجیے۔ ساتھ ہی ایک جانب اپنا نام اور مکمّل پتہ ضرور لکھیے۔ ادارے کی سہولت کے لیے ایک سادہ کاغذ پر بھی ترتیب وار درست جوابات لکھ دیجیے، اس طرح ہمیں آپ کے جوابات کا درست حل سے موازنہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ جوابات وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ اپریل ہے۔ دائرے کے بغیر جواب قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔

سارے سوالات "قہقہہ نمبر" کے حوالے سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔

۱ اُردو کا مشہور مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" کس نے جاری کیا تھا؟

۲ اُردو کے کس مشہور مزاح نگار کا اصل نام محمّد عمر تھا؟

۳ "چلتے ہو تو چین کو چلیے" "آوارہ گرد کی ڈائری" "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" اور "دنیا گول ہے"۔

۴ اردو کے کس مشہور مزاح نگار کے سفر نامے ہیں؟

۵ شفیق الرحمٰن کے مشہور کردار "شیطان" کا اصل نام کیا ہے؟

۶ "شوخیٔ تحریر" اُردو کے کس مشہور مزاحیہ شاعر کا شاعری کا مجموعہ ہے؟

۷ ٹیلیویژن کے مشہور مزاحیہ پروگرام "الف نون" میں جو فنکار "ننھا" کا کردار ادا کیا کرتے تھے، ان کا اصل

نام کیا تھا ؟

۸ مشتاق احمد یوسفی کی پہلی تصنیف کا نام کیا تھا ؟

۹ "انگلیاں فگار اپنی" اردو کے کس مشہور مزاحیہ شاعر کا شعری مجموعہ ہے ؟

۱۰ ٹیلیویژن کا مشہور مزاحیہ کردار "حسنات بھائی" کس کی تخلیق ہے ؟

۱۱ ۱۹۷۷ء میں کرسمس کے دن، دنیائے فلم کے کس مشہور مزاحیہ اداکار کا انتقال ہوا تھا ؟

۱۲ مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے "دوزخی" کے نام سے اپنے ایک بھائی کا خاکہ لکھا تھا جو خود بھی ایک مشہور افسانہ نگار تھے ان کا اصل نام بتا دیجئے ؟

۱۳ اردو کے اس مشہور مزاح نگار کا نام بتائیے، جن کا انتقال نیویارک میں ہوا تھا ؟

۱۴ اردو کے کس مشہور مزاح نگار کے کالموں کا مجموعہ "خندِ مکرّر" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا ؟

۱۵ "لافنگ گیلری" پاکستان کے کس مشہور کارٹونسٹ کے کارٹون کا مجموعہ ہے ؟

۱۶ کراچی سے مزاحیہ اخبار "نمک دان" کس مزاح نگار نے جاری کیا تھا ؟

۱۷ کرنل محمدّ خان کی اس کتاب کا نام بتائیے جو دراصل ان کا سفرنامہ ہے ؟

۱۸ "چچا چھکّن" اردو کے کس مشہور مزاح نگار کا کردار ہے ؟

۱۹ اردو کے مشہور مزاحیہ شاعر اکبر الہ آبادی کا انتقال کس سن میں ہوا تھا ؟

۲۰ خوجی رتن ناتھ سرشار کا مشہور کردار ہے۔ کیا آپ اس کردار کا اصل نام بتا سکتے ہیں ؟

۲۱ بتائیے یہ شعر کس کا ہے ؟

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

دائرہ معلومات فروری ۱۹۸۸ء کا درست حل

(۱) حضرت شعیبؑ (۲) حضرت ابو ذر غفاریؓ (۳) ابنِ خلدون (۴) قطب الدین ایبک

(۵) خواجہ ناظم الدین (۶) ڈاکٹر محمود حسین (۷) کراچی (۸) عبدالرحیم سوئیکارنو

(۹) لبنان (۱۰) نیویارک (۱۱) چواین لائی (۱۲) افلاطون

(۱۳) جون آف آرک (۱۴) الزہرا وی (۱۵) ایڈورڈ جینز (۱۶) جہانگیر خان

(۱۷) دوستو وسکی (۱۸) فیض احمد فیض (۱۹) وارث شاہ (۲۰) رہمبراں

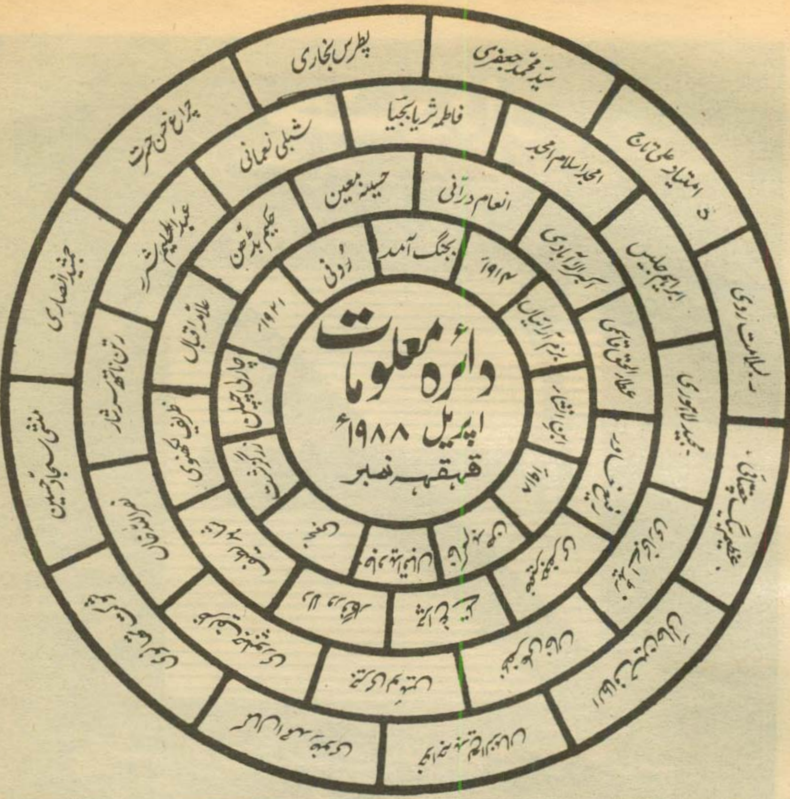

(۳) خوش نصیب ساتھی جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حقدار قرار پائے

- حامد علی شاہد ——— لاوہ، چکوال
- انیلا تسلیم احمد ——— ملتان
- عاصم عبدالحمید بٹ ——— گلشن اقبال کراچی

درست جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھیوں کے نام

، محمد کامل، شاہی بازار، ٹنڈوالہ یار ، تجمل الیاس، سمن آباد، لاہور ، محمد موسیٰ سومرو، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ

، سید جاوید حیدر شاہ، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی ، آصف کریم، شاہی بازار، حیدرآباد ، سعدیہ یاسمین، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

خبردار

تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے

وزارتِ صحت۔ حکومت پاکستان

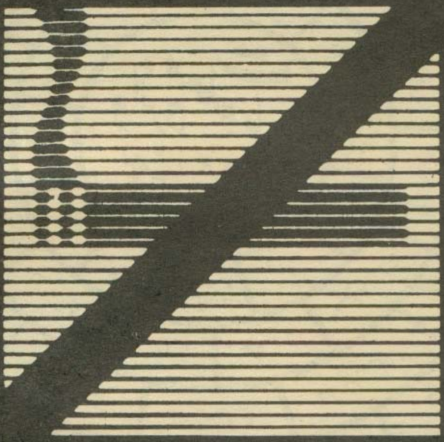

یہ اشتہار صرف سگریٹ پینے والوں کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ سگریٹ نہ پینے والوں کے لئے بھی پیشگی ہدایت ہے کہ وہ اِس خطرے سے دُور رہیں جس کا انجام بیماری اور بربادی کے سِوا کچھ بھی نہیں۔ یاد رکھیئے سِگریٹ کا دھواں بھی سِگریٹ نوشی کی طرح مضر ہے۔

اپنی صحت کا خیال رکھیئے

سِگریٹ نوشی سے خود بچیئے۔ دوسروں کو بچایئے!

ماہنامہ آنکھ مچولی سگریٹ کے اشتہار شائع نہیں کرتا۔ مشتہرین زحمت نہ کریں (ادارہ)

، پشکلائی پردھانی، نواں کوٹ ، خرم عبدالحمید بٹ، گلشن اقبال کراچی ، محمد انور میمن، شاہ پور چاکر، سانگھڑ
، سحر ناز، چوہنگ، لاہور ، جاوید اقبال ناز، اقبال نگر، فیصل آباد ، شفیق الرحمٰن، حالی نگر، حیدرآباد
، محمد انظر بلال، لاوہ، چکوال ، محمد آصف انظر، لاوہ، چکوال ، سمیعہ اقبال، لاوہ، چکوال
، ماریہ ناظم، گلبرگ، کراچی ، ناصر احسن خان، کارساز، کراچی ، محمد نصیر، مصریال روڈ، راولپنڈی
، ذیشان حیدر، سوسائٹی، کراچی ، ماجد محمود، یکہ توت، پشاور ، نعمت اللہ سومرو، قادر بخش ساند
، ظفر اقبال سومرو، قادر بخش ساند ، نعیم احمد ابدالی، رانگیواڑہ، کراچی ، معراج سعادت، لطیف آباد، حیدرآباد
، نازش گلزار علی، اگارڈن ویسٹ کراچی ، محمد افراہیم شیخ، ٹنڈو آدم ، انیقہ صدف، شاہی بازار، حیدرآباد
، محمد سلیمان میمن، گلبہار کراچی ، ارشاد محمد شیخ، حیدرآباد ، حسن مہدی خراسانی، انچولی، کراچی
، محمد عمران قادر، ٹنڈو آدم ، کامران خالد، بڑابورڈ، کراچی ، عرفان خالد، ریحان خالد، کراچی

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

، شارق شمیم، آگرہ تاج کالونی کراچی ، روبینہ احمد، لیاقت آباد، کراچی ، عطیہ رحمٰن، ہیرآباد، حیدرآباد
، شہنشاہ بابرخان، بہاولنگر ، الیاس فاروق، ملیر، کراچی ، محمد سعد فیصل، رحیم یارخان
، محمد زبیر، مسلم ٹاؤن، لاہور ، ناصر یوسف، آدمجی نگر، کراچی ، عادل مجید سونی، دھوراجی، کراچی
، عائشہ نور، نبی پورہ، لاہور ، عبدالمتین، الیف بی ایریا، کراچی ، ندیم میمن، فقیر کاپڑ، حیدرآباد
، انجم شہزادہ، میرپور، آزاد کشمیر ، حاجی ابراہیم کھتری، لی مارکیٹ، کراچی ، غلام حسین میمن، کھائی روڈ، حیدرآباد
، وردہ ظفر، عام ظفر، کراچی ، سیدہ تصویر زہرہ، راولپنڈی ، رخسانہ حبیب، موسیٰ لین، کراچی

امریکہ میں ہر روز

- ہر روز بیس ہزار افراد صدر کو خط لکھتے ہیں۔
- ہر روز گیارہ ہزار افراد کو کتے کاٹتے ہیں۔
- ہر روز امریکن سولہ کروڑ ستر لاکھ انڈے کھاتے ہیں۔ تیس لاکھ گیلن آئس کریم کھاتے ہیں اور ایک کروڑ ستر لاکھ میل جوگنگ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ عامر اعجاز ـــ گجرات

جواب :۔ فرق بتائیں!

فرق بتائیں کا درست جواب یہ ہے کہ دونوں تصویروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیسی رہی؟

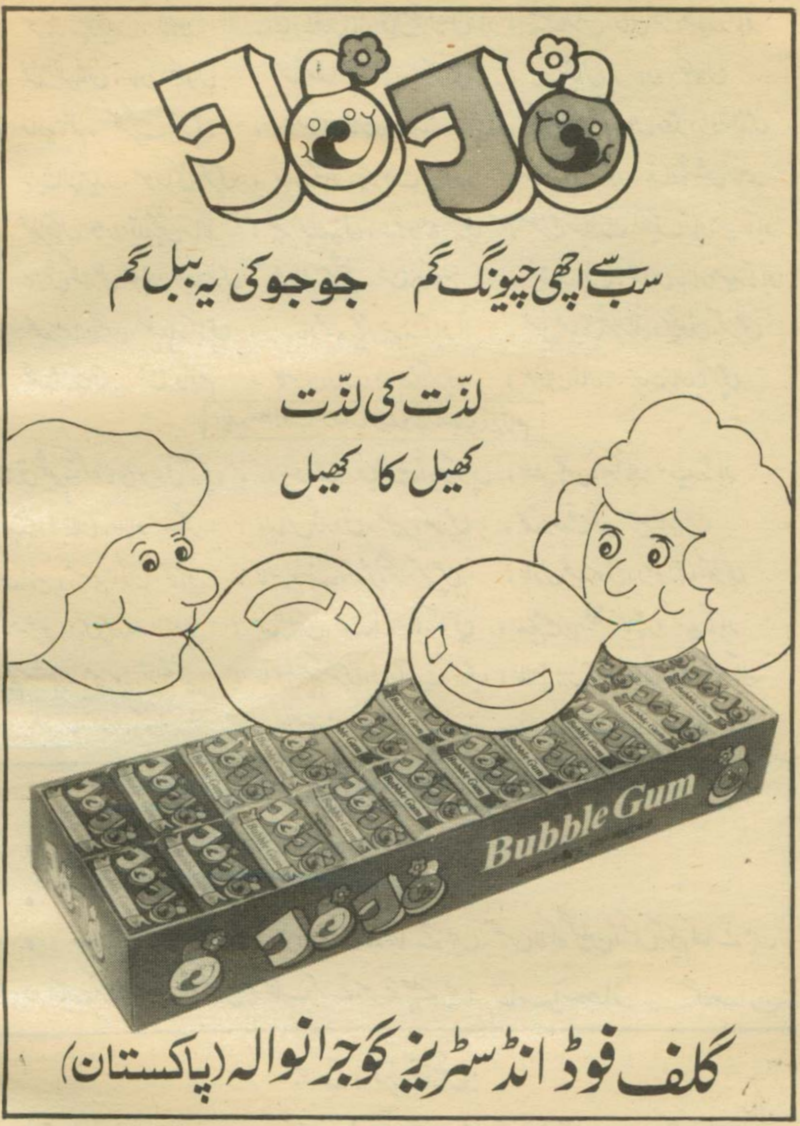
سب سے اچھی چیونگ گم جوجو کی یہ ببل گم
لذّت کی لذّت
کھیل کا کھیل
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

آؤ ملائیں ہاتھ

عبدالمجید یوسف زئی، ۱۴ سال
جماعت دہم، ٹکٹیں جمع کرنا
سندھی، ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں
وجہ، ملک و قوم کی خدمت
معرفت عبدالمجید کراکری مرچنٹ۔ ایم۔ اے جناح روڈ سانگھڑ

مطیع الرحمٰن، ۱۵ سال
جماعت دہم، ٹکٹیں جمع کرنا
مضمون۔ ریاضی، فوجی افسر
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ ملک کی خدمت
محمدی کلاتھ ہاؤس الصدر بازار۔ خانپور ضلع رحیم یار خان

محمد اختر عباس، ۱۵ سال
جماعت نہم، آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون۔ انگلش، فوجی بننا
چاہتے ہیں، وجہ۔ ملک کی خدمت
معرفت محمد اقبال عباس، پوسٹ آفس رلوتی تحصیل اباڑو۔ سکھر

شکیل احمد، ۱۵ سال
جماعت نہم، دینی معلومات جمع
کرنا، مضمون۔ ریاضی، فوجی
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ والدین کی خواہش ہے
مکان نمبر ۱۵۳ پی/ سے گلی نمبر ۱۳۔ محلہ چباں، فیصل آباد

شفیق الدین، ۱۵ سال
جماعت نہم، کتابیں پڑھنا
مضمون۔ سائنس۔ فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوقِ شہادت

تمیز خان، ۱۸ سال
جماعت فرسٹ ایر، قلمی دوستی
مضمون، کیمسٹری، ٹیچر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ دوسروں تک علم پہنچانا
معرفت لاڑکانہ کلینک کوئٹہ روڈ۔ جھٹ پٹ نصیر آباد، بلوچستان

ارشاد احمد فخر ۱۵ سال
جماعت دہم، باڈی بلڈنگ
مضمون، حساب، ایس پی
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ قوم کی خدمت
جہانگیر انجینئرنگ کمپنی گوندلانوالہ روڈ۔ گوجرانوالہ

محمد سہیل یونس، ۱۵ سال
جماعت نہم، ٹکٹیں جمع کرنا
مضمون۔ اسلامیات،
آرکیٹیکٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ یہ شعبہ پسند ہے۔
معرفت محمد یونس ڈرافٹسمین، گلی نمبر ۴، مسلم کالونی، ملتان

فدا حسین ملک، ۱۵ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون۔ بائیالوجی، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں، وجہ۔ غریب انسانیت کی مدد
گورنمنٹ ہائی اسکول رحمانی نگر۔ سندھ

نصرت صنم، ۱۵ سال
جماعت ہشتم، مطالعہ
مضمون، سائنس، جنگی پائلٹ
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ شوق ہے۔
شیریں جناح کالونی نمبر ۳۔ کلفٹن۔ کراچی

عبدالقدیر، ۱۶ سال
جماعت نہم، ماچسٹ اور سکے جمع
کرنا، مضمون۔ ڈرائنگ، فوجی
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ پاکستان کی خدمت
گلی نمبر ۱۹، محلہ چباں۔ ضلع فیصل آباد

عاصم جمال، ۱۴ سال
جماعت دہم، مصوری
مضمون۔ فزکس، پائلٹ بننا
چاہتے ہیں، وجہ۔ ملک کی خدمت
۸/۱۴۰۔ پیپلز ٹاؤن۔ ڈرگ کالونی نمبر ۳۔ کراچی ۲۵

رضوان بشیر، ۱۴ سال
جماعت نہم، مطالعہ کرنا
مضمون۔ اردو، پائلٹ بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک و قوم کی خدمت
۱/۸۸ سندھی لائنز۔ واہ کینٹ

شہباز احمد صدیقی، ۱۳ سال
جماعت ہفتم، ادبی کتب کا
مطالعہ، مضمون۔ اردو ادب
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ تاکہ لوگوں کے دکھ درد کو لفظوں کی
زبان دے سکیں، کوتاج کلاتھ ہاؤس، چوک بازار، ملتان

عبداللہ خان آفریدی، ۱۶ سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون۔ اسلامیات، پرنسپل
بننا چاہتے ہیں، وجہ۔ تعلیم کا شوق
۱۳۵/۳۔ ایف شاہ فیصل کالونی۔ بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی ۱۵

پرنس محمد سعید گلاب ۔ ۱۵ سال
جماعت نہم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون ۔ سائنس ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریب لوگوں کا مفت علاج
مکان نمبر ۱۹-۳-ایس ۔ گلی نمبر ۴ ۔ کورنگی نمبر ۱ ۔ کراچی ۳۱

عمران سلیم ۔ ۱۴ سال
جماعت ہشتم ۔ فٹبال کھیلنا
مضمون ۔ حساب ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
۱۲/۶ ۔ بی ون ایریا ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی ۔ ۱۹

عظمیٰ بخاری ۔ ۱۳ سال
جماعت ہشتم ۔ مطالعہ کرنا
مضمون ۔ حساب ۔ انگلش ۔ سائنس
ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں ۔ وجہ ۔ خدا کے بندوں کی خدمت
معرفت سید عاشق حسین ۔ صدیقی منزل ۔ منڈ والی گلی ۔ غریب آباد میرپور خاص

عارف جمال ۔ ۱۶ سال
جماعت دہم ۔ قلمی دوستی کرنا
مضمون ۔ انگلش ۔ ڈرامہ نگار
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوبزنس پسند ہے ۔
۱۶، ۱۷ ایل ۔ سیکٹر ۳ ۔ بی ۔ ۵۰ ۔ نئی آبادی ۔ نیو کراچی ۔ کراچی

سید محمد طارق شاہ ۔ ۱۴ سال
جماعت ہشتم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ۔ ریاضی ۔ انگلش
پائلٹ بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ راشد منہاس سے متاثر ہیں
جماعت ہشتم سی ۔ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول شبقدر فورٹ ضلع پشاور

جاوید احمد ۔ ۱۴ سال
جماعت دہم ۔ مطالعہ کرنا
مضمون ۔ اُردو ۔ انگریزی
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ قوم کی خدمت
جیتپور پلازہ ۔ فلیٹ نمبر ۶۸ ۔ کے سی ایچ سوسائٹی ۔ ۱ ۔ الامیر خرو روڈ کراچی

پرنس وسیم اے ۔ ۱۵ سال
جماعت نہم ۔ قلمی دوستی
مضمون ۔ تاریخ ۔ اُردو ۔ سیکرٹ
ایجنٹ بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک دشمن عناصر کا خاتمہ
میاں چنوں سپر اسٹور ۔ نزد ریلوے اسٹیشن میاں چنوں

مرزا غفار بیگ ۔ ۱۶ سال
جماعت دہم ۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون ۔ معاشیات ۔ نیوی
آفیسر بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت
اسرار بک ڈپو ۔ یوپی سوسائٹی ۔ مین بازار پلاٹ نمبر ۹۷/۴ سیکٹر الیون ناظم آباد کراچی

ایچ ایم اکرم سیال ۔ ۱۳ سال
جماعت ہفتم ۔ خدمت خلق
مضمون ۔ اُردو ۔ ملک کی خدمت
کرنا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ محبت اور پیار ہے ۔
رول نمبر ۱ ۔ گورنمنٹ مڈل اسکول وکیل والا ۔ ۵ بنگلانہ صاحب ۔ پنجاب

مولا بخش ۔ ۱۲ سال
جماعت نہم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ۔ انگریزی ۔ اُستاد
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریب لوگوں کو تعلیم دینا
ابراہیم گوٹھ ۔ کا ٹھور ۔ ۱۸۶۱ ۔ ملیر ۔ کراچی ۲۳

محمد آصف آرائیں ۔ ۸ سال
جماعت سوم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ۔ انگلش ۔ آرمی آفیسر
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ رتبہ شہادت ۔
۴۴۲/۱۹ ۔ پنجاب کالونی ۔ گزری روڈ ۔ کراچی ۶

عاصم رضا ۔ ۱۳ سال
جماعت ہشتم ۔ رسائل جمع کرنا
مضمون ۔ انگلش ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک کی خدمت ۔
اے ۔ ۵۳۶ ۔ الٰہ آباد ۔ ویسٹریج ۔ راولپنڈی

تسکین زہرا ۔ ۱۳ سال
جماعت نہم ۔ قلمی دوستی
مضمون انگلش ۔ ڈاکٹر بننا
چاہتی ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کے لیے کچھ کرنا
مکان نمبر ۳ ۔ گلی نمبر ۸ ۔ پاک نگر ۔ اکرم روڈ ۔ لاہور

محمد احمد ۔ ۱۲ سال
جماعت ہفتم ۔ ناول پڑھنا
مضمون ۔ ڈرائنگ ۔ آرٹسٹ
بننا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
معرفت چوہدری عبدالغفور گوہر ۔ ایڈمن آفیسر محکمہ انہار ۔ زون سرگودھا ۔ سرگودھا

کامران نیاز ۔ ۱۲ سال
جماعت ہشتم ۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون ۔ اُردو ۔ ملک کی
خدمت کرنا چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ شوق ہے ۔
۸/۶۶۱ عزیز آباد نمبر ۸ ۔ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی ۳۸

ملک جاوید اقبال ۔ ۱۴ سال
جماعت نہم ۔ مطالعہ کرنا ۔
مضمون ۔ فزکس ۔ کیپٹن بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ اپنے وطن کی حفاظت ۔
ڈھوک منگٹال ۔ بورنگ روڈ ۔ راولپنڈی

دلشاد احمد ۔ ۱۰ سال
جماعت ششم ۔ مطالعہ کرنا
مضمون اردو سرجن بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ غریبوں کی مدد ۔
جناح کالونی ۔ جی ٹی روڈ ۔ اوکاڑہ

محمد شکیل عالم ۔ ۱۴ ۔ سال
جماعت ہفتم ۔ کہانیاں پڑھنا
مضمون ۔ اُردو ۔ فوجی بننا
چاہتے ہیں ۔ وجہ ۔ ملک و قوم کی خدمت
۱۰ ۔ ۸ ۔ الف ۔ ملیر کالونی ۔ کھوکھرا پار نمبر ۱ ۔ کراچی نمبر ۳۷

احمد عدیل - ۱۰ سال
جماعت چہارم۔ کتابیں پڑھنا
مضمون سائنس۔ پائلٹ بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ: پسند ہے۔
۴۰ - بہادر آباد - سڑک ۳ - کراچی - ۵

عائشہ خان - ۱۴ سال
جماعت نہم۔ پنسلیں جمع کرنا
مضمون: حساب۔ پروفیسر
بننا چاہتی ہیں۔ وجہ: پڑھانے کا شوق
محلہ مسلم گنج۔ گلی اقبال خان۔ طارق روڈ۔ شیخوپورہ

محمد وحید شامؔ ۱۵ سال
جماعت دہم۔ کہانیاں لکھنا
مضمون حساب۔ بینک آفیسر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: لوگوں کی خدمت
مکان نمبر ۲۶۰ - ایریا ۳۳ - سی - کورنگی ۱/۲ - کراچی

صاعقہ بانو - ۱۰ سال
جماعت: ششم۔ کہانیاں
لکھنا۔ مضمون: معاشرتی علوم۔ ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں۔
وجہ: غریبوں کا مفت علاج۔ مکان نمبر ۲۳۶/اے
سیکٹر بی ۱۴۔ شادمان ٹاؤن نمبر ۱ - نارتھ کراچی۔ کراچی

سہیل انجم سیٹھی - ۱۴ سال
جماعت ہشتم - پڑھنا۔ مضمون
اردو - ڈاکٹر بننا چاہتے
ہیں۔ وجہ: ملک و قوم کی خدمت
گلی نمبر ۲۰ - گلبہار کالونی - پشاور

ناجیہ ۹ سال
جماعت چہارم۔ کہانیاں
پڑھنا۔ مضمون: حساب، سائنسداں
بننا چاہتی ہیں۔ وجہ: ملک میں سائنسدانوں کی کمی۔ معرفت
شوکت علی خان سی/۱۸۸۔ بلاک ڈی۔ یونٹ نمبر ۳۔ لطیف آباد حیدرآباد

عنایت اللہ - ۱۴ سال
جماعت ہشتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون۔ عربی۔ فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی حفاظت
اے/۴۵ - سی ون ایریا - لیاقت آباد - کراچی

اسلم شاہ - ۱۵ سال
جماعت دہم۔ مطالعہ، قلمی
دوستی۔ مضمون - فزکس
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ غریبوں کی مدد
شمس آباد - بیراج روڈ - سکھر

قیصر عباس زیدی - ۱۰ سال
جماعت پنجم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون: حساب۔ ٹیچر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ - ملک میں تعلیم کا فقدان
مکان نمبر ۲/۱۰۹۶۔ انچولی سوسائٹی فیڈرل بی ایریا کراچی

عبداللہ - ۱۰ سال
جماعت پنجم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون: حساب۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ: تاکہ مفت علاج کر سکیں۔
ایم سی - ۲۸۶ - گرین ٹاؤن - کراچی - ۴۳

اویس عزیز - ۱۱ سال
جماعت پنجم۔ اچھی کتابیں
پڑھنا۔ مضمون: سارے
مضامین۔ محنتی اور اچھا انسان بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: سب اچھی
نظر سے دیکھتے ہیں۔ مکان ۳۲۹/۳ گلی نمبر ۳ ماڈل ٹاؤن B فوارہ چوک فیصل آباد

محمد جمشید - ۱۱ سال
جماعت ہفتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون: انگلش، پائلٹ
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ - ملک کی خدمت
۲۸۸/اے - کورنگی مارکیٹ نمبر ۶ - کراچی

سیف الہدیٰ - ۱۴ سال
جماعت ہشتم۔ فٹبال کھیلنا
مضمون: اردو - فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ: خدمت پاکستان
مکان نمبر ۱۴۲ بی خلد آباد۔ آفریدی کالونی۔ لانڈھی کراچی ۳۶

افتخار - ۱۰ سال
جماعت ششم ٹکٹ جمع کرنا۔
مضمون: سائنس۔ فوجی بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ: خواہش ہے
راسو ٹاور شمس الدین معرفت مولا بخش مٹھائی والا

سہیل محبوب - ۱۶ سال
جماعت میٹرک۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون: حساب۔ بینک آفیسر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: ماموں نے یہی کرنے کو کہا ہے۔
۱۵/۱۸۶۲ - دستگیر - فیڈرل بی ایریا - کراچی نمبر ۳۸

طاہر عزیز - ۱۴ سال
جماعت نہم - چیزیں بنانا
مضمون: حساب۔ بائیالوجی
پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: وطن کے لیے جان قربان کرنا چاہتے ہیں
معرفت عبدالعزیز کوارٹر نمبر ۳/۲۴۲ P.A.F - شارع فیصل۔ کراچی

مرزا افضل بیگ ۱۵ سال
جماعت ہشتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون۔ اسلامیات، انگلش
اچھا انسان بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: کیونکہ عہدے دنیاوی ہیں
مکان نمبر ۱۰۳ - بلاک ۷، ڈی - اسٹیل ٹاؤن - کراچی

سید سفیر حسین کاظمی - ۱۳ سال
جماعت نہم۔ کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ
جمع کرنا۔ مضمون: فزکس، حساب
پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ: ملک کی خدمت
سی - ۳۵/۹۴۱ - آر - کورنگی نمبر ۲/۱ ۳ - کراچی نمبر ۳۱

ننھے ہاتھ ننھی تحریریں

ڈم ڈم ڈی ڈی

محمد رضوان ـــــ کراچی

فازیہ، زوہیب اور اُن کے قبیلے کے دوسرے ڈسکو براند گلوکاروں کی شہرت اور عزت سے متاثر ہو کر ایک دن ہم نے بھی گلوکار بننے کا ارادہ کر لیا۔ سب نے ہمارا مذاق اُڑایا، لیکن ہم نے اُس مذاق کا مذاق اُڑاتے ہوئے گھر کے ایک ایک فرد کو یقین دلایا کہ ہم ایک نہ ایک دن آپ کے "بے سُرے پن" کے اس الزام کو غلط ثابت کر دکھائیں گے۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ اکیلے ہی گائیں گے، لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ آج کل جس طرح "سسٹرز" یا "برادرز" گلوکار اُبھر رہے ہیں، انہی کی طرح اگر ہم بھی جوڑی بن کر میدانِ گلوکاری میں آئے تو کامیابی یقیناً ہمارے قدم چومے گی۔ اس سلسلے میں ہماری نظرِ انتخاب اپنی کزن پر پڑی ہم نے جب اُسے اپنا یہ ارادہ بتایا تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔ اپنے ریاض کے لیے ہم نے اسٹور کو منتخب کیا۔ ہم دونوں صبح سویرے ریاض کرنے کے لئے اسٹور میں پہنچ جاتے۔

ایک دن ہم ریاض کر رہے تھے کہ ہماری پڑوسن خوانصیبن دوڑتی ہوئی امّی کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔

"اے بہن یہ صبح ہی صبح بچوں کو کیا ہوا جو ایسا 'بے سُرا'" رو رہے ہیں یہ اُن کے چلے جانے کے بعد بھیّا نے ہمارا

خوب مذاق اُڑایا۔ مگر ہم نے اُن کی بات پر کان نہیں دھرا اور اپنی مشق جاری رکھی۔

ایک دن ہماری کزن کہنے لگی "رانی تم نے ابھی تک اپنے جوڑے کا نام نہیں رکھا" بھیا فوراً بولے "تم اپنے جوڑے کا نام "ڈم ڈم ڈی ڈی" رکھ لو۔ کیونکہ جب تم گاتے ہو تو لگتا ہے کہ ٹین ڈبے بج رہے ہیں" یہ سُن کر ہمارا خُون کھولنے لگا۔

ہمیں ریاض کرتے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے، لیکن ابھی تک ہمیں اپنے فن کے سرِعام مظاہرے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ لیکن ایک دن یہ موقع فراہم ہو ہی گیا۔

ہُوا یُوں کہ ہمارے چھوٹے بھائی کی سالگرہ آگئی اور ہم نے امّی سے سالگرہ کی تقریب میں اپنے فن کے مظاہرے کی اجازت چاہی جو ہمیں فراہم کردی گئی اور پھر سالگرہ کا دن آپہنچا۔ ہم نے اُس دن کئی گھنٹے ریاض کیا۔ شام کو چھ بجے کیک کاٹا گیا پھر ہمارے فن کے مظاہرے کا وقت آیا اعلان ہُوا کہ اب آپ کو "ڈم ڈم ڈی ڈی" ایک گانا سنائیں گے۔ اپنے فن کے پہلے مظاہرے کی تفصیلات بتانے سے قبل آپ کو پتا بتا چلوں کہ ہمارے پڑوس میں ایک جھگڑالو گھرانہ بھی آباد ہے۔ وہ میاں بیوی آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔ جب ہم گانا گا رہے تھے تو پڑوس میں لڑائی کا سلسلہ جاری تھا۔ ساتھیو! آپ ذرا منظر پر غور کیجئے کہ جب ہم گا رہے تھے تو پڑوس میں لڑائی کی آواز ہمارے دوسرے مصرعے کی صورت میں سامنے آتی۔

اب تو سارے مہمانوں نے تالیاں بجا کر شیم شیم کہنا شروع کر دیا۔ اور چاروں طرف سے ہم پر سیب، کیلے، پکوڑے وغیرہ کی بارش ہونے لگی۔ ہم نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی، اس کے بعد ہمارا نام "ڈم ڈم ڈی ڈی" پڑ گیا اب گھر والے ہمیں یہی نام لے کر پکارتے ہیں اور ہم مارے ندامت کے اپنے ان پڑوسیوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جنھوں نے ہمارے اس ڈسکو گانے کے پہلے مظاہرے کا ستیاناس کر دیا۔

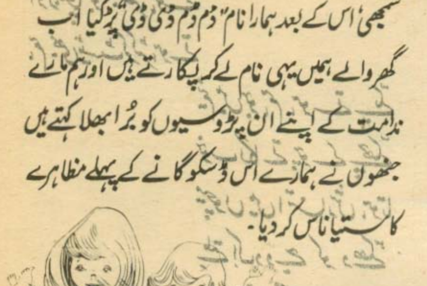

مُنّا

چچہ لمبا تھالی گول
بندر لے کر آیا ڈھول

پیڑ پہ ناچا کالا ناگ
چوہا گاتا آیا راگ

چاند پہ جا کر کودا شیر
بلّی کھا گئی سارے بیر

چچہ تھالی لے گیا ساتھ
مُنّا رہ گیا خالی ہاتھ

مرسلہ:۔ فراز احمد ـــــــ نئی کراچی

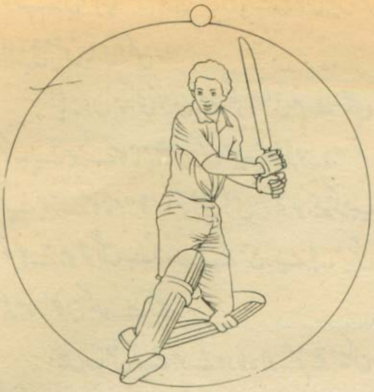

ٹیسٹ کرکٹر

دادا جان منسٹر ہوتے
ابّو چیف سلیکٹر ہوتے
اور چچا جو مبصر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

ٹیم میں جو ہم ہوتے پکّے
خوب لگاتے چوکے چھکّے
میچوں میں اتنا رش ہوتا
ملتے اِک دوجے کو دھکّے

چرچے اپنے گھر گھر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

ٹیم کے ہم کپتان بھی ہوتے
اور مردِ بحران بھی ہوتے
اتنی عزّت بنتی اپنی
کہ ہم خود حیران بھی ہوتے

تاج سبھی اپنے سَر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

مر کر بھی نہ ٹُھک ٹُھک کرتے
باؤنسر ملتا تو ہُک کرتے
اتنے بڑے کھلاڑی ہو کر
سب کی عزّت جھک جھک کرتے

جب ہی تو ون نمبر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

میچ کوئی جب ہار کے آتے
وکٹوں کو مجرم ٹھہراتے
قہر کی بجلی بَن کر فوراً
ایمپائر پر بھی گر جاکرتے

نادم کیوں غلطی پر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

بولنگ میں عمران بھی ہوتے
عمدہ بلّے باز بھی ہوتے
جیسے تھا بِگ سیف ہمارا
ایسے پھڈّے باز بھی ہوتے

حتیٰ کہ ڈکٹیٹر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

بولر سے ہم کبھی نہ ڈرتے
ہاتھ پہ ہاتھ کبھی نہ دھرتے
ویسٹ انڈیز سے پالا پڑتا
تو اَن فِٹ ہو جایا کرتے

یعنی بَلا۔کہ، مد۔تر۔ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کر کٹر ہوتے

لنچ ڈنر سب خُوب اُڑاتے
کھاتے، پیتے، کھیلتے، گاتے
بیگم جان کا حُکم جو ہوتا
وکٹ سے واپس جلدی آتے

ایک مثالی شوہر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کر کٹر ہوتے

ایک قیامت۔برپا ہوتی !
سب دنیائے کرکٹ روتی
ماہر کہتے کہ رضواںؔ جی !
قوم کے اِک انمول تھے موتی

جس دن ہم ریٹائرڈ ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کر کٹر ہوتے

مرسلہ۔ محمّد رضوان ـــــ اورنگی ٹاؤن کراچی

چمچہ

شازیہ گل ـــــــــ ریلوے روڈ سرگودھا

ایک روز میں اپنی دوست کے گھر گئی۔دستک دینے پر میری دوست کے ابّو باہر آئے۔انھوں نے ہاتھ میں چمچہ پکڑا ہُوا تھا۔میں نے سوچا کہ شاید یہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں لہٰذا میں نے اپنی دوست کے متعلق نہ پوچھا اور واپس آگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر جاکر دروازہ کھٹکھٹایا تو میری دوست کا بھائی باہر آیا، اُس نے بھی ہاتھ میں چمچہ

پکڑا ہوا تھا۔میں نے سوچا کہ شاید یہ لوگ بہت آہستہ کھانا کھاتے ہیں۔میں دوست سے ملے بغیر ہی واپس آگئی۔کہ اُسے کھانے سے اُٹھانا مناسب نہیں۔تھوڑی دیر کے بعد پھر چکّر لگایا اور دستک دی تو ایک ننھی سی بچّی نے دروازہ کھولا اُس نے بھی ہاتھ میں چمچہ پکڑا ہُوا تھا۔میں نے سوچا "یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے۔میرا تیسرا چکّر ہے اور یہ لوگ ابھی تک کھانے سے فارغ نہیں ہوئے۔میں نے ننّھی بچّی سے پوچھا "کیا تمھاری بڑی باجی گھر پر موجود ہیں؟" بچّی نے کہا "ہاں" اور دروازہ بند کرکے بُلانے چلی گئی۔جب موصوفہ نے خود دروازہ کھولا تو اُن کے ہاتھ میں بھی چمچہ تھا۔میں نے پُوچھا "کیا بات ہے، تم لوگ کھانا آخر کتنی دیر تک کھاتے رہتے ہو۔یہ میرا تیسرا چکّر ہے جب بھی کوئی دروازہ کھولتا ہے تو چمچہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

موصوفہ ہنس کر کہنے لگیں "دراصل ہم کھانا نہیں کھا رہے تھے، بلکہ دروازے کی کُنڈی خراب ہے۔یہ چمچہ کُنڈی میں اڑانا پڑتا ہے اس لیے جو بھی دروازہ کھولنے کے لیے آتا ہے تو چمچہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" یہ سُن کر میں اپنی بے وقوفی پر ہنسے بنا نہ رہ سکی۔

ایک مضمون گدھے پر

فوزیہ حمید ـــــــــ کراچی

"گدھا فرمانبرداری کا دوسرا نام ہے"

ارے ارے، ہم آپ کو ہرگز گدھا نہیں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ اُس گدھے جانور کی بات کر رہے ہیں جو انسان کے بہت کام آتا ہے۔ دسویں جماعت کی اُردو کی کتاب میں پطرس بخاری نے کتے کی عادات و اقسام کے بارے میں ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے جب ہم نے یہ مضمون پڑھا تو ہماری منصفانہ طبیعت کو بڑا دُکھ ہوا کہ پطرس جیسے بلند پایہ مزاح نگار نے کتے جیسے بیکار جانور پر تو مضمون لکھ دیا جسے بھونکنے اور کاٹنے کے سوا کوئی کام نہیں اور گدھے جیسے حلیم الطبع اور شریف جانور کو چھوڑ دیا، لہٰذا ہم نے فوری طور پر سوچا، کیوں نہ ہم خود ہی اس قومی فریضے کو انجام دے لیں پھر ہم نے لکھنا شروع کیا۔

... گدھا فرمانبرداری کا دوسرا نام ہے جس طرح انسانوں کی مختلف عادات و خصلات ہوتی ہیں، اُسی طرح گدھا بھی مختلف عادات و خصلات کا مالک ہوتا ہے۔ انسانوں اور گدھوں میں ایک قدرِ مشترک ہے کہ دونوں دن میں کام کرتے ہیں اور رات کو آرام۔ گدھے کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم گدھا نہیں، گدھے کا بچّہ ہوتی ہے۔ یہ عموماً بھورے اور کالے رنگوں میں دستیاب ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ سفید رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی والدہ محترمہ، یعنی گدھی کے پاس کھڑا رہ کر ہمہ وقت کچھ نہ کچھ چباتا رہے یعنی مُفت کی روٹیاں!... سوری، گھاس توڑتا یا چباتا رہتا ہے۔ مگر افسوس، اس کے عیش کے یہ دن جلد ہی رخصت ہو جاتے ہیں اور وہ کام میں جُت جاتا ہے کم و بیش دو سال کے عرصے میں یہ مکمل جوان اور تندرست و توانا گدھا بن جاتا ہے، فطرت کے عین مطابق وہ بھی جوانی میں اکھڑ اور بڑا جوشیلا ہوتا ہے اور بات بات پر دولتیاں جھاڑنا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے

اس کے علاوہ وہ ہر وقت اپنے منہ سے ڈھینچوں ڈھینچوں کی بے سُری، بے تال آوازیں نکالتا رہتا ہے۔ عام انسانوں کو اُس وقت اِس سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ ویسے، ہم آپ کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ گدھے کی طبعی عمر تقریباً ۱۰ سال ہوتی ہے۔ دس سال تک پہنچ کر گدھے کی صحت ڈھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ محنت و مشقت اور کچھ عمر کے تقاضے کی وجہ سے وہ سُوکھ کر ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ اس

وقت اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک کہاوت ہے کہ مصیبت کے وقت انسان کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح عمر کی اس منزل پر پہنچتے ہی گدھے کا مالک بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ جبکہ گدھا اس کا ساتھ سخت سے سخت مصیبت میں بھی نہیں چھوڑتا اور زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنے مالک کے لیے خوشیاں خریدتا ہے اور یہ مالک ....! اوہو! میں بھی جذباتی ہو گئی۔ ہاں، تو... میرا خیال ہے کہ ایسے گدھوں کے لیے "گرین لینڈ" نام کا ایک ادارہ ہونا چاہیئے۔ جہاں اُنھیں چرنے کے سوا کوئی کام نہ ہو اور وہ اپنی باقی ماندہ زندگی آرام و سکون سے گزار سکیں۔

علاوہ اس کے گدھے سے سب سے زیادہ بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی چھکڑا نما گاڑی میں گدھے کو جوت دو، پھر اس سے جو چاہے کام کراؤ۔ اسے گدھا گاڑی کہتے ہیں اس میں ایک "پہیہ" بھی موجود ہوتی ہے یہ کوئی عجوبہ نہیں بلکہ اپنے گدھے میاں ہی ہوتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی فالتو یا بیکار پہیہ کے ہیں۔ یہ اس لیے گدھا گاڑی میں موجود ہوتی ہے کہ اصل گدھے کا دل بہلا رہے اور وہ دلجمعی سے کام کرے۔ ویسے ہم آپ کو اصل بات بتاتے ہیں کہ یہ اس لیے موجود ہوتی ہے کہ گدھا گاڑی کو سہارا رہے یعنی ایک سے دو بھلے! اور وہ زیادہ سے زیادہ بوجھ اُٹھا سکے اور جہاں پہلے والے گدھے صاحب "تھک" ہوں تو یہ اُسے سہارا اور تسلی وغیرہ دے سکیں۔ دیہاتوں میں اکثر گدھا گاڑیوں کی ریس بھی منعقد ہوتی ہے۔ یہ گاڑی عام گدھا گاڑیوں سے قدرے چھوٹی ہوتی ہے...!

مذکورہ بالا مضمون میں ہم نے کوزے کو دریا میں، اوہ معاف کیجیے گا! دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ویسے آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دریا کو کیوں کوزے میں بند کیا ہے، گدھے کو کیوں نہیں؟ آپ کا سوچنا بھی بجا۔ لیکن کیا کریں محاورہ ہی یہی ہے اور گدھے کے بارے۔ میں فی الحال ہمیں کوئی محاورہ یاد نہیں آرہا ہے۔

باقی سب خیریت ہے

اورنگزیب عالمگیر —— سڈھانڈی، ضلع چکوال

(ایک سادہ لوح آدمی کسی سے خط لکھوانے گیا۔ چنانچہ اُس نے یوں لکھوانا شروع کیا۔)

دادا جی کو نزلہ ہے
بابا جی کو صفرا ہے

خالہ کو بیماری ہے
جینے سے بیزاری ہے
گھوڑی مرنے والی ہے
گائے لٹنے والی ہے
ابا کو بدہضمی ہے
میرا انگوٹھا زخمی ہے
بھیا کی ہے قسمت پھوٹی
انگلی کی ہے ہڈی ٹوٹی
"باقی سب خیریت ہے"
"باقی سب خیریت ہے"

ہیرے کی چوری

انور سعید کاظمی
ملتان

کردار

۱۔ ہیروں کا کاروبار کرنے والے سیٹھ کرم اللہ

۲۔ انسپکٹر خالد ملوّل

۳۔ سیٹھ صاحب کا نوکر شرفو

منظر:۔ سیٹھ صاحب تھانے میں انسپکٹر خالد کو ہیروں کی چوری کے متعلق بتا رہے ہیں۔ انسپکٹر صاحب ایک میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہیں اور سیٹھ صاحب مہمانوں والی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہیں ...

سیٹھ صاحب:۔ "انسپکٹر! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

انسپکٹر:۔ "سیٹھ صاحب، کوشش کر کے بُری طرح تھک چکا ہوں۔ اب مجھے فوری اور شدید آرام کی ضرورت ہے۔"

سیٹھ:۔ (جھنجلا کر) "انسپکٹر! تم ملوّل نہیں، انتہائی بغلول قسم کے شخص ہو۔" (انسپکٹر صاحب کا مختصر سا وجود یہ لقب عطا ہونے کے بعد بُری طرح لرزنے لگتا ہے)

انسپکٹر:۔ (لرزتی ہوئی آواز میں) "میں بغلول نہیں ہوں۔"

سیٹھ:۔ (باچھیں چیر کر) "اچھا بغلول! اب میری بات غور سے سنو۔"

انسپکٹر:۔ "بولیے۔ لیکن سُن لیجئے کہ میرا تخلّص ملوّل ہے۔ میں ہرگز بغلول نہیں ہوں۔ اور میں آپ کی ان بغلولی باتوں پر شدید احتجاج کرتا ہوں اور یہ بھی سُن لیجئے کہ آپ کی احمقانہ باتیں کوئی بھی معقول شخص خاموشی سے نہیں سُن سکتا۔"

سیٹھ:۔ "میرا ایک ہیرا، جس کی مالیت دو لاکھ روپے ہے، چوری ہو گیا ہے۔"

انسپکٹر:۔(روتی آواز میں) "ہاں جی! چوری ہوگیا ہے۔
لیکن میں نے نہیں چرایا۔ سیٹھ جی میرے بڑے بڑے بچے ہیں، جنہیں پالنا بڑا مشکل ہے۔ ان کے پیٹ بھی بڑے بڑے ہیں۔ وہ کھاتے بھی بڑا ہیں۔ سوتے بھی بڑا ہیں۔ گویا بہت ہی بڑے ہیں۔۔۔"

سیٹھ:۔ "یار! میں تم پر الزام نہیں لگا رہا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب تم کافی بڑے ہوگئے ہو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ ہیرا کسی نے چرا لیا ہے اور اس چوری میں کسی بغلول کا ہاتھ نہیں۔ وہ صندوق، جس میں ہیرے بند تھے، اُسی طرح مقفل ہے۔ اس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔ پھر وہ ہیرا کس طرح چوری ہوگیا۔ تم مجرم کو تلاش کرو۔"

انسپکٹر:۔(سنجیدگی سے) "آپ کو کس پر شک ہے؟"

سیٹھ:۔ "بھئی میرا ایک نوکر ہے، شرفو۔ مجھے تو یہ اُسی کا کام لگتا ہے۔"

انسپکٹر:۔ (خوش ہوکر) "واہ واہ سیٹھ صاحب! مجرم تو موجود ہے۔ آپ کل ہی اُسے میرے پاس بھیج دیں ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ آپ نے میرا بہت وقت ضائع کیا ہے۔"

سیٹھ:۔ "ارے جناب ضائع کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ (فوراً غلطی محسوس کرتے ہوئے) میرا مطلب ہے، آپ کا فرض تھا۔"

(سیٹھ صاحب انسپکٹر بغلول سے ہاتھ ملا کر چلے جاتے ہیں)

دوسرا منظر:۔ (انسپکٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ کمرے کی چیزوں کی ترتیب وہی ہے۔ ایک کونے میں ایک لرزتا، کانپتا، ٹھگنے قد اور مختصر سے جسم کا مالک، جس کا چہرہ لمبوترا، رنگت زرد، ٹانگیں پتلی، دانت پیلے اور مونچھیں بڑی بڑی اور گھنی ہیں، کھڑا ہے۔ یہ حضرت ہی شرفو ہیں۔ جن کے چہرے سے حماقت برس رہی ہے۔)

انسپکٹر:۔(سپاہی سے) "اس کی تواضع کرو۔"

(سپاہی شرفو کو لے جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہیں اور پھر کچھ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اچانک سپاہی شرفو کو لیے اندر داخل ہوتا ہے۔)

انسپکٹر:۔(ہنستے ہوئے) "اتنی جلدی مان گیا چل تیرا بیان میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ اس پر انگوٹھا لگا۔۔۔"

شرفو روتے ہوئے انگوٹھا لگاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سیٹھ صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

انسپکٹر:۔ "آئیے آئیے، سیٹھ صاحب! آپ کا مجرم پکڑا گیا۔"

سیٹھ:۔(سیٹھ صاحب نے ابھی تک شرفو کو نہیں دیکھا) "میرا مجرم؟ کیسا مجرم؟"

انسپکٹر:۔ "جناب شرفو نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔"

سیٹھ:۔ "(غصے سے) "میں نے وہ ہیرا خود ہی صندوق سے نکالا تھا۔ میں نمونے کے طور پر وہ خریدار کو دکھانا چاہتا تھا۔ پھر مصروفیت کی وجہ سے خریدار

کو دکھانا بھول گیا۔ میں نے کپڑے بدلے تو یہ ہیرا انہی کپڑوں میں رہ گیا۔ کپڑے میں نے دھوبی کے پاس بھجوا دیے۔ وہ بڑا ایماندار آدمی تھا۔ اس نے مجھے ہیرا واپس کر دیا۔ بے چارہ شرفو بے قصور ہے۔ وہ ہے کہاں؟ اُسے بلاؤ تو۔"

انسپکٹر: (بے دلی سے شرفو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "یہ ہے شرفو!"

سیٹھ: (شرفو کی طرف دیکھ کر اور حیران ہو کر) "بڑا بُرا حشر کیا ہے، تم نے شرفو کا۔ اب میرے گھر میں پھولوں کو پانی کون دے گا اور بچوں کو جسمانی ورزش کون کروائے گا۔ تم واقعی بفلول ہو ملول نہیں۔"

انسپکٹر: (شرفو کی طرف دیکھ کر) "آپ اس سے بچوں کی جسمانی ورزش کرواتے ہیں۔ آپ بھی کرم اللہ نہیں بکر مو ہیں۔"

(پردہ گرتا ہے)

حسابی فارمولے

محمد اکرام بھیالوی ...... صاحب

اشرف المخلوقات — عقل = جانور

کاغذ + جھوٹ = چھٹی کی درخواست

آدمی + اخلاق = انسان

انسان + بھول = پروفیسر

امراض + فیس = ڈاکٹر

نصیحت + بڑھاپا = بزرگ

مچھر

مہرین فاطمہ گوہر
کراچی

گرم دنوں میں خوب ستائے
رات میں آ کر گانا گائے
سب کو ٹیکے خوب لگائے
مچھر مچھر ہائے ہائے

کیچڑ میں ہے اس کا بسیرا
لیکن جب ہو جائے اندھیرا
ڈر کر اِدھر اُدھر چھپ جائے
مچھر مچھر ہائے ہائے

ڈی ڈی ٹی ہے اس کا دشمن
تباہ کرے یہ اس کا گلشن
کے ایم سی کو دوست بنائے
مچھر مچھر ہائے ہائے

آخری مذاق

(محمد سلمان خان سنبل۔ ابوریکا والا)

صدیوں پہلے کا ذکر ہے۔ ایک بادشاہ کے پاس ایک مسخرہ تھا جس کا نام جیک تھا۔ بادشاہ

جب بھی اُداس ہوتا تو مسخرہ فوراً مزاحیہ حرکتیں کر کے اور لطیفے سنا کر اُسے خوش کر دیتا۔ بادشاہ اس کے مذاق سے خوش ہو کر اسے انعام و کرام سے نوازتا۔ اس طرح جیک اور اس کی بیوی وانڈا خوش و خرّم زندگی گزار رہے تھے۔

وقت گزرتا رہا اور جیک اور وانڈا بوڑھے ہو گئے۔ جیک اب بھی پوری کوشش کرتا کہ بادشاہ کو خوش رکھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو پاتا اور بادشاہ ناراض ہو کر اسے دربار سے نکل جانے کا حکم دے دیتا۔ اُسے خود بھی اس کا احساس تھا کہ اب وہ بادشاہ کو خوش نہیں کر سکتا۔ اب اسے انعام و کرام ملنا بھی بند ہو گیا اور گھر کا خرچ چلانا دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔

ایک دن وہ اپنی بیوی سے بولا "میں اب کیا کروں۔ بوڑھا ہونے کے سبب بادشاہ کو ہنسا نہیں سکتا۔ اور پھر اب میں اُونچا سُننے لگا ہوں۔ جب کوئی مجھے نیا لطیفہ سناتا ہے تو میں صحیح طور پر سُن نہیں سکتا اور پھر اگر سُن بھی لوں تو یادداشت کمزور ہونے کے باعث یاد نہیں رکھ سکتا۔ اپنے پُرانے لطیفے اور مذاق کئی بار بادشاہ کے سامنے دُہرا چکا ہوں۔ اور پھر مجھے اکثر کھانسی کی شکایت رہتی ہے جس کے باعث میں لطیفے صحیح انداز میں نہیں سُنا سکتا۔ اسی طرح بڑھاپے کے باعث اچھل کود بھی نہیں سکتا۔ اب تو بادشاہ بھی مجھ سے ناراض رہنے لگا ہے۔"

وانڈا یہ سُن کر اُداس ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جیک سچ کہہ رہا ہے۔ جیک دن بدن یادداشت کھوتا جا رہا تھا۔ اب کوئی چیز اسے زیادہ دیر یاد نہیں رہتی تھی۔ کھانسی کا مرض دن بدن بگڑتا گیا۔ اس کی بوڑھی ہڈیاں کمزور ہوتی گئیں۔ اب تو اسے چلنے کے لیے چھڑی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

ایک دن بادشاہ نے جیک کو بلوایا اور روپوں کی تھیلی دیتے ہوئے کہا "جیک! مجھے اور ملکہ کو بہت افسوس ہے لیکن اب تم بہت بوڑھے ہو گئے ہو۔ جاؤ اور وانڈا کے ساتھ اپنے گھر میں رہو۔ میں کوئی نیا مسخرہ رکھنے کی سوچ رہا ہوں۔" یہ سُن کر جیک اور وانڈا مایوس گھر کو لوٹ آئے۔ تھیلی میں کچھ زیادہ رقم نہ تھی چنانچہ جلد ہی ختم ہو گئی انہیں اب مزید رقم کی ضرورت تھی۔ کافی کوششیں کیں مگر کہیں کوئی نوکری نہ ملی۔ بڑھاپے کے باعث کوئی انہیں کام دینے کو تیار نہ تھا۔ نوبت آہستہ آہستہ فاقوں تک جا پہنچی۔ آخر جیک اور وانڈا

سے بولا "اگر ہمیں جلد ہی رقم نہ ملی تو ہم بھوک سے مر جائیں گے۔ سنو! مجھے ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے" پھر اس نے تمام منصوبہ وانڈا کو بتایا۔

اس شام وانڈا ملکہ کے پاس گئی اور رونے لگی ملکہ کے اصرار پر اس نے بتایا "اے ملکہ! میرا غریب شوہر جیک مر گیا ہے اب میں کیا کروں؟" ملکہ نے وانڈا سے اظہار افسوس کیا اور سونے کے سکوں سے بھری تھیلی وانڈا کو دی تاکہ وہ کھانے پینے کا بندوبست کر سکے۔ جب وانڈا گھر پہنچی تو اسے جیک سامنے بیٹھا دکھائی دیا۔ اس نے جیک کے ساتھ مل کر رقم گنی۔ یہ کل ایک سو سونے کے سکے تھے۔

"بہت خوب!" جیک نے کہا "اب باقی منصوبے پر میں عمل کروں گا۔"

اگلی صبح جیک بادشاہ کے پاس گیا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے بولا۔ "عالی جاہ! میں لٹ گیا، برباد ہو گیا۔ میری بیوی وانڈا مر گئی ہے۔" بادشاہ نے رنج وغم کا اظہار کیا اور اسے دو سونے کے سکوں کی تھیلیاں دیں۔ جیک گھر پہنچا اور بیوی کے ساتھ مل کر رقم گننے لگا۔ یہ دو سو سونے کے سکے تھے۔

اب جیک نے وانڈا سے کہا کہ وہ بستر پر اس طرح لیٹ جائے، جیسے کہ وہ مُردہ ہو۔ پھر اس نے اس کے اوپر سفید چادر ڈال دی اور پلنگ کے سرہانے دو موم بتیاں روشن کر کے ان کے ساتھ دو سونے کے سکوں کی تھیلیاں رکھ دیں۔ اور خود بھی سفید چادر اوڑھ کر وانڈا کی طرح لیٹ گیا۔

ادھر محل میں جب بادشاہ نے ملکہ کو بتایا کہ وانڈا مر گئی ہے تو ملکہ بہت حیران ہوئی اور بولی "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وانڈا نہیں، جیک مرا ہے۔ وانڈا نے خود آ کر مجھے بتایا ہے"۔ یہ سن کر بادشاہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور اُس نے ملکہ کو بتایا کہ جیک نے خود اُسے وانڈا کی موت کی خبر سنائی ہے۔ اس پر ملکہ نے کہا "ہمیں خود ان کے گھر جا کر اصل حالات کا پتا کرنا چاہیئے۔"

چنانچہ دونوں جیک اور وانڈا کے گھر گئے۔ وہاں دیکھا تو دونوں مُردہ پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر ملکہ نے کہا "جیک پہلے مرا ہے۔ کیونکہ وانڈا نے مجھے آ کر پہلے بتایا تھا۔" بادشاہ نے کہا "نہیں پہلے وانڈا مری ہو گی کیونکہ جیک نے مجھے آ کر بتایا تھا۔" دونوں کافی دیر تک حیران پریشان کھڑے رہے۔ آخر بادشاہ چلا کر بولا "کوئی ہے، جو ہمیں بتائے کہ پہلے مرا کون ہے۔؟"

ملکہ اور بادشاہ یہ دیکھ کر سکتے کے عالم میں رہ گئے کہ جیک کے اُوپر سے چادر ہٹی اور وہ بولا "عالی جاہ! ہم میں سے کوئی نہیں مرا۔" اچانک ملکہ اور بادشاہ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ کافی دیر بعد بادشاہ ہنسی روکتے ہوئے بولا "تم نے کافی گستاخانہ حرکت کی ہے لیکن ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک بہت اچھا مذاق تھا۔"

تب جیک نے بادشاہ کو بتایا کہ اُس نے

یہ حرکت کیوں تھی۔ جب بادشاہ نے یہ سنا کہ وہ فاقوں سے مر رہے تھے تو اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے جیک سے کہا "تم یہ رقم خرچ کرو۔ جب ختم ہو جائے تو بتانا میں تمہیں اور رقم دے دوں گا۔"

جیک بولا "بہت شکریہ عالی جاہ! اگرچہ یہ میرا آخری مذاق تھا۔ لیکن تھا، سب سے کامیاب" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اورنگ زیب عالمگیر ——— سڈھانڈی

او مائی ماسٹر ناٹ آئی کم
گوڈے گوڈے واٹر چھم چھم
یک پاؤں پھسلا آل دی گھڑم
نیچے بستہ اوپر ہم
نہ مائی ٹٹو نہ ٹم ٹم!
اس لیے فدوی ناٹ اسکول کم

ہم نے پیرا شوٹ بنایا

سیّد جاوید حیدر شاہ ...... راولپنڈی

دادی کی چادر لے کر
پھر اُس کو کچھ بَل دے کر
رسّی لے کر اِک موٹی سی
نیچے باندھی اس کے پیڑھی

پورا پیرا شوٹ بنایا
ننھے کو اس میں بیٹھایا

خوب ہلا کر پہلے موڑا
پھر چھجّے سے اُس کو چھوڑا

چھوٹتے ہی وہ نیچے آیا
گرتے ہی ننھا چلّایا

چوٹ لگی جب اُس کے تھوڑی
چیخیں ماریں لمبی لمبی

دادی دوڑیں امّی آئیں
پیار کیا ننھے کو لائیں

امّی جی نے سب کو جکڑا
دادی جی نے ڈنڈا پکڑا

کیا بتلائیں تم کو بھائی
کتنی سب کی ہوئی پٹائی

مار تو کھائی لطف بھی آیا
کیسا پیرا شوٹ بنایا

امّی ابّو کا صفحہ

ڈاکٹر معین الدّین عقیل

بچّے سب ہی کو اچھے لگتے ہیں اور ہر ایک اُن سے پیار کرتا ہے لیکن ہر امّی ابّو کو اپنے بچّے کچھ زیادہ ہی پیارے لگتے ہیں۔ یہ بات ہے بھی فطرت کے عین مطابق کہ ماں باپ اپنے بچّوں کو بے حد پیار کریں اور انھیں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ صرف انسان ہی نہیں بے زبان جانور، معصوم پرندے اور وحشی درندے بھی اپنے بچّوں کا خیال رکھتے اور ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ماں باپ اپنے بچّوں سے پیار کرتے میں کچھ آگے ہی نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنے حد سے زیادہ پیار میں اپنے بچّوں کی ہر ضد پوری کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے ضدی بنا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں بچّے خود غرض بھی بن جاتے ہیں، اور اپنے فائدے یا اپنی خوشی کے لیے دوسروں کے حق بھی چھین لینا چاہتے ہیں!

بچّوں کی جائز باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی ناجائز اور نامناسب باتوں کو بھی مان کر ماں باپ اپنے حد سے زیادہ پیار میں بچّوں کو ضبط اور برداشت اور بے غرضی اور ایثار جیسی بہترین صفات سے دُور کر دیتے ہیں اور پھر ان باتوں سے بڑھ کر آپ نے دیکھا ہوگا --- کہ کچھ ماں باپ حد سے زیادہ پیار میں اپنے بچّوں کی کمزوریوں اور خامیوں کو چھپا کر یا نظر انداز کر کے ہر ایک سے اور بالخصوص مہمانوں کے سامنے اپنے بچّوں کی بیجا و بے جا تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں... اور ایسا کرتے ہیں وہ بچّوں کو "تماشہ" بھی بنا دیتے ہیں۔ کبھی بچّوں کو مہمانوں کے رُوبرو کھڑا کر کے فرمائش کی جاتی ہے: "بیٹا! بھالو ٹی وی میں کیسے ناچ رہا تھا؟" یا "منّی، یہاں آؤ، آنٹی کو میاؤں کر دو۔" "ہمارے پپّو کو گانے بہت یاد ہیں، پپّو وہ گانا سناؤ جو صبح گا رہے تھے۔" یا اگر گفتگو کا مزاج یہ نہ رہا تو کہا جائے گا "بیٹے یہ انکل ہیں، انھیں ٹوئنکل ٹوئنکل سناؤ۔" یا تعارف کرایا جائے گا: "یہ گڈّو ہے، بڑا اچھا بیٹا ہے، خوب پڑھتا ہے، کبھی شرارت نہیں کرتا، ضد نہیں کرتا۔" وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر مہمانوں کے سامنے ماں باپ اپنے بچّوں کی صلاحیتوں کی نمائش اور پھر اس طرح اپنے بچّوں کی تعریف کر کے تسکین محسوس کرتے ہیں، لیکن اس عمل میں وہ یہ لحاظ نہیں کرتے کہ اس طرح وہ اپنے بچّوں کو بڑوں کے سامنے ادب، سنجیدگی اور انکسار کی تربیت نہیں دے رہے بلکہ ان میں بے حجابی، بے ادبی اور ذاتی نمائش جیسی بُرائیوں کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ خود مہمان بچّوں کے اس طرح کے تماشوں سے لطف نہیں بلکہ اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں، اور اخلاقاً اپنے ماں باپ کا دل رکھنا ان کے لیے کتنا دشوار ہو جاتا ہے!

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو نا!
ناز
پان مصالحہ
NAZ
ASHRAF PRODUCTS.
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

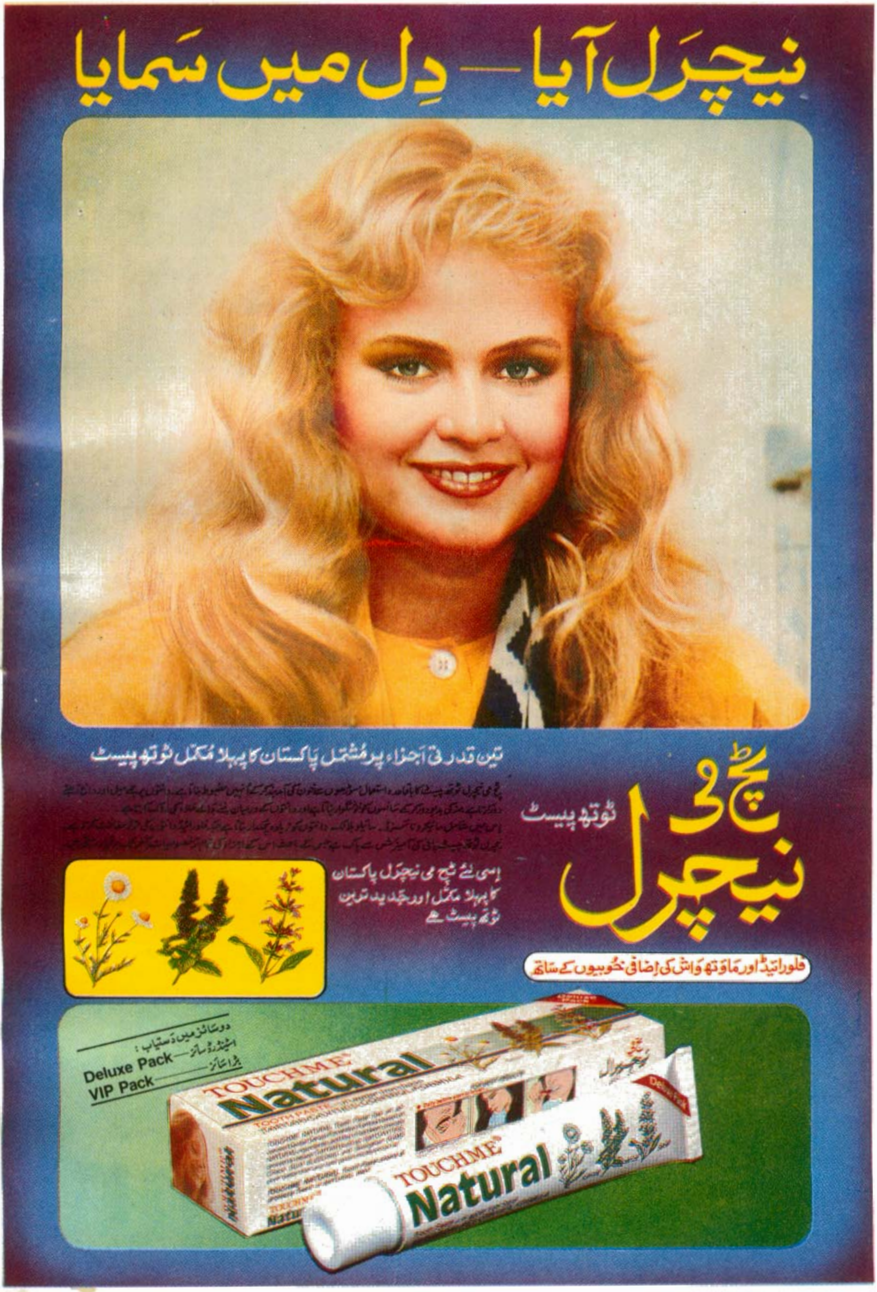
نیچرل آیا — دِل میں سمایا
تین قدرتی اجزاء پر مشتمل پاکستان کا پہلا مکمل ٹوتھ پیسٹ
ٹچ می نیچرل
ٹوتھ پیسٹ
اسی لئے ٹچ می نیچرل پاکستان
کا پہلا مکمل اور جدید ترین
ٹوتھ پیسٹ ہے
فلورائیڈ اور ماؤتھ واش کی اضافی خوبیوں کے ساتھ
دو سائز میں دستیاب :
اسٹینڈرڈ سائز — Deluxe Pack
بڑا سائز — VIP Pack
TOUCHME Natural
TOUCHME Natural